

اسلامی ثقافت

کے

سنگ میل

---

مصنف: ڈاکٹر عبدالکریم عثمان

---

ترجمہ و تلخیص: راجہ ف۔ م۔ ماجد

---





# اسلامی ثقافت کے سنگ میل



# اسلامی ثقافت کے سنگ میل

مصنف: ڈاکٹر عبدالکریم عثمان

ترجمہ و تلخیص: راجہ ف۔ م۔ ماجد

ادارہ ثقافت اسلامیہ

۲۔ کلب روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

۲۹۷۰۱  
۶۶۳ ع

۱۵۸۳۶۵

ک

عنوان: اسلامی ثقافت کے سنگِ میل

مصنف: ڈاکٹر عبدالکریم عثمان

مترجم: راجہ ف۔م۔ماجد

طبع اول: 2012ء

مطبع: طیب اقبال پریس، لاہور

ناشر: قاضی جاوید  
ناظم، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ

قیمت: 450/- روپے

یہ کتاب اکادمی ادبیات پاکستان اور محکمہ اطلاعات و ثقافت، حکومت پنجاب کے تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

## مندرجات

- 1 (1) اسلامی ثقافت کے سنگِ میل
- 95 (2) اسلام اور عصرِ حاضر کے چیلنج
- 125 (3) اسلامی کی آفاقیت اور انسان دوستی
- 166 (4) اسلام کے مختلف نظام
- 238 (5) اقتصادی نظام
- 255 (6) امدادِ باہمی
- 264 (7) عائلی نظام
- 280 (8) فرد اور معاشرہ
- 287 (9) اخلاقی نظام
- 295 (10) اسلام کے اثرات





# اسلامی ثقافت کے سنگ میل

بیسویں صدی کے تیسرے ربع میں دنیائے عالم اسلام کی بیداری کا مشاہدہ کیا اور عالم اسلام کا بڑا حصہ غیر ملکی تسلط سے آزاد اور آزادی کی زندگی سے مستمتع ہوا۔ اسلامی ممالک کے ذرائع اور خزانے رفتہ رفتہ ان کے باشندوں کو واپس مل گئے۔ اس کے علاوہ کئی ممالک میں زندگی کے تمام معاملات میں نظام اسلامی رائج کرنے اور اسلامی معاشرہ قائم کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں اور علمی، اقتصادی اور صنعتی ترقی کی خواہش رکھنے والے نیک نفس انسانوں کے خواب اور آرزوئیں پوری ہوتی نظر آئیں۔

مگر یہ صورت حال مکمل طور پر واضح اور روشن رہتی کیونکہ عالم اسلام عرصہ دراز تک مصائب و آلام کا شکار رہا اور صراطِ مستقیم سے انحراف اور دوری اور تفرقہ بازی کے ایسے مظاہر کی آماجگاہ بنا رہا جو گزشتہ کئی صدیوں تک جاری رہا۔ مسلمانوں اور اسلام کے خلاف بغض اور کینے کے منصوبے آخری حد کو چھونے لگے اور ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ امتِ اسلامیہ میں انتشار پیدا ہوا، تفرقہ بازی ہوئی اصلی طاقت کے سرچشمے خشک ہونے لگے۔ عالم اسلام کا رقبہ سکڑنے لگا، کمزور علاقوں پر حملے کیے گئے (جس میں خود اپنوں کا زیادہ حصہ تھا) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یروشلم پر قبضہ کر لیا گیا اور بیت المقدس کی، جس کی زیارت کے لیے دنیا کے گوشے گوشے سے مسلمان آتے تھے، بے حرمتی کی گئی اور یہ ایسا ابتلا تھا کہ چشمِ فلک نے اٹھ صدیوں سے نہیں دیکھا تھا۔

لیکن ان مصائب و آلام میں فطری طور پر خیر و شر، تیز رفتاری اور سست گامی اور موت و حیات دونوں کے پہلو شامل ہیں۔ جب مسلمانوں کو ان آلام کی حقیقت کا ادراک ہو اور انہوں نے ان کے اسباب کا اندازہ کر لیا تو وہ نٹی اور خوشگوار زندگی کی ابتدا کرنے کے قابل ہو گئے اور دوست دشمن میں پہچان کرنے لگے۔ قوموں کی زندگی میں مصائب، اضطرابی لمحات بن کر آنے ہیں اور انہیں ان مصائب کے اسباب پر غور و فکر کرنے کا موقع مہیا کرنے ہیں اور اس صورت حال سے نمٹنے اور اس کی اصلاح کرنے کی دعوت دینے ہیں تاکہ وہ ادراک ذات کر سکیں اور اپنی زندگی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کر کے اس کی حفاظت کر سکیں اور پر فخر کریں۔

کبھی کبھی یہ مصائب قوموں کے لیے زہرِ قاتل بھی بن جاتے ہیں، جن کی وجہ سے قوم اپنے سے غالب قوم میں ضم ہو جاتی ہے اور بھول جاتی ہے کہ یہ اس کی کشمکش، موت و حیات اور عدم وجود کا محرک ہے اور وہ سنگ ریزوں کو گوہر آب دار سمجھ لیتی ہے۔ وہ معاملات کی حقیقت تک پہنچنے کی بجائے ظاہری اصلاح پر قناعت کر لیتی ہے۔ اس صورت میں اس قوم کی فنا یقینی ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی قوت مفقود ہو جاتی ہے۔

( جس طرح کسی کے قریبی عزیز کی وفات یا تو اس فرد میں اقدار کی نعمتوں اور پائیدار نصب العین کے اچھا، کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے جس سے اس کا ایمان مضبوط ہو اور ارادہ پختہ ہو اور وہ ثابت قدم بن جائے یا پھر اس آفت کی وجہ سے بالکل بناہ و برباد ہو سکتا ہے۔ اسی طرح قوموں کا معاملہ ہے مسلمانوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو صحیح رخ پر ڈالیں اور اپنے اختیار کردہ افکار یا ترک کردہ روایات کو صحیح تنقید اور فکرِ صالح کی کسوٹی پر پرکھیں تاکہ ان کی روحانی، اخلاقی اور اجتماعی زندگی کے بہترین مقاصد پورے ہو سکیں۔ مصائب و آلام کا مقابلہ کرنے اور صحیح اسلامی معاشرہ قائم کرنے کی طرف یہ پہلا قدم ہو سکتا ہے۔

اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم یہ ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ اسلام، اس کے نظاموں اور روایات کے بنیادی اصول یہاں بیان کریں اور ابتداء ہی میں خلوص دل سے ان کی اہمیت کا جائزہ لیں۔

اس عرض حال کے کئی اسباب ہیں؛  
مسلمانوں کی موجودہ نسل کو کئی فکری چیلنج درپیش ہیں۔ افکار کی منڈی میں طرح طرح کا مال پیش

کیا جا رہا ہے۔ معاشرتی، فکری اور سیاسی نظریات و عقائد حدِ شمار سے باہر ہیں اور ان افکار و عقائد کے ماننے والے، انہیں عوام الناس میں مقبول بنانے کے لیے تہذیبِ جدید کے جملہ وسائل کو کام میں لا رہے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے قلم، کتب، رسائل، مجالس، تقاریر اور نشر و اشاعت کے تمام ذرائع استعمال کر رہے ہیں۔ ان جدید ذرائع کی وجہ سے ہماری دنیا سگڑ کر ایک وحدت بن گئی ہے جس کے ایک کونے میں کہا ہو لفظ دوسرے کونے تک سنا جاتا ہے اب یہ ممکن نہیں رہا کہ کوئی قوم ان افکار سے پناہ ڈھونڈنے کے لیے اپنے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لے۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دین کی حقیقت، وسعت اور مسلمانوں اور انسانوں کے لیے جو کچھ اس نے پیش کیا ہے اس کی قدر و قیمت کو وقتِ نظر سے جان لیں۔ اگر مسلمانوں نے ایسا نہ کیا تو ان کے دل و دماغ میں ایمان کی بنیادیں ہل جائیں گی اور وہ اسلام کے بنیادی اصولوں سے بے پیرہ رہ جائیں گے اور ہر سمت سے حملہ آوروں کی زد میں ہونگے مسلمانوں میں ایسی آراء اور افکار رواج پا گئے ہیں جو اسلام سے مطابقت نہیں رکھتے اور اس کے بنیادی اصولوں اور مقاصد سے متعارض ہیں۔ ان میں سب سے پہلا نظریہ جو مسلمانوں میں رائج ہوا، سیکولرزم تھا، یعنی دین و دنیا میں جدائی یا دین کی امور زندگی میں عدم مداخلت۔ اسلام کے لیے یہ تصور بالکل اجنبی ہے۔ اس کی ابتدا ”قیصر اور خدا“ میں تفریق سے ہوئی جس کے مطابق دنیا امور کا مالک ”قیصر“ کھڑا اور روحانی معاملات اور عبادات امور دین قرار پائے یہ بات کسی تفریح کی محتاج نہیں کہ یہ مفہوم اسلام پر منطبق نہیں ہوتا کیونکہ اس میں دین و دنیا کی حدود الگ الگ نہیں، نہ حکومت اور مذہب میں تفریق ہے کیونکہ اسلام انسانی زندگی کا دین ہے اور اس کی پوری توانائیوں اور سرگرمیوں کو محیط ہے۔ کوئی بھی نظریہ، جو انسان کا اپنے رب سے تعلق منقطع کر دے باطل اور گمراہ کن نظریہ ہے اور وہ اسلام اور حیاتِ اسلامی کی جڑوں کو کھود رہا ہے۔

بعض لوگوں نے مسلمانوں میں ”نظریہ قومیت“ رائج کرنے کی کوشش کی۔ یہ نظریہ بھی دینِ اسلام، تاریخِ اسلامی اور اسلام کے تہذیبی ورثے سے کٹا ہوا ہے۔ دراصل یہ نظریہ ان چھوٹی چھوٹی قومیتوں نے پیدا کیا جو اٹلیسویں صدی میں یورپ میں منظرِ عام پر آئیں۔ ان کا نصب العین ان تمام قبائل کو یک جا کرنا تھا جو مختلف سلطنتوں کے ماتحت تھے اور انہیں ان شاہی حکومتوں سے

انگ، مستقل ممالک قرار دینا تھا۔

ہر قوم کے اپنی قومیت پر ناز اور تعصب نے مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔ خصوصاً اس صورت میں کہ دین کو نظر انداز کر دیا گیا اور ان روایات کو فنا کر دیا گیا جو دین سے پھولتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان مختلف قبیلوں، چھوٹے چھوٹے گروہوں اور قومیتوں میں بٹ گئے اور پھر یہ قبیلے اور قومیتیں مزید تقسیم ہو گئیں اور یہ نثرہ تھا ابتدائی نظریہ قومیت پر ایمان لانے کا۔ کیونکہ جب آپ یقین کر لیں کہ اپنے وجود کی اساس نظریہ قومیت پر ہونی چاہیے جو ہمارے ماضی، ہماری تاریخ اور ہمارے عقیدے سے متعارض ہے تو وہ پھر وہ رشتہ ٹوٹ جانا ہے جو آپ کو باقی تمام مسلمانان عالم سے پیوست رکھتا ہے۔ پھر جو چیز آپ اپنے لیے پسند کرتے ہیں اس سے دوسروں کو کس طرح روک سکتے ہیں۔

اس کے بعد اشتراکیت یا سائنسی سوشلزم یا کمیونزم کو لیجیے اور اس کی ان مختلف تشریحوں کو پیش نظر رکھتے جن کی ترویج کرنے کے لیے اس کے حامیوں میں دن رات ایک کر دیئے اشتراکیت کسی رنگ اور کسی نوع کی ہو، ظاہر ہو یا خفیہ ہو۔ ایسا نظریہ ہے جو دین اسلام کی اساس، بنیادی اصولوں اور تمام تفسیروں سے متناقض ہے۔ اسلام کے ماننے والے، اور ہر اس چیز سے جو انہیں اشتراکیت اور اسی قسم کے دوسرے نظریوں اور ہر اس چیز سے، جو انہیں اپنی شریعت سے اور اپنے دور اپنے معاشرے کے لیے فائدہ مند احکام کا استنباط کرنے سے باز رکھے، بالکل الگ ہیں۔ دونوں کے افق ایک نہیں۔ اسلام چودہ سو برس سے جملہ حاجات انسانی کو پورا کر رہا ہے اور کسی تغیر و تبدل حالات نے اسے پریشان نہیں کیا نہ چھوٹے سے چھوٹے یا مشکل سے مشکل مسئلے کے حل تلاش کرنا اس کے لیے دشوار ثابت ہوا۔

اس کے علاوہ مغرب کی معاشرتی زندگی جو اخلاقی انحطاط کا شکار ہے اور شریفانہ و انسانی اقدار سے انحراف کر چکی ہے، اسلامی معاشرے کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ مغرب اپنے زوال آمادہ طرز زندگی کو نشر و اشاعت کے ہر حربے سے انسانوں کے سامنے بنا سوار کر پیش کرتا ہے لیکن یہ چھوٹے ننکوں کی ریزہ کاری ہے۔

شرم و حیا سے عاری، اس طرز زندگی کے نظریات بہت بڑی حد تک افکار اسلامی میں دخل پا چکے ہیں اور اب یہ حالت ہے کہ مسلمان قوم کے ان اخلاق و آداب اور اسلامی اصولوں کی

جڑ کاٹی جا رہی ہے جو جدید مغربی تہذیب میں راسخ ہوتے والی مادی اقدار سے متنقص ہیں مغرب کے سیاسی، اقتصادی، فکری اور ثقافتی افکار، الحاد کی تبلیغ، مذہب سے دوری اور مسلمانوں کی اسلام کی حقیقت سے ناواقفیت، اس پر مستزاد ہے اور مسلمانوں میں ایسے افراد ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اسلام محض عقیدے اور عبادت کا نام ہے یا تاریخ میں خاص وقت تک محدود تھا جس کا زمانہ گزر گیا اور اہمیت گزر گئی۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام معاشرتی اور انسانی تنظیم کو جاہد کرتا ہے جو انسانیت کے ارتقاء کے خلاف ہے۔

(اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ اسلام کی حقیقت کو واضح طور پر پیش کیا جائے جو اس کے تمام مبادیات کو صحیح صحیح پیش کرے جن میں اسلامی تعلیمات کی حکمت اور اس کے بنیادی اصولوں کی تمام ادیان و مذاہب اور دیگر نظاموں پر فوقیت ثابت کی جائے۔ ہماری خواہش ہے کہ جس طرح جامعہ ریاض (سعودی عرب) جامعہ دمشق (شام) اور جامعہ أم درمان (سوڈان) میں "نظام اسلام" یا "اسلامی ثقافت" کا نصاب رائج کیا گیا ہے، اسی طرح دوسری اسلامی یونیورسٹیوں میں بھی جاری ہو جائے۔

اسلامی ثقافت کے موضوع کی غرض و غایت یہ ہے کہ تفصیلات میں جائے بغیر، طالب حقیقت کو اسلام کی واضح اور جامع صورت دکھائی جائے۔ اس لیے اس میں توحید، فقہ، تفسیر تفسیر یا دیگر علوم اسلامی سے بحث نہیں کی گئی کیونکہ یہ اپنی ذات میں الگ اور مکمل علوم ہیں لیکن حقیقت اسلامی، اسلامی ثقافت و تہذیب کی اصل، اور اس دین ممتاز کی فطرت جانتے کے لیے جو انسان کو اللہ کے راستے پر ڈالنے کے ساتھ ساتھ اس دنیا کی عمدہ اور بہترین چیزوں سے متمتع ہونے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ ان علوم سے استفادہ ضروری ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"اور جو کچھ تجھے اللہ نے دے رکھا ہے اس میں عالم آخرت کی بھی جستجو کر اور دنیا

سے (بھی) اپنا حصہ فراموش نہ کر اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ حسن سلوک کیا

ہے تو بھی (بندوں سے) حسن سلوک سے پیش آ....." (انفصص ۷۷)

اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ہم درج ذیل موضوعات کو بیان کریں۔

۱۔ دل و دماغ میں راسخ ہونے والے زندہ اور نابناک عقیدے کے طور پر اسلام

کی حقیقت۔

۲۔ انسانی سرگرمیوں کی تمام انواع، مثلاً عقیدہ، عبادات، اخلاق، انکار، اقتصادیات، سیاست اور معاشرت میں نظام اسلام کی حقیقت۔

۳۔ عرب تہذیب و ثقافت پر اسلام کا اثر بطور دین اور دائرہ انسانیت میں اس کا نفوذ۔

اس موضوع کا ممتاز اور منفرد اسلامی شخصیت سے اساسی تعلق ہے یعنی فرد مسلم اور امت مسلمہ کی شخصیت، کیونکہ اس سے مسلمانوں کو وہ ہیئت ملی ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے اور یہ امت کے تمام افراد میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سے فرد کو بہنائی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے تعلقات مرتب ہونے ہیں اور اسی سے چھوٹے بڑے تمام امور میں امت کے موقف کا علم ہوتا ہے۔

اس موضوع کے راستے پر چلتے ہوئے ضروری ہے کہ درج ذیل اغراض و مقاصد کے حصول کی کوشش کی جائے:

سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ اسلام کی سچائی کے بارے میں صحیح علمی شعور پیدا کیا جائے تاکہ صاحب کردار مسلم نوجوان اپنے عقیدے سے آگاہ اور اس کے "طول و عرض" سے واقف ہو جائے۔ اس ادراک سے وہ تمام اجنبی عقائد اور نظریات سے مکمل طور پر محفوظ ہو سکتا ہے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ ایسے مسلمان پیدا کرنے میں مدد دی جائے جو توانا اور صالح ہو، اپنے رب پر ایمان لانے والا ہو، اس کے آگے سجدہ ریز ہو اور ایک ایسے صالح معاشرے کی تشکیل میں کوشاں ہو جس کی تمام توانائی اعلیٰ کلمۃ اللہ اور شریعت الہی کے قیام کے لیے مخصوص ہو۔ تیسرا مقصد یہ ہے کہ امت اسلام کے لیے درد مندی پیدا ہو اور اپنے آپ پر اور تمام لوگوں پر اسی کی جہنیت واضح کی جائے اور اس عظیم پیغام کی اہمیت واضح کی جائے جو انسانیت کے لیے لایا گیا۔

چوتھا مقصد یہ ہے کہ اس غلط تصور کی نفی کی جائے جو اسلام دشمن قوتوں نے پھیلا یا ہے کہ مسلمانوں کا انحطاط اسلام سے تمسک کے باعث ہے اور یہ واضح کیا جائے کہ اس کے برعکس صحیح ہے کہ اسلام پر یقین رکھنے والی قومیتوں کا زوال اس دین صحیح کے مبادیات کو ترک کرنے اور

اپنی انفرادیت اور اجتماعی زندگی میں ان پر خلوص دل سے عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہوا ہے۔  
ان مقاصد کے حصول سے، اسلامی ثقافت کی غرض و غایت یہ قرار پائی کہ متفرد لوگ اور  
آزاد خیال معاشرہ قائم ہو اور یہی سیدھے راستے پر چلنے کا اولین طریقہ ہے جو عزت، ترقی اور خدا  
کی رضا کی طرف لے جاتا ہے۔ خدا ہمیں اس مقصد میں کامیاب فرمائے۔

## اسلام کے بنیادی اصول

### زندگی کے بارے میں اسلام کا عام نظریہ

حیات وجود کے بارے میں اسلام کا خاص نظریہ ہے اور الوہیت، کائنات اور انسان  
کے متعلق مستقل اور جامع تصور ہے۔ اس نظریے کی بنیاد پر، اور اس تصور کی وجہ سے ان تمام انسانی  
اصولوں اور نظاموں کو سمجھنا آسان ہے جن کی اسلام نے بشارت دی ہے۔

ہر نظام میں معاملہ یکساں ہے اور اس فلسفے کو سمجھنے بغیر جس پر یہ نظام قائم ہے یا اس تصور کو  
جاننے بغیر جس پر کائنات اور زندگی کا دار و مدار ہے کسی نظام کے صحیح خدو خال کا ادراک ممکن نہیں  
کیونکہ اجتماعی نظام، اس زندگی اور انسان کے اس میں مرکزی نقطہ ہونے کی جامع تفسیر کی ایک  
شاخ ہے اور جو نظام اس تفسیر پر قائم نہیں وہ مصنوعی ہے جس کی تقدیر میں بقا نہیں۔

اسلامی تصور حیات، باقی تمام تصورات سے (خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید) مختلف ہے اگرچہ  
ان میں سے بعض تصورات کے ساتھ جزوی مماثلت ہے مگر ان تصورات کا سرچشمہ اور ان کی اساس  
بالکل مختلف ہے۔ اسلامی تصور حیات ایک جامع تصور ہے کیونکہ وہ تمام عناصر حیات کے لیے  
عام نظریہ پیش کرتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا علم ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے تاکہ  
وہ اس زندگی اور اس کے حقائق عظمیٰ یعنی حقیقت خداوندی، حقیقت کائنات اور حقیقت  
انسان کو جان لے۔ مسلمان کے لیے فقط اس ادراک سے اس زندگی میں اپنا مقام متعین کرنا  
اور اس کے نتیجے میں اپنی زندگی اس کے مطابق ڈھالنا اور اس سے مفاہمت پیدا کرنا ممکن ہے

لامحالہ یہ تصور قرآن حکیم ہی میں ملتا ہے اور اسی میں یہ زندہ نظریے کے طور پر موجود ہے جو افکار و احساسات و وجدان پر حاوی ہے۔ کوئی مسلمان یا محقق قرآن کی طرف رجوع کرے تو اسے یہ نظریہ اس میں جامع اور کامل صورت میں ملے گا بشرطیکہ وہ اپنے امکان کی حد تک ان خاص تغیرات سے گریز کرے جنہوں نے اس نظریے کی توانائی چھین لی ہے اور اسے انحرافات اور غلط تصورات کے صحرا میں پھینک دیا ہے۔

## انسان

اسلامی تصور میں انسان، اس دنیا میں بسنے والی مخلوقات میں سب سے سربلند، سب سے افضل اور سب سے اشراف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے چند اہم خصوصیات و ودیعت کی ہیں۔ اسے مخصوص صفات سے مہیتر کیا ہے اور ایسے اعلیٰ مقاصد کے لیے تیار کیا ہے جن تک باقی ساری مخلوقات پہنچنے سے قاصر ہے۔ قرآن کریم میں متعدد بار اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

(ہم نے انسان کو بہترین اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے) (التین : ۴)

(اور ہم نے بنی آدم کو عزت دی ہے اور ہم نے انہیں خشکی اور دریا (دونوں) میں سوار کیا اور ہم نے ان کو نفیس چیزیں عطا کیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات

پر بڑی فضیلت دی ہے)۔ (الاسراء یا بنی اسرائیل : ۷۰)

اس فضیلت کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس زمین میں اپنی خلافت کے لیے اور اس کائنات کو بھلائی اور نیک عمل سے آباد کرنے کے لیے پیدا کیا۔ اس غرض سے انسان کی فطرت اور صالح بنائی ہے۔ وہ چاہے تو اسے بھلائی کے لیے استعمال کرے، چاہے تو بُرائی میں لگا دے۔ انسان کی فطرت میں بُرائی نہیں مگر وہ کسی "ناکردہ گناہ" کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے کہ جس کا بھوت عمر بھر سایہ بن کر اس کا پیچھا کرتا رہے (جس طرح بعض مذاہب میں تصور کیا جاتا ہے) بلکہ وہ اپنے فعل و عمل سے خیر یا شر پاتا ہے:

(وہ یقیناً بامراد ہو گیا جس نے اپنی جان کو پاک کر لیا اور وہ یقیناً نامراد ہو آ جس

نے اس کو دبا دیا)۔ (الشمس : ۹-۱۰)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی کی اہم حقیقتوں کا ادراک و ودیعت کیا ہے اور ان حقائق



کو جان لینے کی ہم سوچی ہے جو اس عقل اور وجدان کے ذریعے آفاق و انفس اور ہر چیز میں دیکھے جاسکتے ہیں (فصلت: ۵۳) زمین میں بھی مومنین کے لیے آیات اور نشانیاں ہیں اور اسی طرح آسمان میں ایسی اور اس سے بڑی نشانیاں ہیں:

(کو، زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، اس پر نظر ڈالو)۔ (یونس: ۱۰۱)

(اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے)۔ (الزاریات: ۲۱)

انسانی فطرت سلیم اگر کشادہ دلی سے کائنات کا مطالعہ کرے تو اس پر اس کا مقصد، ارادہ اور تخلیق واضح ہو جائے گی۔ اور وہ اس زندگی میں اپنے مقام اور طرز عمل سے آگاہ ہو جائے گی۔ اس تصور کے نتیجے میں انسان کا خدا سے تعلق بھی متعین ہو جائے گا اور یہ وہ تعلق ہے جو صرف خدائے واحد کی مطلق بندگی کی تعلیم دیتا ہے اور اس بندگی کے جملہ تقاضوں کو پورا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کا اولین اور اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ "زندگی کے تمام چھوٹے بڑے کاموں میں" صرف اسی خدائے واحد کی فرمانبرداری کی جائے "اور پورے خلوص نیت سے ہر حرکت، ہر قول اور ہر عمل سے اسی کی ذات کو سزاوار توجہ سمجھا جائے"۔ بندگی یا عبودیت، اس معنی میں صرف اللہ کو خدا اور معبود گردانا ہے، خواہ عقائد ہوں یا شریعت، یا عبادات۔ "کیونکہ مسلمان خدائے واحد کے سوا کسی کو الوہیت کا مالک نہیں سمجھتا نہ اس کی مخلوق میں سے کسی کو لائق عبادت خیال کرتا ہے اور نہ اس کے بندوں میں سے کسی کو حاکمیت کا اہل و شراک دیتا ہے"۔

بندگی سے یہ نسبت، اور انسان کا اس بارے میں اقرار اور کچھ حلقوں کی کوشش کے باوجود اس پر اصرار، تخلیق انسان سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے اسے قرآن کریم میں یوں بیان فرمایا ہے:

(اور جب آپ کے پروردگار نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی نسل کو باہر نکالا اور خود انہی کو ان کی جانوں پر گواہ کیا (اور کہا) کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ بولے، ضرور ہیں ہم گواہی دیتے ہیں (یہ اس لیے کہ) کہیں قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم تمہارا پروردگار نہیں تھے)۔ (الاعراف: ۱۷۲)

جب انسان اس تعلق کے مقتضیات کا پابند ہو جاتا ہے تو اس کا عمل خداوند تعالیٰ



غور و خوض کیا اُس علم میں انہیں ناقص رائے اور نامکمل معلومات ملیں یا ان کے خیالات ناپختہ اور نظریات جلد بازانہ نکلے..... خود بھی گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کیا۔

کائنات سے انسان کا رشتہ دوہرا ہے۔ پہلا یہ کہ وہ اس سے لطف اندوز ہوتے نفع اٹھانے، اور اپنی منفعت کے لیے اس کی تسخیر کے لیے آزاد ہے۔ دوسرا یہ کہ کائنات خود و فکر اور تدبیر و تعامل کا ایسا موضوع ہے جس کے ذریعے اس کے خالق اور کارساز تک پہنچنا لازمی ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں رشتے اللہ تعالیٰ نے اتنے مربوط اور ہم آہنگ بتائے ہیں کہ ایک جان دو قالب ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے ادل بدل میں اور جہازوں کے چلنے میں جو سمندر میں ان چیزوں کے ساتھ چلتے ہیں جو لوگوں کو نفع پہنچاتی ہیں اور (اس) پانی میں جسے اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے۔ پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کر دیا اور اس میں ہر طرح کے حیوانات پھیلا دیئے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں (جو) آسمان اور زمین کے درمیان مقبذ ہے (ان سب میں) ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں، نشانیاں (موجود) ہیں۔) (البقرہ: ۱۶۴)

اور پھر فرمایا:

(وہی پروردگار ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنا دیا ہے اور آسمان سے پانی اتارا، پھر تمہارے لیے غذا کو پھل پیدا کیے، سو تم اللہ کے ہمساز ٹھہراؤ اور تم جانتے بھی ہو۔) (البقرہ: ۲۲)

اس کے بعد کہا:

(وہی پروردگار ہے جس نے تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا جس سے تمہیں پینے کو ملتا ہے اور اسی سے سبزہ زار پیدا ہوتے ہیں جن میں تم مویشی چراتے ہو، اور اسی لیے تمہارے لیے کھیتی اگاتے ہیں۔ نیز زمینوں اور کھجور اور انجور اور ہر قسم کے پھل۔ بے شک اس میں بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سوچتے رہتے ہیں اور اسی نے تمہارے لٹاؤں سے (کے) لیے رات اور دن، اور سورج و چاند

کو مسخر کیا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم پابند (مسخر) ہیں بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے رہتے ہیں، اور ان (چیزوں) کو بھی مسخر بنایا، جنہیں زمین پر تمہارے لیے پھیلا یا۔ ان کے اقسام مختلف ہیں بے شک اس میں بھی ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جو نصیحت حاصل کرنے رہتے ہیں اور وہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ اور تاکہ تم اس میں سے زیور نکالو جسے تم پہنتے ہو۔ اور گوشتیوں کو دیکھتا ہے کہ پانی کو چیرتی ہوئی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اللہ کے فضل سے تلاش کرتے رہو اور تاکہ تم (اس کا) شکرا داکر رہو۔ اور اس نے زمین میں پہاڑ رکھ دیے ہیں تاکہ وہ تم کو نلے کر ڈلگانے نہ لگے اور دریا اور راستے (بنادے) تاکہ تم راہ پاتے رہو اور غلامتیں بھی انہیں) اور ستاروں سے بھی (لوگ) راہ پاتے ہیں۔ اچھا، تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اسی جیسا ہو جائے گا جو پیدا نہیں کر سکتا؟ تو کیا تم (اتنا بھی) غور نہیں

کرتے؟)۔ (النحل: ۱۰-۱۷)

انسان کو اس کائنات سے فائدہ اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس عالم سے تعاون کرے اور وہ ان قوانین کو سمجھ لے جن پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ عمل کرے۔ اس لیے اس کائنات میں ہر چیز ایک دقیق انداز سے بنائی گئی ہے اور ایسے نقشے پر تعمیر کی گئی جسے اللہ تعالیٰ کے ارادے کے سوا کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔

(ہم نے ہر چیز کو ایک انداز سے پیدا کیا ہے)۔ (القمر: ۴۹)

(اس نے ہر چیز بنائی اور اسے ناپ کر ٹھیک کیا)۔ (الفرقان: ۲)

(اور ہر شے اس کے نزدیک ایک متعین انداز سے ہی ہے)۔ (الرعد: ۸)

اس ترتیب و نظام کے موجود ہونے پر وہ تمام آیات واضح دلیل ہیں جو قرآن کریم میں تاکید سے آئی ہیں اور اس کائنات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں:

(اور ایک نشانی ان لوگوں کے لیے رات بھی ہے۔ ہم اس پر سے دن کو اتار لیتے

ہیں۔ سو یکایک لوگ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں۔ اور (ایک نشانی) آفتاب

بھی ہے کہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے۔ یہ اندازہ ٹھہرایا، ہوا ہے زبردست

اور علم والے (خدا) کا۔ اور (ایک نشانی) چاند بھی کہ ہم نے اس کے لیے منزلیں مقرر کی ہیں یہاں تک کہ وہ ایسے رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی۔ نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے، اور سب

ایک دائرے میں نیررتے ہیں۔ (یس: ۳۷-۴۰)

انسان کا فرض ہے کہ کائنات و مافیہا کی حقیقت جاننے کی پوری کوشش کرے یہاں تک اُسے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہو جائے۔ ایسا کر کے وہ فرمانِ الہی کے تابع ہو جائے گا:

(وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے مسخر کر دیا۔ سو تم اس کے راستوں میں چلو

پھر اور اللہ کی (دی ہوئی) روڑی میں سے کھاؤ۔) (الملک: ۱۵)

اگر وہ اپنی ذمہ داری پوری کرنے سے قاصر رہے گا تو گویا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا فریب ہو گا۔ اور کافروں کو مومنین پر سبقت اور مسلمانوں پر تسلط کا موقع فراہم کرے گا۔

پھر اس انسان کی حقیقت کیا ہے جو ایک طرف تو حقیقتِ الہی تک ایمان، عبادت اور شریعت کے اتباع کے ذریعے پہنچتا ہے اور دوسری طرف کائنات میں غور و فکر کرتا، اسے تسخیر کرتا اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے؟ وہ ایسی مخلوق ہرگز نہیں جو محض مادی وجود رکھتی ہو کہ اس کی موت سے بچھڑ جائے۔ اسی طرح وہ محض روحانی مخلوق نہیں کہ مادی وجود نہ رکھتی ہو اور صرف عبادت اور یادِ الہی میں غرق ہو جائے۔ اسلام کے نزدیک انسان ایک ایسی مہستی ہے جو جسم، عقل اور روح سے مرکب ہے اور خداوند تعالیٰ کی مشیت پر ہے کہ اس کے لیے ایسے حالات پیدا کرے کہ ان تمام عناصر کے مفاصل کو پورا کر سکے، کیونکہ اس کی ذات میں ہر عنصر اپنا اپنا فرض ادا کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں یہ کائنات آباد ہے۔

انسان کی ذات ان تمام عناصر کا مجموعہ ہے، اور خداوند تعالیٰ کے اس قول سے بھی بھی یہی واضح ہوتا ہے:

(جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں انسان کو پیدا کرنے والا ہوں

گیلی مٹی سے، پھر جب میں اُسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی (طرف سے) جان

ڈال دوں تو تم اس کے روبرو سجدے میں گر پڑنا۔) (ص: ۷۱-۷۲)

بنیادی طور پر انسان اپنے فطری میلانات، خواہشات اور جنس، بھوک اور پیاس کے احساسات کے معاملے میں حیوانات یا دوسری ذی روح مخلوقات سے مشابہ ہے :  
(اور جو کئی جانور زمین پر چلنے والا ہے اور جو کئی پرند اپنے دونوں بازوؤں سے اٹنے

والا ہے وہ سب تمہاری ہی طرح کے گردہ ہیں۔) (الانعام: ۳۸)

اس عنصر کی موجودگی، انسان کی محافظت ذات و نوع کے لیے تیار کرتی ہے، لیکن وہ عقل کی وجہ سے جملہ حیوانات اور ذی روح مخلوقات سے ممتاز ہے جو فطری میلانات کا پورا کرنے کا آسان راستہ اختیار کرنے میں اس کی معاون ہے۔ اسی طرح وہ زندگی میں ترقی کرنے اور اس کا ثبات عظیم کے سر بستہ راز کھولنے میں مددگار ہے :

(اور اللہ ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا، اس حال میں کہ تم کچھ نہیں

جانتے تھے اور تمہارے لیے سماعت اور بینائی اور دل پیدا کیے تاکہ تم شکر گزار

بنو۔) (النحل: ۷۸)

جہاں تک روح ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا ثبات کی محنتی قوتوں تک پہنچے اور اس نور سے وجدان حاصل کرے جسے جو اس دیکھ نہیں سکتے اور عقل پا نہیں سکتی۔ عقل اور روح ہی کی بدولت انسان اس زمین پر خلیفہ بننے کا مستحق ہے اور اسی کی وجہ سے وہ اس عظیم امانت کا بار اٹھانے کے قابل ہے جس سے جملہ موجودات نے معذوری ظاہر کی :

(ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی، سوان سب نے انکار

کیا اس سے کہ اسے اٹھائیں اور وہ اس سے ڈر گئے اور اسے انسان نے اپنے ذمے

لے لیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور بڑا جاہل ہے۔) (احزاب: ۷۲)

## کائنات

کائنات کے بارے میں اسلامی نظریے کا نقطہ آغاز یہ ہے کہ کائنات اور اس میں موجود ہر چیز، جس میں آسمان، زمین، سورج، چاند، مخلوقات اور انسان شامل ہیں، اللہ تعالیٰ نے پیدا کی اور اپنے آپ ظہور میں نہیں آئی، نہ وہ فطری تبدیلیوں اور تغیرات کا نتیجہ ہے۔ یہ بیکار اور بے مصرف بھی پیدا نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی پیدائش ایک معین مقصد کے لیے کی۔

کائناتِ عبت بے مقصد اور بے وجہ پیدا نہیں کی گئی۔ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ انسانی سرگرمیوں کے لیے میدان مہیا کرے جس میں انسان اپنی قوتوں اور امکانات کو بروئے کار لائے اور اپنی منفعت کے لیے مسخر کرے۔ اس منفعت کا نتیجہ عبادتِ الہی کا حصول اور انسانی معاشرے میں شریعتِ خداوندی کا قیام ہے۔ اس مضموم تک رسائی کے لیے کسی بھی محقق کے لیے یہ مشکل نہیں کہ وہ قرآنِ کریم کی کائنات اور مخلوقات سے متعلقہ آیات میں سے کسی بھی آیت کا مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ تسخیرِ کائنات کا مستقل ربط انسانی منفعت سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

بے شک (اللہ ہی) دانے اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے، وہی جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے اور بے جان کو جاندار سے نکالتا ہے والہ ہے۔ وہی تمہارا اللہ ہے سو تم کہاں اُٹھے چلے جا رہے ہو؟ وہ صبح کو برآمد کرنے والا ہے اور اسی نے راتِ راحت کی چیز بنائی اور سورج اور چاند کو حساب سے رکھا ہے۔ یہ ٹھہرایا ہوا ہے، بڑے غلے کا، بڑے علم والے کا۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے تارے بنائے تاکہ تم ان کے ذریعے سے خشکی اور تری کی تاریکیوں میں راہ پاؤ۔ بے شک ہم نے دلائل کھول کر بیان کر دیئے ہیں ان لوگوں کے لیے جو خبر رکھتے ہیں، اور وہی تو ہے جس نے تم (انسانوں کو) پیدا کیا ایک ہی شخص سے۔ پھر ایک جگہ زیادہ رہنے کی اور ایک جگہ چند سے رہنے کی (ہے) بے شک ہم نے دلائل خوب کھول کر بیان کر دیئے ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں اور وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ذریعے سے ہر قسم کی روئیدگی کو نکالا۔ پھر ہم نے اس سے سبز شاخ نکالی کہ ہم اس سے اوپر تلے چڑھے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے درختوں سے یعنی ان کے گچھوں سے خوشے (نکلنے ہیں) نیچے کو لٹکے ہوئے اور (ہم نے) باغ، انگور اور زیتون اور انار کے (پیدا کیے) باہم مشابہ اور غیر مشابہ، اس کے پھل کو دیکھو جیب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو (دیکھو) بے شک ان سب میں دلائل ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان کی طلب رکھتے ہیں۔ (الانعام: ۹۵-۹۹)

کائنات کا نظام مضبوط اور مستقل قواعد پر مبنی ہے جس سے انسان کے لیے اس سے  
الشفاع آسان ہو جاتا ہے

”کائنات میں (پیش آنے والے واقعات، ایک دوسرے سے اور ماضی و مستقبل  
سے، باقاعدگی اور تسلسل سے مربوط ہیں، اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات  
اپنے وجود اور حرکات میں یعنی قواعد کی تابع ہے“

اور اسی کے بارے میں قرآن کریم میں آیا ہے:

”اور ایک نشانی ان لوگوں کے لیے رات بھی ہے۔ ہم اس پر سے دن کو اتار لینے ہیں  
سو یکایک لوگ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں اور (ایک نشانی) آفتاب بھی کہ اپنے  
ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے۔ یہ اندازہ ٹھہرایا ہوا ہے زبردست (اور) علم والے  
(خدا) کا۔ اور (ایک نشانی) چاند بھی کہ ہم نے اس کے لیے منزلیں مقرر کی ہیں یہاں  
تک کہ وہ ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی۔ نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند  
کو جا پکڑے اور نترات دن سے پہلے آسکتی ہے اور سب ایک ایک دائرے  
میں تیر رہے ہیں۔“ (یس : ۳۷-۴۰)

اور پھر فرمایا:

”اور ہم نے آسمان سے اندازے کے ساتھ پانی برسایا، پھر ہم نے اسے زمین میں  
ٹھہرایا اور ہم اس کے معدوم کرنے پر بھی قادر ہیں۔ پھر ہم نے اس کے ذریعے سے  
تمہارے لیے کھجوروں کے اور انگوروں کے باغ اگائے، ان میں تمہارے لیے  
بہت سے میوے ہیں اور ان میں سے تم کھاتے بھی ہو۔“ (المومنون: ۱۸-۱۹)

اس کے بعد مزید کہا:

”کیا تمہیں یہ علم نہیں کہ اللہ ایک ایک بادل کو چلانا رہتا ہے، پھر اس کو باہم ملا دیتا  
ہے، پھر اس کو تہہ بہ تہہ کر دیتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے بارش کو کہ وہ اس کے  
بیچ میں سے نکل کر آتی ہے۔“ (النور: ۳۳)

پھر فرمایا:

”کیا تم نے اس پر نظر نہیں کی کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر اسے زمین



کے سوتوں میں داخل کر دیا، پھر وہ اس کے ذریعے سے کھیتیاں پیدا کرتا ہے۔ جس کی مختلف قسمیں ہیں، پھر وہ کھیتی خشک ہو جاتی ہے، سو تم اس کو زرد دیکھتا ہے، پھر وہ اس کو چورا چورا کر دیتا ہے۔ اس (نمونہ قدرت) میں بڑی نصیحت ہے اہل عقل

کے لیے“ (الزمر: ۲۱)

گو یا جب کائنات میں پیش آنے والے واقعات کے بدیہی ثبوت موجود ہیں اور ان واقعات میں ہم آہنگی، باقاعدگی اور واضح قوانین کی پابندی نظر آتی ہے اور اسلامی تصور کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس بات پر ایمان لے آئے کہ ان تمام اسباب کے پیچھے، اللہ کا ارادہ موجود ہے اور وہ کسی ایک حقیقت کو جان لینے، یا کسی ایک سبب تک پہنچنے پر مطمئن نہ ہو جائے یا اس سے فریب نہ کھائے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

”ہمیں نے نہیں پیدا کیا ہے، سو تم (بعث تانی کی) تصدیق کیوں نہیں کرتے؟ اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم جو نطفہ پہنچاتے ہو تو اس کے بنانے والے تم ہو کہ ہم؟ ہمیں نے تمہارے درمیان موت کو ٹھہرا رکھا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں کہ تمہاری جگہ تم جیسے (دوسرے آدمی پیدا کر دیں اور تمہیں ایسی صورت میں بنا دیں جن کو تم جانتے ہی نہیں، اور تم کو خوب علم ہے۔ پیدائش اول کا، پھر تم سمجھنے کیوں نہیں؟ اچھا، پھر یہ بتاؤ کہ جو کچھ تم بوتے ہو اسے تم اگانے ہو یا (اس کے) اگانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس (پیداوار) کو چورا چورا کر دیں پھر تم حیرت کرنے لگو، (اب کی تو) ہم پر تاوان پڑ گیا بلکہ ہم (بالکل ہی) محروم رہ گئے! اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو اس کو بادل سے تم برسانے ہو یا (اس کے) برسانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو کڑوا کر دیں تو تم شکر کیوں نہیں کرتے؟ اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جس آگ کو تم لگانے ہو اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ ہم نے اس کو یاد دہانی کی چیز اور مسافروں کے نفع کی چیز بنایا ہے۔ سو اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کیجئے“ (الواقفہ: ۵۷-۷۴)

اسی طرح انسان، عناصر کائنات کی حقیقت کی تلاش میں ہمیشہ مضبوط اور یقینی نقطہ آغاز کی طرف لوٹتا ہے جو اسے ٹامک ٹوٹیاں مارنے اور عقل اور فطرت جیسے غیر یقینی اور غیر حقیقی واقعات کی

اسباب پر بھروسہ کرنے سے بچا لیتا ہے، یا کسی اساطیری کائنات کی طرف جھکنے سے محفوظ رکھتا ہے جیسے کہ قدیم صنم پرستوں نے کیا، یا کسی فلسفیوں کو غلط فہمی ہوئی۔ تصورِ اسلامی کے نزدیک کائنات اور زندگی کے تمام رشتے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اور اسی کی نگرانی اور نگرہبانی اور اختیار میں ہیں۔

جو شخص کائنات کو غور و فکر کا موضوع بنانا ہے، جلد ہی اس بات کو جان لیتا ہے کہ اس کا علم کتنا ہی وسیع و جامع کیوں نہ ہو، کائنات کے بہت معمولی حصے کو پاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب ”موانع النجوم“ کی قسم کھائی تو اس کا مقصد ستاروں پر غور و فکر کی طرف انسان کو متوجہ کرنا تھا۔ اس پر یہ اٹکا ہو گیا کہ ستاروں کی تعداد عقل انسانی کے احاطہ سے باہر ہے کیونکہ وہ لاکھوں ہیں، اور ان کے حجم اتنے ہیبت ناک ہیں کہ زمین پر کام آنے والے آلات انہیں ناپنے سے قاصر ہیں۔ زمین اور دوسرے سیاروں کے حجم میں آسان سا موازنہ ہی ہماری بات کی تصدیق کرے گا، اور انسان کو معلوم ہو گا کہ ستاروں کا سائز اور ان کا درمیانی فاصلہ اتنا ہے کہ اسے صرف جدید دور کے ”نوری پیمانے“ ہی سے ناپا جاسکتا ہے۔ ایک ”نوری سیکنڈ“ وہ مسافت ہے جو روشنی ایک سیکنڈ میں طے کرتی ہے۔ پھر جب ہمیں معلوم ہو کہ روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیالیس ہزار میل کا سفر طے کرتی ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہوں کہ بعض سیاروں کا درمیانی فاصلہ لاکھوں ”نوری سال“ کے برابر ہے تو ہمیں اس کائنات کی عظامت اور عظمت کا احساس ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی ضمن میں فرمایا ہے:

”آپ کہہ دیجئے کہ اگر سمندر (سارے کے سارے) روشنائی ہو جائیں، میرے

پروردگار کی باتیں لکھنے کے لیے، تو سمندر ختم ہو جائے گا اور میرے پروردگار کی

باتیں ختم نہ ہو سکیں گی اور اگرچہ ہم اسی جیسا (اور سمندر) اس کی مدد کو لے آئیں۔“

(الکہف : ۱۰۹)

جب ہم اپنی نظر ”زندہ کائنات“ پر ڈالتے ہیں، تو ہمیں اجناس، اشکال اور رنگ رنگ تباہات میں بھی تخلیق کی وسعت، تنوع اور ایک دوسرے سے امتیاز نظر آتا ہے جن کا احاطہ مشکل ہے اور یہ سب کچھ ایک ہی زمین سے نکلنا ہے اور ایک ہی پانی سے سیراب ہوتا ہے۔

ضروری ہے کہ ہم یہاں دو معنوں کی طرف اشارہ کر دیں: پہلا مفہوم تو یہ ہے کہ اس

کائنات میں غور و فکر سے مراد محض نظری اور بصری تاہل یا حواس سے اندازہ نہیں۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اس پر علمی انداز میں باقاعدہ غور کیا جائے جس سے کائنات میں رونما ہونے والے واقعات اور اس کے ضابطوں کا پورا پورا شعور حاصل ہو اور قرآن کریم میں وارد کلمات "یتفکرون" یا "تدبرون" یا "یتعلون" کا مفہوم کائنات میں رونما ہونے والے واقعات اور اس کے مظاہر کو دیکھنے کے بعد، اسی معنی میں واضح دلالت کرتے ہیں:

"بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور لیلیٰ و نہار کے آگے پیچھے آنے، اور ان کشتیوں میں، جو سمندر میں چلتی ہیں..... عقلمند لوگوں کے لیے نشانیوں میں" (البقرہ: ۱۶۴)

"جو لوگ اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے ہیں، اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں (کہ) اسے ہمارے رب! تم نے یہ (سب کچھ) بیکار نہیں بنایا۔" (آل عمران: ۱۹۱)

دوسرا معنی یہ ہے کہ جن آیات قرآنی میں کائنات کا، مع مختلف موضوعات کے، ذکر آیا ہے بعض علماء کے نزدیک ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم تو گو یا سائنس کی کتاب ہے جس میں کائنات کے مفردہ اور معینہ نظریات درج ہیں۔ اسی لیے بعض قدیم و جدید مفسرین نے قرآن کریم کی سائنسی مثر میں لکھیں۔ قدیم مفسرین میں امام غزالیؒ اور امام فخر رازیؒ اور جدید علماء میں علامہ طنطاوی جوہری اور عبداللہ فکری کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ طریق کار پرخطر اور دشوار گزار ہے، کیونکہ قرآن کریم فزکس یا کمسٹری یا حساب کی کتاب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے رشد و ہدایت اور نظام حیات کی کتاب بنا کر اتارا۔ ہماری رائے میں مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ ان آیات سے یہ مطلب اخذ کرے کہ یہ کائنات میں غور و فکر کی دعوت دیتی، اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات اور کائنات میں غور و فکر دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات اور کائنات میں رنگارنگی میں سوچ بچار پر ابھارتی ہیں۔ اس نقطہ نظر سے یہ کہ ادراک حاصل ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز پر محیط ہے اور علم یقینی اس کی رضا، مشیت اور الہام کے بغیر نہیں ملتا۔ قرآن کریم کی آیات کی سائنسی تفسیر درست نہیں کیونکہ سائنس کے نظریات اور قوانین بدلتے رہتے ہیں اور کبھی ایک ہی حال پر نہیں رہتے۔ آراء کا تغیر اور نظریات و قوانین کی تبدیلی

سائنسی ترقی کا خاصہ ہے۔ اگر ہم کسی دور کے مقبول سائنسی نظریات کی آیاتِ قرآنی سے تفسیر کریں اور بعد میں یہ نظریات تبدیل ہو جائیں تو ہم بڑی مشکل میں پڑ جائیں گے اور لوگ ہم پر غلط بیانی کی تہمت لگانے میں حق بجانب ہوں گے۔ کوئی عقلمند اس موقف کی حمایت نہیں کرے گا۔

## اللہ

وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں اسلامی تصور مادیت پسند اور الحاد پر مبنی مذاہب سے مختلف ہے۔ یہ وہ مذاہب ہیں جو ماورائے مادہ کسی چیز کو نہیں مانتے۔ نہ محسوسات کے سوا کسی بات پر یقین رکھتے ہیں۔ انسانیت ایسے کئی فلسفوں اور مذاہب سے آشنا ہے جو اللہ کے وجود کو ماننے پر آمادہ نہیں۔ بعض غیر سماوی ادیان، انسانی طاقت سے بلا طاقتوں پر ایمان تو رکھتے ہیں، لیکن اللہ کے ساتھ دو یا تین خداؤں کو شریک بناتے ہیں۔ فارسی مذاہب دو خداؤں کو مانتا ہے۔ ایک خیر کا خدا، دوسرا شر کا خدا، عیسائیت، حالانکہ بنیادی طور پر سماوی دین ہے لیکن اہل کلیسا نے تثلیث کا عقیدہ اپنا لیا۔ ان کے نزدیک ”باپ، بیٹا اور روح القدس“ تین خدا ہیں۔ اسی طرح یہودیت بھی سماوی دین ہے جو اصل میں خدا کے واحد پر ایمان رکھتا ہے لیکن یہودیوں کے اجداد نے خدا کو اس طرح مجسم بنا ڈالا کہ وہ انسان سے مختلف نظر نہیں آتا۔

ضروری ہے کہ ہم ان چند آیاتِ قرآنی کا مطالعہ کریں جو اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کے بارے میں آئی ہیں، تاکہ الہیت کے موضوع پر تصورِ اسلامی کی حقیقت جان لیں اور اس کے بارے میں اسلامی مفہوم اور دیگر ادیان و فلسفہ کے مفہوم میں واضح امتیاز کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے، نہ اس کے کوئی اولاد ہے، نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔“ (الاحلاص: ۱: ۴)

”وہی ہے (سب سے) پہلے اور (سب سے) پیچھے، اور (وہی) ظاہر و مخفی بھی، اور وہی ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے۔“ (الحدید: ۳)

..... اس کے سوا ہر شے فنا ہونے والی ہے۔ حکومت اسی (ایک) کی ہے اور اسی

کی طرف تم (سب) لوٹانے جاؤ گے۔“ (التقصص: ۸۸)

”ہر چیز کا خالق“ (الانعام: ۲، الراعد: ۱۶۲، الزمر: ۶۲، مومن: ۶۲)

”اور اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔“ (الاحزاب: ۲۷)

”اور اللہ ہی کا ہے مشرق (بھی) اور مغرب (بھی)، سو تم جدھر کو بھی منہ پھیرو، اللہ

ہی کی ذات ہے۔“ (البقرہ: ۱۱۵)

”اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اُسے (خوب) دیکھ رہا ہے۔“ (البقرہ: ۹۲، آل عمران

۱۶۳، المائدہ: ۷۱)

”یاد رکھو، اسی کے لیے خاص ہے آفرینش (بھی) اور حکومت (بھی)۔“ (الاعراف: ۷)

”یاد رکھو کہ وہ ہر چیز کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔“ (حم السجدہ: ۵۲)

”اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں، تو میں تو قریب

ہی ہوں۔ دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے،

پس لوگوں کو چاہیے کہ میرے احکام قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ ہدایت

پا جائیں۔“ (البقرہ: ۸۶)

”کوئی چیز اس کے مثل نہیں۔“ (الشوریٰ: ۱۱)

”اسے نگاہیں نہیں گھیر سکتیں اور وہ نگاہوں کو گھیرے ہوئے ہے، اور وہ بڑا

باریک بین، بڑا باخبر ہے۔“ (الانعام: ۱۰۳)

”کوئی اس کے حکم کو ہٹانے والا نہیں۔“ (الرعد: ۲۱)

”اور اللہ ہی کے اُگے جھکے رہتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔“ (الرعد: ۱۵)

ہم نے اوپر جن آیات قرآنی کا حوالہ دیا ہے وہ اسلام میں عقیدہ الوہیت کا مجمل تصور پیش

کرتی ہیں اور یہی مجمل عقیدہ، عقلی اور دینی دونوں لحاظ سے، سب سے مکمل عقیدہ ہے۔ یہ

آیات دو وجودوں کا ذکر کرتی ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل ہیں۔ پہلا وجود وہ ہے جو خالق

واحد ہے جس کی ابتداء ہے نہ انتہا، جو ہر شے پر قادر ہے، ہر بات کا جاننے والا ہے، ہر چیز کا

احاطہ کیے ہوئے ہے اور جس کی مانند کوئی دوسرا نہیں۔ دوسرا وجود عالم مخلوقات ہے جسے

اللہ نے پیدا کیا، جو اللہ ہی کی طرف کوٹنے والی ہے اور جس طرح مشیت الہی سے وہ عدم سے وجود میں آئی اسی طرح وجود سے عدم میں بھی جانے والی ہے۔

اللہ تعالیٰ کائنات کی کوئی ایسی فوٹ نہیں جو محض ہو، جیسے کہ بعض فلسفیوں نے تعبیر کیا ہے، کیونکہ وہ تو ایک ازلی ہستی ہے جو کائنات سے الگ اور ممتاز ہے اور وہ بجائے خود "فطرت" ہے نہ کائنات، کیونکہ یہ مادی تصور "ہستی کے بارے میں اسلام کے بنیادی تصور کو منہدم کر دیتا ہے۔ ذات باری تعالیٰ فلسفیوں کے خدا کی طرح، ایسی "علت العلیل" نہیں جو ادراک و عقل سے باہر ہو اور جس کا وجود دنیا میں محض فرضی ہو کیونکہ ایسا تصور تفسیر و تعبیل کا محتاج ہے اللہ تعالیٰ نے ایسا ازلی وابدی وجود یا کمال محض بھی نہیں، جسے تخلیق عالم یا کسی بات کے ارہنے کی پروا نہیں، جیسا کہ ارسطو نے گمان کیا تھا، اس لیے کہ یہ بات کمال کے عقلی تصور کے ابتدائی اصولوں کے بھی خلاف ہے۔

استاد عباس محمود عقاد نے اپنی کتاب "حقائق الاسلام و اباطل مسخومہ" اور اپنی کتاب "اللہ" میں ان مخالف تصورات کو پیش کیا ہے جنہیں ہم فوری موازنہ کے لیے درج کرتے ہیں:

"مذہب ارسطو میں اللہ ایک ازلی وابدی وجود ہے، کمال محض ہے جس کی ابتداء ہے نہ انتہا، کوئی عمل ہے نہ ارادہ، اس لیے کہ عمل کا مطلب کسی چیز کی خواہش کرنا ہے اور اللہ ہر خواہش سے بے نیاز ہے۔ اسی طرح ارادہ دو باتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب ہے اور اللہ کے پاس اصلح اور افضل سے بڑتر کمال موجود ہے اس لیے اُسے صالح اور غیر صالح یا بہتر اور کمتر میں انتخاب کی ضرورت نہیں۔ ارسطو کی رائے میں خدا کو یہ بھی زیب نہیں دیتا کہ وہ زمانے کسی کام کو شروع کرے کیونکہ وہ ابدی اور سرمدی ہے اور اس پر کوئی ایسی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی کہ آمادہ عمل کرے۔ اس کی ذات مطلق کے لیے، جس کا اول ہے نہ آخر، جدید ہے نہ قدیم، کوئی نئی چیز داخل نہیں کی جاسکتی۔ اس کے کمال کا تقاضا یہ ہے کہ اسے بقا کی نعمت حاصل ہے جس سے بڑی کوئی آرزو نہیں نہ اس سے بالاتر کوئی نعمت ہے اور کوئی ایسی چیز نہیں جو اس

نعمت کے دائرے سے باہر رہ گئی، جو جس کی خدا کو پرواہ ہو، چنانچہ خدا نے کامل کو، جس کا کمال ہر لحاظ سے آرزو بے نیاز ہے تخلیق عالم سے یا اس مادہ اولیٰ یعنی ہیولیٰ کو پیدا کرنے سے کوئی سروکار نہیں، لیکن چونکہ ہیولیٰ میں وجود قبول کرنے کی صلاحیت پائی جاتی تھی اس لیے وجود میں آنے کا شوق اسے عدم سے وجود میں لے آیا ہے اور یہ وجود اس پر خدا کا فیضان ہے۔ یہ "شوقِ نمود" جس نے اُسے وجود بخشا ہے، اُسے نقص سے اس کمال کے حصول پر اکساتا ہے جو اس کی حدود کے لیے ممکن الحصول ہے اسی لیے ہیولیٰ مائل بہ حرکت و عمل رہتا ہے کیونکہ اس میں شوق و صلاحیت موجود ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہیولیٰ خدا کی تخلیق ہے۔ ہاں مگر یہ کہ اس اعتبار سے اُسے خدا کی تخلیق مان لیا جائے.....

"جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ اہل فارس دو خداؤں کو مانتے تھے۔ ان کے ہاں نیکی کا خدا اور تھا جس کا کام دنیا میں نیکی اور روشنی پھیلانے تک محدود تھا، اور بدی کا خدا الگ تھا جس کی قدرت میں بدی اور تاریکی مٹی۔ ان کے خیال میں تخلیق کائنات سے پیشتر، روشنی اور تاریکی کی الگ الگ مملکتیں تھیں۔ "ہرمز" نے خیر و رحمت کے عناصر پیدا کرنے شروع کیے۔ "اہرمز" اپنی زیر زمین مقام گاہ میں محو خواب رہا۔ ایک دن جو اس نے اپنے بھائی (ہرمز) کی خبر معلوم کرنے کے لیے نظر اٹھائی تو اُسے بھائی کی مملکت کی طرف سے چمک نے خیرہ کر دیا۔ وہ اپنے انجام سے ڈرا اور سمجھ گیا کہ نور ہر طرف پھیل جائے گا اور اس کا سیلاب آجائے گا اور اس کے لیے پناہ کی کوئی جگہ نہیں رہے گی نہ اسے امن ملے گا تو وہ گھبرا گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ تاریکی کی تمام مخلوقات، یعنی بدی اور فساد کے شیطاں بھی، پریشان ہو کر باہر نکل آئے چنانچہ "ہرمز" کی کوششیں ناکام ہو گئیں اور کائنات خراب اور مصائب سے بھر گئی....."

یونان کے فلسفیوں میں سے جنہیں "اہیتین" کہا جاتا ہے، اطلو طین

تیسری صدی مسیحی) کا متعدد فلاسفہ اسلام پر خصوصاً "انٹرا قیہیں" پر خاصا اثر ہے۔ وہ اپنے مزعومہ خدا نے

احد کے بیان میں مبالغے سے کام لیتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ اس خدا کی حد کمال یہ ہے کہ وہ اپنے سوا کسی کے بارے میں نہ سوچے بلکہ وہ اپنی ذات کے بارے میں بھی شعور نہیں رکھتا کیونکہ وہ اس شعور سے منزہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مذہب میں اس خدا سے احد کے جو ہر چیز سے "رنجالی" ہے اور مخلوقات مگر یہ اور مخلوقات سفلیہ (مخصوصاً ایسی مخلوق کے جو روح و جسم کا مرکب ہے) درمیان میں رابطے کے لیے، کئی واسطوں کی ضرورت پڑے گی۔ اس وجہ سے افلوطین کو آتا پڑا کہ اس "ایک" عقل کو پیدا کیا عقل نے روح کو پیدا کیا اور روح نے بالترتیب دوسری پست موجودات پیدا کیں جو آنے والے مختلف ادوار میں درجہ بدرجہ نیچے اترتے ہوئے، عالم ہیولی و قساوت تک پہنچیں۔ گویا افلوطین کے نزدیک، اس خدا کا کام صرف عقل کی تخلیق تک محدود ہے، اور اس کے بعد اس کا وردِ سر ختم ہو جاتا ہے!

جہاں تک بنی اسرائیل کے تحریف شدہ تصورات کا تعلق ہے، تو وہ خدا کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جو کسی صاحبِ وجودت انسان کی تصویر سے مختلف نہیں۔ ایسا انسان جو مشتعل ہوتا ہے، دوسروں سے حسد کرتا ہے، کینہ پور ہے، اپنی ذات یا قبیلے کے لیے جوش میں آجاتا ہے انتقام پسند ہے اور شکست و ریخت کا دلدادہ ہے! یہودیوں کے پاس جو تورات ہے، یہاں ہم اس میں سے تین تصویریں پیش کرتے ہیں جو ہماری بات واضح کرتی ہیں:

پہلی تصویر (کتاب تکوین سے):

"رب اللہ نے کہا: یہ انسان، جو ہمارے جیسا ایک، خدا جا رہا ہے اور تیرا شر جاننے لگے شاید اب بڑھ کر شجر حیات سے بھی کچھ پالے جسے کھا کر تا ابد زندہ رہے گا..... پھر رب اللہ نے اسے جنت عدن سے نکال کر واپس دنیا میں بھیج دیا کہ جائے اور وہیں کام کرے".....

دوسری تصویر (کتاب تکوین ہی سے)

"جب روئے زمین پر آدمی پڑھنے لگے اور ان کے بیٹیاں پیدا ہوئیں تو خدا کے بیٹوں نے آدمی کی بیٹیوں کو دیکھا کہ وہ خوبصورت ہیں اور جن کو انہوں نے چنا، ان سے بیاہ کر لیا۔ تب خداوند نے کہا کہ میری روح انسان کے ساتھ ہمیشہ مزاحمت نہ کرتی رہے گی کیونکہ وہ بھی تو بشر ہے..... اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی



بدی بہت بڑھ گئی ہے اور اس کے دل کے تصور اور خیال سدا بڑے ہی ہوتے ہیں تب خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا اور خداوند نے کہا کہ میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا، روئے زمین سے مٹا ڈالوں گا۔ انسان سے لے کر حیوان اور رنگینے والے جاندار اور ہوا کے پرتوں تک، کیوں کہ میں ان کے بنانے سے ملول ہوں۔“.....

تیسری تصویر (کتاب سیموئل ثانی، باب ۲۴ سے) :

”سو خداوند نے اسرائیل پر دبا بھیجی جو اسے صبح سے لے کر وقتِ معینہ تک رہی، اور رآن سے بڑی تلخ تک لوگوں میں سے ستر ہزار آدمی مر گئے اور جب فرشتے نے اپنا ہاتھ بڑھا یا کر یرد شلم کو بھی ہلاک کرے تو خداوند اس دبا سے ملول ہوا اور اس فرشتے سے جو لوگوں کو ہلاک کر رہا تھا، کہا: بس اتنا کافی ہے۔ اب تم جاؤ۔“

حضرت عیسیٰؑ کی فطرت، ان کے ارادے اور ان میں اللہ ہیت کا عنصر ہونے کے بارے میں کلیسا کے تصورات بھی یہودیت سے بہتر سے نہ تھے۔ چنانچہ متعدد عوامل کی وجہ سے عیسائیت میں بت پرستی اور شرک داخل ہو گئے۔ مثلاً رومی سلطنت میں عیسائیت سرکاری مذہب قرار پانے کے بعد منافقین کا ایک گروہ امور حکومت پر مسلط ہو گیا، جنہوں نے روم کے بت پرستانہ عقائد اور روایات کو عیسائیت میں منتقل کر دیا۔ اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مفکر اسلام نے کہا:

”روم عیسائی نہیں ہوا بلکہ عیسائیت رومی بن گئی اور روم کے اخلاق و روایات اور یونانی فلسفیوں کے نظریات و عقائد میں سے تثلیث کا عقیدہ لے لیا۔ تاہم عبد الجبار الہمدانی نے اس پر اضافہ کیا کہ: ”عیسائیت میں تثلیث کا عقیدہ رومی فلسفیوں نے داخل کیا جو یہ سمجھتے تھے کہ عقل، حافل اور معقول ایک ہو جاتے ہیں گویا ایک میں تین اور تین میں ایک“۔

اللہ ہیت کے تصور پر ان میں فرقے بن گئے: ایک فرقہ کہتا ہے کہ باپ، بیٹا اور روح القدس تین مختلف صورتیں ہیں، جن کے ذریعے خدائے خود کو لوگوں پر ظاہر کیا۔ ان کے خیال میں خدائیں ”انانیم“ (شخصیتوں) کا مرکب ہے۔ یعنی باپ، بیٹا (مسیح) اور روح القدس؛ چنانچہ اللہ جو باپ

ہے، اپنے مقام سے اتر کر، روح القدس کی صورت بنا، پھر مریمؑ کی شکل میں انسانی جسم اختیار کیا اور ان سے یسوع کی صورت میں پیدا ہوا..... وغیرہ وغیرہ

یہ سب فاسد تصورات اس شرک، بت پرستی، دیومالائی داستانوں اور دیگر خرافات کے علاوہ ہیں جن کے نئے عیسائیت پہلے ہی دہی ہوئی تھی، یعنی بتوں کی پوجا سے ستارہ پرستی سے ملائکہ کی عبادت تک۔ وغیرہ۔

ان سب کے برعکس، الوہیت کا اسلامی تصور یکتا اور ممتاز ہے کہ اللہ ایک کامل اور مطلق وجود ہے جو جسم ہے نہ ایسا جو ہر جس کی حدود جانی جاسکیں یا جسے ناپا تولہ جاسکے اور نہ کسی چیز سے مماثل ہے۔ وہ زمان و مکان میں محدود نہیں، نہ وہ کسی چیز میں حلول کرتا ہے، نہ کوئی چیز اس میں حلول کرتی ہے، اور جو کچھ کائنات میں ہے اس سے بے نیاز ہے۔

وہ ذات جو ابدی، کامل اور محض کمال ہے، صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اور اس باعث یہ تصور ان تمام تصورات سے مختلف ہے جو شرک اور بت پرستی پر قائم ہیں۔ یہ کمال محض قدرت اور فیضان کے بغیر ممکن نہیں اور قدرت اور فیضان تخلیق و ایجاد کے بغیر ممکن نہیں۔ اس طرح انسان کا معاملہ ایسے خدائے حق و خالق، صاحب ارادہ محافظ و نگران، اور قادر مطلق سے ہے جو "اپنے ارادے کو عملاً بروئے کار لانے والا اور مکمل صلاحیت فعل و اختیار کا مالک ہے۔ تمام امور کا مرجع اسی کی ذات واحد ہے اور اس کائنات کی تخلیق ابتداً بھی اس کے ارادے سے ہوئی اور جو کچھ یہاں بعد میں پیدا ہوتا ہے وہ بھی اسی کے ارادے کے ماتحت ہوتا ہے۔ اس کائنات میں ہونے والی ہر حرکت اور ہر تغیر و تبدل، الغرض جو کچھ بھی یہاں وقوع پذیر ہوتا ہے اسی کے ارادہ و تدبیر سے اور اسی کے علم و تقدیر کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ ذات پاک اپنے ارادے، علم و تدبیر کا براہ راست رابطہ اپنے ہر بندے کے ساتھ قائم رکھتی ہے اور اس کے تمام حالات میں اس کے ساتھ ہوتی ہے، بلکہ اس کائنات کے ہر ذی جیات اور ہر چیز کے ساتھ موجود ہوتی ہے"۔

اگر یہ تصور انسان کے وجدان میں راسخ ہو جائے تو اس سے یقیناً اس کی شخصیت بلکہ پوری زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوں گے اور اس کی زندگی باقاعدہ اور منظم ہو جائے گی جس میں لاتعداد اللہ پر اعتقاد کے سبب، کوئی خلش نہیں ہوگی، اور یہ زندگی مطمئن اور پرسکون بھی ہوگی، کیونکہ یہ خدائے حکیم و خبیر کے حضور اطاعت گزار ہوگی جو جانتا ہے کہ بندے کے لیے اچھا ہے اور کیا بُرا۔

ایسی زندگی کی بس یہی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنے دانا و پینا رب کا ارادہ پالے، خواہ اپنی عقل سے یا خداوندی پیغامات کے ذریعے جو انسان پر بتدریج رب کائنات کی عنایت و حکمت کے مطابق نازل ہونے رہتے ہیں۔

کسی مخلوق یا کسی گروہ کا انسانوں پر ان کے عقائد میں کوئی تسلط نہیں نہ ان میں صفاتِ خداوندی میں سے کوئی صفت پائی جاتی ہے اِتَّخَذُوا اٰخْبَارَهُمْ وَذُھِبَانَهُمْ اَدْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ“ حتیٰ کہ خود رسول بھی خدا کا پیغام پہنچانے والا ہے اور اس پر وار و غہ یا حاکم نہیں۔ اس لحاظ سے اللہ کے بارے میں اسلامی عقیدہ وحدانیت کا مکمل ترین مفہوم اور اس کی سادہ ترین شکل پیش کرنے میں خاصا ترقی پسندانہ ہے اور اسلام خداؤں کی کثرت کی کسی بھی نوع یا تعددِ خدا کے بارے میں کسی رمز و کنایہ تک کو ناپسند کرتا ہے۔

## اسلام کے قائم کردہ مثالے

اسلام نے تمام ادیان اور خداوندی رسالت کو ختم کر دیئے، اس لیے مثالوں، اشیاء اور اخلاقیات کی اقدار کو بدلنے میں اس کا گہرا اثر پڑا۔ اس طرح بعض اشیاء کی قدر و قیمت بڑھ گئی اور بعض کی گھٹ گئی، چنانچہ زندگی کے اصول و ضوابط وہ نہ رہے جو کل تک تھے گویا اسلام فطری طور پر ان بلند اقدار اور بلند شامیوں میں شامل ہو گیا جن کی انسان نے ہمیشہ آرزو کی ہے۔ ان اقدار کا مقصد انسان کی خیر و سعادت کو حقیقت بنانا اور ایک مثالی اور پائیدار زندگی کی ضمانت دینا ہے جو انسان کی شان بڑھائیں۔ اس کی عزت و توقیر میں اضافہ کریں اور اُسے ہمیشہ یہ یاد دلائی رہے کہ وہ اس زمین میں خدا کا خلیفہ اور ائمرُ المخلوقات ہے۔

مثالیوں اور اقدار کے مفہوم پر کسی فلسفیانہ بحث میں پڑے بغیر، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ان عقلی، دینی اور ثقافتی افکار و نظریات اور مقاصد و احکام کا مجموعہ ہے جن پر کسی فرد کو یقین و اعتماد ہو، خواہ ان اقدار کا منبع کچھ بھی ہو۔ ان کا منبع دین بھی ہو سکتا ہے اور قوانین یا انسانی اور اخلاقی تجربات بھی ہو سکتے ہیں۔ انسانی معاشروں میں یہ اقدار ایک سی نہیں ہوتیں۔ ہو سکتے ہیں کہ ایک فرد یا چند افراد، دوسرے معاشروں سے الگ اقدار رکھتے ہوں۔ ان دلائل کے بعد اسلام کی

پیش کردہ اقدار ہیں۔ انسان پسند فلسفیوں کے لیے بہت بڑے محرکات موجود ہیں۔ انسانی تہذیبوں پر تحقیق کرنے والوں نے فلسفہ یا نظریہ اقدار کے عنوان کے تحت ان حاصل شدہ اقدار پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

اگر اقدار کو ان کی رخصت اور انسانیت کی عام فلاح کے حصول کے پیمانے سے ناپا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام، انسان کو انسان بنانے کے لیے سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ ترقی پسندانہ اقدار پیش کرتا ہے۔ اسلامی اقدار کے کئی پہلو ہیں۔ ان اقدار میں، جو فرد سے متعلق ہیں، اسلام کی کوشش یہ ہے کہ انسان کو اس کی زندگی سے بلند تر مرتبہ عطا کرے۔ جس میں اس کی زندگی رہن ہے اور اس حیوانی سطح سے جو صرف کھانے، پینے اور جنسی زندگی تک محدود ہے، اوپر لے جا کر ایسا منصب عطا کرے جو انسانی مشرقت کے لائق ہو، بلکہ اس میں اضافہ کرے۔ وہ امور جو معاشرے سے متعلق ہیں۔ ان میں اسلام افراد میں رابطے کے سب سے بڑے عامل (یعنی اخوت) کو حقیقت بنانا ہے اور پھر اس معاشرے کو تہذیب و تمدن کے بلند ترین مرتبے پر پہنچاتا ہے۔ اس کے علاوہ، وہ افراد اور معاشرے کے دوسرے اداروں کے درمیان عمدہ اور شریفانہ بنیادوں پر رابطے کے ذرائع فراہم کرتا ہے۔

## ایمان

ایمان کے دو معنی ہیں۔ ایک عام، دوسرا خاص۔ عام معنی میں اس میں ہر وہ عقیدہ داخل ہے جسے انسان ماننا ہے، چاہے اس عقیدے کی قدر و قیمت کچھ بھی ہو۔ اس لیے اپنے افکار و عقائد پر ایمان رکھنے والے ہر شخص کو ہم ”مومن“ کہہ سکتے ہیں، اور ”انسان“ کا مفہوم صرف کسی فکر یا عقیدے یا دین پر ایمان ہی سے مکمل ہوتا ہے۔ خاص معنی میں ایمان کا مطلب وہ مثال یہ ہے جن پر اسلام قائم ہے اور جن پر ثقافت اسلامیہ کی بنیاد ہے۔

اس خاص معنی میں ایمان کا شروع ہی میں، اور مفصل، تذکرہ ضروری ہے، کیونکہ یہ تمام اقدار کا مشترک عنصر ہے، بالخصوص جو، ہم اس میں ان موضوعات کا اضافہ کر دیں جو اسلام کا خاصہ ہیں، یعنی سچائی، عدل و انصاف، مساوات اور بحکم انسانی، ورنہ تمام اقدار محض نعرے بازی ہے جن کا انسان کے طرز عمل اور طرز فکر سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس پر مستزاد وہ ارکان جن کو اسلام

ضروری قرار دیتا ہے اور جن کے بغیر مسلمان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا اور یہ ارکان ہیں: اللہ پر، اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، قضا و قدر پر اور بعثت و حناء پر ایمان۔ ان میں سب سے بڑتر اور بنیادی بات، اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانا ہے۔ تو بات یہیں سے شروع ہو جا چاہیے کہ ایمان بالکتاب کا سرچشمہ، اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان ہے، اور اسی طرح قضا و قدر اور بعثت بعد الموت پر ایمان اسی سے وابستہ ہے۔ جب انسان خدا کے واحد و خالق و مدبر پر ایمان لے آئے تو اسے باقی باتوں پر اسی ترتیب سے ایمان لانا ہوگا۔ یعنی ایمان بالکتاب، پھر قضا و قدر پر ایمان، پھر حشر و نشر اور جزا و جزا پر ایمان۔

## ایمان باللہ

اسلامی تصور میں الوہیت کے مقام کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اس پر اتنا اضافہ اور کریں گے کہ اللہ پر ایمان، انسان کی بنیادی ضرورت بن جاتا ہے۔ خواہ وہ عقلی لحاظ سے، یا فطری طور پر جب باقی انداز میں اس پر غور کرے، کیونکہ جب بھی انسان کسی معاشرے میں فطری حالت میں پایا گیا۔ یہ سوال اس کے سامنے ضرور رہتا کہ وہ کہاں سے آیا، کہاں جائے گا، کب جائے گا، کس طرح وجود میں آیا؟ یہ سوالات انسان کے ذہن میں ایمان کے موضوع کو ہمیشہ تازہ رکھتے ہیں، پھر مظاہر فطرت۔ عام ہوں یا شائق۔ قرآن میں جاریہ، اور ایسے حوادث جو کبھی کبھی پیش آنے ہیں۔ انسان کو کائنات کے مقابلے میں اپنی بے بسی کا احساس دلاتے ہیں، چنانچہ وہ اللہ پر ایمان کی بناہ ڈھونڈتا ہے اور زندگی میں اس سے توانائی پاتا ہے۔ انسانی عادت اس احساس کو دبا دیتی ہے لیکن کبھی کبھی جب انسان کو فکر و تامل کا ذرا سا بھی وقفہ ملتا ہے تو پھر وہ تیزی سے سیدھے رشتے پر چل پڑتا ہے اور جب اس پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے۔ تو اسے اپنا جائزہ لیتے کا موقع ملتا ہے اور وہ اللہ سے تعلق قائم کر لیتا ہے اور اس کا ایمان پختہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب اللہ کی طرف سے مکمل اور مسلسل نعمتیں ملتی ہیں تو وہ اس کا شکر گزار ہوتا ہے۔

مومن بننے کے لیے انسان کے لیے اول شرط یہ ہے کہ وہ دل سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین رکھے، کیونکہ اگر اسے خدا کے وجود کا یقین نہ ہو تو اس پر ایمان کیسے لائے۔ اس کی اطاعت کس طرح کرے گا اور اس کے قانون کی پیروی کیسے کرے گا۔ اللہ پر ایمان لانے کے رشتے جڑا جڑا

ہیں۔ کچھ لوگ عقل و فکر سے وہاں تک پہنچتے ہیں، کچھ جذبات و واروات کے ذریعے، بعض آباؤ اجداد سے ورثے میں پاتے ہیں اور چند ایسے بھی ہیں جو شعور و جذبات دونوں سے اس تک پہنچتے ہیں عقل انسانی اپنے خالق تک پہنچنے میں بھٹک جاتی ہے، اور بے عقلی یا نادانی بن جاتی ہے۔ چنانچہ پنچروں یا حیوانات یا انسان کو خدا ماننے لگتی ہے اور ان کے قدموں میں سرنگوں ہو جاتی ہے۔ پھر آسمان سے رسالت آتی ہے تاکہ خدا کے رسولوں اور انبیاء کے ذریعے انسان کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے جائے۔

اللہ کی معرفت کے جن راستوں پر انسان چلتا رہتا ہے۔ ان پر حرکت کرنے سے پہلے یہ ذہن میں رکھیں کہ یہ معرفت یا نو خدا کی حقیقت اور فطرت پر غور کرنے یا اس کی نشانیوں اور مخلوقات پر توجہ مرکب کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی معرفت تو ناممکن ہے کیونکہ اس شیا کی حقیقت جاننے کے انسانی وسائل اس قابل نہیں کہ خدا کی حقیقت اور ذات کا ادراک کر سکیں۔ حقائق و موجودات کا عرفان، انسان کو اپنے حواس و عقل یا مشق و تجربے سے حاصل ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک ناقص اور تغیر پذیر ہے۔ اگر اس طرح ہمارے حواس معرفت الہی پر قادر نہ ہو سکیں تو اس سے خدا کے وجود کا انکار لازمی نہیں آتا۔ کیونکہ ہم کسی ”دنیاؤں“ مثلاً ”عالم جمہائیم“ اور ”عالم افلاک“ وغیرہ سے ناواقف ہیں، لیکن ہماری لاعلمی ان کے ہونے کو مانع نہیں۔ نہ ان بے شمار نتائج کو روک سکتی ہے جو ان کے ہونے سے حاصل ہوتے ہیں، کیونکہ کسی چیز کا وجود اس کے ادراک سے مختلف ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہر جگہ موجود ہیں۔ اگر ہم ذرا دھیان سے غور کریں تو ہمیں اس کا عرفان اور اس پر ایمان لانا مشکل نہ ہوگا۔ اللہ کی فطرت کی معرفت بھی ناممکن ہے، لیکن اللہ کے کاموں کے ذریعے اس کا عرفان معقول بات ہے۔ ہمارے حواس اللہ تعالیٰ کی کلمتہ اور ماہیت جاننے سے قاصر ہیں، لیکن ہمارے حواس دنیا کی ہر چیز سے آگاہ ہیں، وہ تو اس دنیا کی بہت کم چیزوں سے واقف ہیں۔

آسمانی مذاہب میں دوسروں سے اپنی بات تسلیم کروانے کے طریقے خواہ کتنے ہی مختلف ہوں ان کا اظہار اور گواہان اور جذبات کو اپیل پر ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ادراک اور غور و فکر کی قوتوں میں بھی تخریب پیدا کرتے ہیں، کیونکہ خدائے خالق کی حقیقت افکار کی حدود سے باہر ہے، کیونکہ عقل کتنی ہی قوی اور تیز کیوں نہ ہو حواس میں سے ایک حس ہی ہے جو ہمیں

ہماری محدود دنیا سے وابستہ رکھے ہوئے ہے۔ اس لیے عقل کے لیے اپنی حد سے بڑھنا، یا معطل رہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔

ایمان کو اجاگر کرنے کے لیے اسلام فطرت پر بھروسہ کرتا ہے، اور فطرت صرف عقل ہے۔ بعض جذبات، بلکہ دونوں کا امتزاج ہے۔ جب دونوں ملتے ہیں تو ایک دوسرے پر چڑھائی نہیں کرتے۔ فطرتِ سلیمہ اللہ ہی کی طلب گار ہوتی ہے، اور نزدیک ترین راستے سے اس تک رسائی حاصل کرتی ہے۔ ﷻ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”اے لوگوں ایک بڑی بات بیان کی جاتی ہے سوائے سزا۔ جن لوگوں کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ وہ ایک کھٹی زنگ تو پیدا نہیں کر سکتے چاہے سبھی اس غرض کے لیے جمع ہو جائیں اور اگر مکھی ان کے سامنے سے کچھ پھین کر لے جائے تو وہ اس سے پھر اٹک نہیں سکتے۔ کیا ہی کمزور ہے طالب (بھی) اور (ایسا) مطلوب (بھی)!“ (الحج: ۷۳)

یہ شک فطرتِ سلیمہ اس آیت کے سامنے — اور ایسی سینکڑوں آیات کے سامنے — جن کی طرف قرآن کریم نفسِ انسانی کو متوجہ کرتا ہے — دنگ رہ جاتی ہے۔

ایمان کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی صفات سے واقف ہو، کیونکہ اگر وہ یہی نہیں جانتا کہ اللہ ایک ہے، جس کا خدائی میں کوئی شریک نہیں (جیسا کہ مودودی فرماتے ہیں)۔ تو اُسے غیر اللہ کے سامنے سر جھکانے یا دستِ دعا دراز کرنے سے کیسے باز رکھا جاسکتا ہے؟ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ یقین نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ سنتے، جاننے والا اور ہر چیز کو دیکھتے والا ہے تو اُسے خدا کی نافرمانی اور حکمِ عدولی سے کیسے روکا جاسکتا ہے؟ اس کے صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے جن اخلاق و اعمال کا اپنا ضروری ہے۔ ان سے مزین ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اُسے صفاتِ الہی کا پورا علم نہ ہو اور ان کا پوری طرح احاطہ نہ کرے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ صفاتِ جہنم اللہ تعالیٰ نے محمود بیان فرمایا ہے انسان کے سامنے روشنی کے مینار ہیں جن سے وہ اپنے افکار طرز عمل میں روشنی پاتا ہے۔ کرم، حلم، احسان، شفقت اور رحمت سب ایسی صفات ہیں جو اللہ نے محمود بیان کی ہیں۔ وہ معاشرہ کتنا بلند اور اعلیٰ ہوگا جو ان صفات سے مزین ہوگا۔

## ایمان کے ثمرات

ایمان باللہ اور توحید سے جو نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ فرد اور معاشرے دونوں کے لیے یکساں طور پر اہم اور بے شمار ہیں۔ مثلاً غیر اللہ کی غلامی اور اس کے سوا کسی کے سامنے عاجزی سے انسان کی رہائی، اسی باعث قرآن تمام انسانوں کو اس ایمان کی طرف بلاتا ہے:

”آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب ایسے کلمے کی طرف آ جاؤ جو ہم میں تم میں مشترک ہے وہ یہ کہ ہم بجز اللہ کے اور کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔“ (آل عمران: ۶۴)

قرآن غیر اللہ کے سامنے عجز و تباہی سے انتہی مکمل آزادی کا حامی ہے کہ وہ کسی بھی شخص میں تقدس اور عظمت کا نشا ثبہ تک نہیں چاہتا۔ خواہ وہ رسول اور نبی ہی کیوں نہ ہو۔

”اور محمدؐ صرف رسول ہیں۔ ان سے پہلے (کئی) رسول گزر چکے ہیں“ (آل عمران: ۱۴۴)

قرآن نے آپؐ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

”آپؐ کو اس امر میں کوئی دخل نہیں (خواہ) خواہ ان کی توبہ قبول کرے، خواہ انہیں عذاب دے۔“..... (آل عمران: ۱۲۸)

حکومت سب کی سب اس کی ہے، حکم تمام کا تمام اسی کا ہے۔

غیر کے غلبے اور اس کے خوف سے نفس کی آزادی، کیونکہ لوگ جن سے ڈرتے ہیں وہ ان کے نفع و نقصان کے مالک نہیں:

”اور اللہ کے علاوہ کسی (اور) کو نہ پکارو جو تمہیں نفع پہنچا سکے نہ نقصان۔ پھر اگر تو نے (ایسا) کیا تو یقیناً ظالموں میں سے ہو جائے گا اور اگر اللہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچا دے تو کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں (بجز) خود) اسی کے اور اگر وہ تجھے کوئی راحت پہنچانا چاہتا ہے تو اس کے فضل کا بٹانے والا نہیں۔ وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے کر دے۔ وہ بڑا مغفرت والا، بڑا رحم والا ہے۔“ (یونس: ۱۰۶-۱۰۷)

”..... اور خود اپنے لیے کسی نقصان کا اختیار رکھتے ہیں، نہ کسی نفع کا، اور



نہ (کسی کی) موت کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ (کسی کی) زندگی کا اور نہ (کسی کی)

دوبارہ اٹھائے جانے کا۔ (الفرقان: ۳)

نفس جب غیر کے خوف سے آزاد ہو جائے تو وہ غیر اللہ کے سامنے ذلت، بندگی اور عاجزی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ انسان غیر کے سامنے اس لیے ذلیل ہوتا ہے کہ اسے اپنی زندگی یا رزق کا ڈر ہوتا ہے، یا پھر جلبِ منفعت اور دفعِ شر کے لیے ذلیل ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے واضح کر دیا ہے کہ نفع و نقصان اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے جس طرح موت و حیات اور رزق اسی کے حکم کے تابع ہیں:

”تم جہاں کہیں بھی ہو گے وہیں تمہاری موت اُٹے گی خواہ تم مضبوط قلعوں ہی میں

ہو۔“ (النساء: ۷۸)

”اور کسی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ایک ميعادِ مقرر پر حکمِ خدا کے بغیر مر جائے۔“

(آل عمران: ۱۴۵)

”آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم گھروں میں ہوتے (جب بھی) وہ لوگ توجن کے لیے

قتلِ مقدر ہو چکا تھا، اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل ہی پڑتے۔۔۔۔۔“ (آل عمران: ۱۵۴)

چونکہ رزق بھی، موت و حیات کی طرح، اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس لیے اس معاملے میں بھی انسان کو خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے:

”اللہ روزی کھول دیتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے اور

(جس کے لیے چاہے) تنگ کر دیتا ہے۔“ (العنکبوت: ۶۲)

”اور کتنے ہی جانور ہیں جو اپنی غذا اٹھا کر نہیں رکھتے اللہ ہی انہیں روزی

پہنچاتا ہے اور تم کو بھی۔۔۔۔۔“ (العنکبوت: ۶۰)

”اور کوئی جاندار زمین پر ایسا نہیں کہ اللہ کے ذمے اس کا رزق نہ ہو۔“ (ہود: ۶۱)

اللہ پر جاندار ایمان، نفس میں اطمینان، سکون اور اعتماد بھرتا ہے۔ انسان کی روحانی

اور ذہنی قوت میں اضافہ کرتا ہے اور پاس و قنوطیت سے بچاتا ہے اس لیے مومن ہمیشہ رجائیت

پسند ہوتا ہے، جس کا اپنے اوپر اور اللہ کی مدد پر اعتماد ہوتا ہے۔

”جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں ان

اللہ ہی ذکر سے دل اطمینان پاتے ہیں۔“ (الرعد: ۲۸)

”وہی ہے جس نے ایمان والوں کے دلوں میں اطمینان نازل کیا تاکہ ان کے ایمان کے ساتھ ایمان بڑھے۔“ (الفتح: ۲)

”اللہ ایمان والوں کا دوست ہے۔ اُن کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے جو کفر کرتے ہیں ان کے رفیق شیطان ہیں (جو) انہیں نور سے نکال کر ظلمات کی طرف لے جاتے ہیں۔“ (البقرہ: ۲۵۷)

”جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، انہیں ان کا رب ان کے ایمان کی

وجہ سے ہدایت دے گا۔“ (یونس: ۹)

جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے مایوسی کسی حال میں بھی اس کے دل میں سرایت نہیں کرتی۔ جب اس پر زندگی گراں ہو جائے اور جملہ مادی وسائل منقطع ہو جائیں تو بھی اللہ کی آنکھ اس سے غافل نہیں ہوتی اور اُسے اس کے حال پر نہیں چھوڑ دیتی۔ چنانچہ وہ خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے مسلسل جدوجہد کرتا رہتا ہے اور ہر حالت میں اس کی مدد کا طلب گار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں خودکشی کے واقعات کم ہیں جبکہ ملحدین اور کافروں میں کثرت سے ہیں۔ ایمان، انسان کو قانونِ خداوندی کا پابند بھی بنا دیتا ہے اور وہ اس کی حفاظت بھی کرتا ہے ایمان، انسان کو دل بیدار عطا کرتا ہے جو اپنے تمام قول و فعل اور افعال میں اللہ ہی کی طرف متوجہ رہتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ پر زمین و آسمان کی کوئی چیز مخفی نہیں اور وہ اپنی آنکھوں کی بے راہروی اور دلوں کے بھید بھی جانتا ہے۔

رسالت پر ایمان، اللہ تعالیٰ اور انسانی معاشرے کے درمیان انبیاء کے ذریعے سے تعلق پر ایمان ہے اور یہ اسلامی نظریے کی خصوصیت اور طرہ امتیاز ہے۔ درحقیقت نبی و انسان ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص پیغام اپنے بندوں تک پہنچانے کے لیے منتخب کرتا ہے۔ دنیا میں ایسے مذاہب ہیں جو اللہ پر ایمان تو رکھتے ہیں، لیکن نبوت سے منکر ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ انہیں اس واسطے اور حاطین رسالت کے وجود کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کے خیال میں انبیاء و پیغمبر کچھ لائے وہ یا تو عقل کے مطابق ہے، اس لیے عقل کی موجودگی میں اس کی ضرورت نہیں یا عقل کے خلاف ہے، تو بھی اس کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہم عقل، ہی کے ذریعے سب باتوں کی حقیقت

پر استدلال کرتے ہیں۔

اس رائے کو ماننے والوں کو یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ یہ محال ہے کہ ہم کسی خالق مدبر کی موجودگی کو تسلیم کر لیں لیکن اس بات پر ایمان نہ لائیں کہ وہ خالق، کائنات کی تدبیر اور مخلوق کی مسلسل دیکھ بھال نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ، یہ ضروری نہیں کہ عقل انبیاء کے لئے ہوئے پیغام کی مخالف ہو۔ اس لیے عقل صحیح، جو منظم اور سائنسی فکر پر انحصار کرتی ہے۔ ان تمام نظریات اور قوانین کی تائید کرتی ہے جسے آسمانی رسالت نے نازل کیا۔ اس میں اتنا اضافہ کر لیا جائے کہ عقل اور وحی دونوں کا کئی مسائل میں الگ الگ دائرہ کار ہے۔ ہم بجز باقی منطق اور ریاضی کے ذریعے حیات و کائنات کے حقائق تک تو پہنچ سکتے ہیں لیکن وحی کے بغیر ماورائے مادہ حقائق تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، اس کے پسندیدہ طریقوں، حسابِ آخرت جرم و سزا، اس کی اطاعت اور اس کی اوامر و احکام کی پابندی اور ہر وہ چیز جس کا تعلق عالم غیب سے ہے، انبیاء کے واسطے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

خدا اور اس کے انبیاء کے درمیان واسطہ کمی ذریعوں سے تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ وحی کی ابتدائی شکل روپائے صادق ہے اور انبیاء کے قصوں میں روپائے صحیح کے کئی واقعات ہیں۔ مثلاً قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کے خواب کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح انہیں حضرت اسمعیلؑ کو ذبح کرنے کا حکم ملا:

”جب وہ (اسمعیلؑ) دوڑنے کے قابل ہوا تو اس (ابراہیمؑ) نے کہا: اے میرے

بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟

کہا: اے میرے باپ! آپ وہی کریں جس کا آپ کو حکم ملا ہے۔“ (الصافات: ۱۰۲)

اس کے علاوہ حالتِ بیداری میں الہام، رابطے کا دوسرا طریقہ ہے جیسا کہ رسول کریمؐ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ آپؐ مسلمانوں کی ایک جماعت میں تشریف فرما تھے کہ الہام ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”یہ رب العالمین کے رسول ہیں اور میرے دل میں یہ بات ظاہر دی کہ کوئی شخص

اس وقت تک نہیں مر سکتا جب تک وہ اپنا رزق پورا نہ کر لے۔“

رابطے کا ایک اور ذریعہ اللہ تعالیٰ اور نبی کے درمیان آمنے سامنے گفتگو، جیسا کہ قرآن کریم میں

حضرت موسیٰ کے بارے میں آیا ہے:

”جب وہ اس آگ کے پاس پہنچے تو انہیں آواز آئی اُس میدان کے داہنی جانب سے۔ اس مبارک مقام میں ایک درخت سے کہ اے موسیٰ! یہ تو میں ہوں اللہ

زب العالمین.....“ (القصص: ۳۰)

معروف طریقہ نزولِ وحی کا حضرت جبرائیلؑ کے ذریعے ہے:

”اے روح الامین نے آپ کے قلب پر اتارا تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے

ہوں، صاف عربی زبان میں۔“ (الشعراء: ۱۹۳-۱۹۵)

کبھی کبھی جبرائیلؑ جسداً بھی تشریف لائے جنہیں مسلمانوں نے دیکھا۔ جیسا ارکانِ ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کی نشانیوں کے بارے میں حدیث میں ہے جسے حضرت عمر بن الخطابؓ نے روایت کیا ہے۔

جب کوئی شخص اس بات کا مدعی ہو کہ اسے اللہ تعالیٰ سے رابطہ حاصل ہے اور وہ اس کی طرف سے پیغامبری کے منصب کا حامل ہے تو اس پر چند ذمہ داریاں اور فرائض عائد ہو جاتے ہیں کیونکہ قدرتی طور پر لوگ اس سے اس کی بات کے سچ ہونے کی دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس بات کو معقولیت سے خارج قرار نہیں دیا۔ اس لیے کہ حصولِ علم و آگہی کے لیے سوال کرنا جائز ہے۔

”اور جب ابراہیمؑ نے کہا: اے میرے پروردگار! مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو

کس طرح زندہ کرے گا؟ ارشاد ہوا: کیا تمہیں یقین نہیں؟ عرض کیا: ضرور ہے،

لیکن اس لیے کہ قلب کو (اور) اطمینان نصیب ہو جائے۔“ (البقرہ: ۲۶۰)

اسی سے نبوت کی ضرورت کھل کر سامنے آجاتی ہے اور اسی بنا پر معجزات کو اس کا اہم وسیلہ

نشان کیا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ہاتھوں اس لیے دکھانے کہ لوگ اس بات پر ایمان

لے آئیں کہ انبیاء اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نبیوں پر ایمان ایک طرف

تو ایمان باللہ سے اور دوسری طرف ایمان بالغیب سے مرلوط ہے اور یہ وہ ایمان ہے جو کسی

متقی مسلمان کا طرہ امتیاز سمجھا جاتا ہے:

”الہ۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں (جو متقیوں) کے لیے ہدایت

اے جو عیب پر ایمان لائے ہیں..... (البقرہ ۱۱۰-۱۰۳)

معجزہ دراصل ایسی نئی بات ہے جو ان عادات اور قوانین کے خلاف ہو جنہیں لوگ عام دیکھتے ہیں جو کائنات کا روزمرہ کا چلن ہے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے نبی کی تائید کے لیے دکھاتا ہے بعض لوگوں نے معجزات کو معمول کی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر معجزات سے ”حزقِ عادت“ کی صفت ہٹا دی جائے تو اس کا مفہوم اور نبی کی صداقت پر اس کا دلیل ہونا بھی مٹ جاتا ہے اگر مدعی نبوت اپنی سچائی پر دلیل لائے کہ سورج مغرب سے طلوع ہوتا ہے جبکہ عادتاً وہ مشرق سے نکلتا ہے تو یہ بات اس کی گواہ اور تائید ہوگی۔ اگر وہ اپنی قوم سے یہ کہے کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے تو اس میں کوئی تئی بات نہ ہوگی۔

معجزات، بالخصوص مادی معجزات پر بہت بحث ہو چکی ہے اور جو لوگ معروضیت کے حامی ہیں ان سے انکار کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے مادی اور روحانی دونوں طرح کے معجزات کا ذکر کیا ہے۔ جب اسلام معجزات انبیاء پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے تو وہ ایسے معجزات کا دین ہے جو سمجھ میں آسکتے ہیں بشرطیکہ عقل سے کام لیا جائے اور وہ ایسے معجزات کا دین نہیں جو عقل و غور و فکر سے روک دے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مسلمان معجزات کے امکان پر ایمان رکھتا ہے وہ کائنات کے قوانین کا منکر ہے کیونکہ معجزات ارض و سماوات، اور ان میں موجود عجائبات اور دنیاؤں کی تخلیق سے زیادہ حیران کن نہیں۔ اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سارا عالم پیدا کیا ہے تو پھر ہمارے لیے کسی ایسی غیر معمولی بات کو ماننا دشوار نہیں جو قوانین و معمولات کے خلاف ہو۔ غیر معمولی باتیں ممکن ہے جن میں کوئی ناممکن بات نہیں اور جو شخص انہیں ناممکن کہے اس پر ثبوت لازم ہے کیونکہ وہ انہیں عقلاً، بلا دلیل مجال کہتا ہے۔ معجزہ عقل کی ضد نہیں، لیکن عقل سے بالاتر ضرور ہے اور ان دونوں باتوں میں بہت بڑا فرق ہے جو خلاف عقل ہے وہ لغو ثابت ہوتا ہے، اور جو عقل سے ماورا ہے اس کی معقولیت کی ایک حد ہے اور جہاں عقل کی سمجھ میں نہیں آتا، وہ تخم جاتی ہے۔

جن مادی معجزات کا ذکر قرآن میں آیا ہے ان میں، مثلاً حضرت صالح کی اونٹنی ہے جس کے بارے فرماکن نے کہا:

”وہ لوگ بولے کہ تم پر تو کسی نے سخت جادو کر دیا ہے۔ تم تو بس ہمارے ہی جیسے

ایک آدمی ہو، سو کوئی نشانی پیش کر، اگر سچے ہو۔ (صالح نے) کہا یہ ایک اذیتنی ہے، پانی پینے کے لیے ایک باری اس کی ہے اور ایک مقرر دن میں ایک باری تمہاری۔ اور اس کو برائی کے ساتھ ہاتھ بھی نہ لگانا ورنہ تمہیں ایک بڑے سخت دن کا عذاب آپکڑے گا۔ (الشعراء: ۱۵۳-۱۵۶)

اسی طرح حضرت موسیٰؑ کے عصا کا، جو زندگی سے عاری تھا، تبدیل ہونے کا واقعہ ہے: ”(فرعون) بولا، اگر تم نے میرے سوا اور کوئی معبود اختیار کیا تو میں تمہیں قید میں ڈال دوں گا۔ (موسیٰ نے) کہا اور جو میں کوئی کھلی بات پیش کروں تو (فرعون) بولا، اچھا تو وہ لاؤ اگر تم سچے ہو۔ پھر (موسیٰ نے) اپنی لاکھی ڈال دی سو وہ ایک بیک ایک نمایاں اڑدھاب بن گئی اور اپنا ہاتھ (گر بیان سے) باہر نکالا تو وہ بیک بیک دیکھنے والوں کے سامنے چمکدار ہو گیا۔ (الشعراء: ۲۹-۲۳) اور پھر حضرت عیسیٰؑ کے معجزات ہیں جن کا قرآن میں ذکر آیا ہے:

”اور کہے گا) میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے لیے مٹی سے پرندوں کی مانند صورت بنا دیتا ہوں۔ پھر اس میں دم کر دیتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے اور میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتا ہوں اور میں اللہ کے حکم سے مردوں کو اٹھا کر دیتا ہوں اور تم جو کچھ کھاتے ہو اور جو کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ جمع کرتے ہو وہ نہیں پیدا دیتا ہوں۔ بے شک (ان سارے واقعات میں تمہارے لیے ایک نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔“ (آل عمران: ۶۹)

گزشتہ امتوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا دیکھے گا کہ ان میں سے بیشتر مادی معجزات پر ایمان نہیں لاتی تھیں اور انکار و الحاد پر مُصر رہیں۔ ہدایت تو اللہ ہی کے اختیار میں ہے، خواہ معجزہ کتنا ہی دہلادینے والا کیوں نہ ہو کیونکہ بعض دل تو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں: ”اور اگر ہم ان کے لیے کوئی دروازہ آسمان میں کھول دیں پھر یہ روزِ روشن میں اس میں چڑھ جائیں تب بھی بس یہی کہیں گے کہ ہماری نظر بندی کر دی گئی بلکہ ہم پر تو جادو دیا گیا ہے۔“ (الحجر: ۱۲-۱۵)

اسی طرح مادی معجزات کتنے ہی قوی کیوں نہ ہو بعض لوگ بھی کہیں گے کہ یہ جادو ہے یا نظر کا دھوکا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ سے مخاطب ہو کر اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

”اور ہم معجزات کے بھیجنے میں بس یہی امر مانع ہوا کہ پہلے لوگ ان کی تکذیب کر چکے ہیں اور ہم نے (قوم) تمود کو اونٹنی دی تھی، بصیرت کے طور پر، لیکن انہوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا، اور ہم معجزات تو ڈرانے ہی کے لیے بھیجا کرتے ہیں“

(بنی اسرائیل : ۵۹)

جہاں تک عقلی اور روحانی معجزات کا تعلق ہے تو ان میں سب سے اہم قرآن کریم ہے جو خاتم المرسلین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔ یہ انفرادی اور شخصی معجزہ ہے جس کا رسالت سے گہرا ربط و تعلق ہے اور رسالت کی ماہیت اور جوہر سے وابستہ ہے۔ یہ ایسا معجزہ ہے جسے عقل ہمیشہ قبول کرے گی کیونکہ اس کا مخاطب انسانی ذہن ہے اور یہ عقل کے لیے بات منوانے کی کوشش کرتا ہے اور محض حواس پر دشک نہیں دیتا جو مادی معجزات کی جڑ ہے۔ رسول کریمؐ کی بعثت تک انسانیت عقلی ترقی میں بہت آگے بڑھ چکی تھی جس سے عقل کے رد و رد بات کرنا ممکن ہو گیا۔ عقل کا اندازہ خطاب زیادہ جامع، پائیدار، با تمکین اور قرار پذیر ہوتا ہے اسی لیے قرآن کریم، رسول خدا اور اسلام کا رہتی دنیا تک کا معجزہ ہے۔ قرآن کی معجزانہائی کی حقیقت کے بارے میں مباحثین کے تین بڑے بڑے نقطہ ہائے نظر ہیں :

ایک نقطہ نظر وہ ہے جو یہ رائے رکھتا ہے کہ قرآن کا اعجاز، اس کے اُن الفاظ کی ساخت میں ہے جو عام انداز سے ہٹ کر ہیں، اور اس نکھری ہوئی بلاغت میں ہے جس کا مثل پیدا کرنے سے عرب عاجز ہو گئے۔

دوسرا نقطہ نظر وہ ہے جو قرآن کے اعجاز، غیب کی بانوں اور سابقہ ائم کے حالات اور تاریخ و عقائد سے منسوب کرتا ہے جو قرآن میں مذکور ہیں۔ قرآن نے مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی طرف اشارہ کیا اور پھر وہ اسی طرح پیش آئے جس طرح بیان کیے گئے۔ مثلاً :

”آلہ۔ وہ گئے ہیں روم (والے) پاس کے ملک میں، اور وہ اس دن کے

بعد چند برس میں غالب ہوں گے... (الروم: ۲۰۱)

اور پھر ہو ایہ کہ فارسیوں نے رومیوں پر غلبہ پایا۔ قرآن نے اس واقعے کی خبر دی اور یہ بتا دیا کہ رومی چند سال بعد اپنے دشمنوں سے اس شکست کا بدلہ لیں گے اور بالفعل ایسا ہی ہوا۔ (اور اس قبیل کے کئی واقعات قرآن میں ہیں) چونکہ کسی انسان کو علم غیب حاصل نہیں تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہے اور اس میں وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اس کے علاوہ، قرآن نے سابقہ امتوں کی تاریخ و مذاہب کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے چھوٹے بڑے تمام واقعات و حالات کا احاطہ کیا ہے۔ حالانکہ رسول کریم اُمّی تھے جنہیں پرانے واقعات کا علم نہ تھا اور نہ ماضی کے حالات آپ تک تفصیل و دقت نظر سے پہنچے تھے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے ہی ان باتوں کی خبر اپنے نبی کو دی۔

تیسرا نقطہ نظر یہ رائے رکھتا ہے کہ قرآن کا اعجاز، ان ترقی یافتہ نظام ہائے انسانی میں ہے جن کی مثال زمانہ حال یا ماضی میں انسانیت نے کبھی نہ دیکھی جو بنی نوع انسان کی عام خوشحالی کی ضمانت، اور اسے قابل رشک زندگی کی نوید دیتے ہیں۔ انسان کی رنگارنگ سرگرمیوں مثلاً سیاسی، اقتصادی، اجتماعی اور اخلاقی وغیرہ کے بارے میں قرآن میں مختلف نظاموں کا ذکر آیا ہے اور چونکہ ان نظاموں کی اختراع کسی بھی انسان کے تصور و اختیار سے باہر ہے اس لیے بھی قرآن اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے اور اپنے نبی کی رسالت کا ثبوت ہے۔ لیکن سچ ہے کہ قرآن کریم کا اعجاز ان سب باتوں پر مشتمل ہے، اس کے اچھوتے الفاظ اور بلاغت اور ندرت سے آراستہ ترکیب معجزہ ہیں، اس کی غیب کی باتیں اور سابقہ امتوں کے حالات بھی معجزہ ہیں اور اس کے بے مثال اور بلند پایہ نظام بھی معجزہ ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم اس کا اعجاز صرف ایک ہی رخ سے متعین کریں کیونکہ قرآن مختلف زمانوں اور مقالوں کے تمام انسانوں کے لیے رسول کا معجزہ ہے اور اس کا اعجاز ان تمام اور متعدد وجوہ پر حاوی ہے۔ جب کوئی عرب اس کی زبان کی سلاست کو معجزہ سمجھتا ہے تو رومی اس کے سابقہ امتوں کے احوال پیش کرنے کی وجہ سے ایمان لاتا ہے اور عجمی اس کے مختلف نظاموں پر یقین رکھتا ہے۔ گویا قرآن اپنے الفاظ و معانی اور پیش کردہ نظام، سب کے لحاظ سے معجزہ



## وجی

معجزات کی طرح وجی بھی ان غیر معمولی مظاہر میں سے ہے جو نبوت کا حصہ ہیں۔ وجی کے لغوی معنی "تیز رفتار، خفیہ اطلاع" ہیں اور اصطلاحاً اس کے معنی "اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کسی نبی کو احکام شریعت وغیرہ کی "اطلاع" ہیں اور جہاں کہیں یہ لفظ استعمال ہوگا اس کے یہی معنی مراد ہوں گے۔ اس کے علاوہ وجی اصطلاحی معنوں میں اللہ کے عام بندوں اور دوسری مخلوقات کو خبر دینے کے معنوں میں بھی ہے۔ مثلاً:

"اور آپ کے پروردگار نے شہد کی مکھی کو وجی بھی (القاء کیا) کہ تُوہاڑوں میں گھر بنائے۔"..... (النحل: ۶۸)

اسی طرح اُمّ موسیٰ کو وجی بھی:

"اور ہم نے موسیٰ کی والدہ کو وجی بھی (الهام کیا) کہ تم اسے دودھ پلاؤ۔ پھر جب ان کی طرف سے خدشہ ہو تو تم انہیں دریا میں ڈال دو اور نہ اندیشہ کرو اور نہ غم کرو۔ ہم ضرور ان کو تمہارے پاس واپس پہنچادیں گے۔"..... (القصاص: ۷)

اور حضرت عیسیٰؑ کے سوارپوں کے دل میں دا وجی بھی:

"اور جب میں نے سوارپوں کو وجی بھی (حکم دیا) کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تو وہ بولے کہ ہم ایمان لائے اور آپ شاہد رہے کہ ہم (پورے) مسلمان ہیں (المائدہ: ۱۱۱) مگر پر بھی اسی طرح وجی بھی گئی:

"جب آپ کا پروردگار فرشتوں کی طرف وجی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، سو ایمان والوں کو ثابت قدم رکھو۔"..... (الانفال: ۱۲)

اصلاحی معنوں میں وجی کا لفظ قرآن میں تمام انبیاء کے حوالے سے آیا ہے۔ مثلاً:

"یقیناً ہم نے آپ پر وجی بھی جیسی کہ ہم نے نوحؑ اور ان کے بعد کے نبیوں پر بھی تھی۔ اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسمٰعیلؑ اور اولاد یعقوبؑ اور عیسیٰؑ اور ایوبؑ اور یونسؑ اور ہارونؑ اور سلیمانؑ پر وجی بھی تھی۔ اور ہم داؤدؑ کو ایک صحیفہ دیا تھا اور (دوسرے) پیغمبروں پر ان کا حال ہم پیشتر آپ سے بیان کر چکے ہیں اور

(ہم نے وحی بھی تھی) ان پیغمبروں پر بھی کہ ان کا حال آپ سے بیان نہیں کیا، اور اللہ نے موسیٰؑ سے کلام فرمایا اور پیغمبروں کو (ہم نے بھیجا) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے تاکہ لوگوں کو پیغمبروں کے بعد اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے، اور اللہ تو ہے ہی بڑا زبردست، بڑی حکمت والا۔ (النساء: ۱۶۳-۱۶۵)

انبیاء کے لیے وحی الہی کا مفہوم ہے: اس کائنات کے خالق کا کسی ایک انسان سے رابطہ، جسے وہ اپنی مخلوق کے لیے رسول منتخب کرتا ہے۔ اور یہ رابطہ (جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے) روحانی الہام کے ذریعے ہوتا ہے یا اللہ تعالیٰ اس پر وہ بات کرتا ہے یا کسی فرستادہ فرشتے کے ذریعے، جیسا کہ فرمایا:

”اور یہ کسی بشر کا مرتبہ نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے، مگر ہاں یا تو وحی سے یا کسی حجاب کے پیچھے سے، یا کسی قاصد کو بھیج کر، سو وہ وحی پہنچا دے اللہ کے حکم سے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے.....“ (الشوریٰ: ۵۱)

وحی، ایمان بالغیب کے بنیادی اصولوں میں سے ہے، اور ایمان بالغیب ہی اسلام، بلکہ تمام ادیان کی اساس ہے۔ دیندار اور بے دین میں فرق اسی سے ہوتا ہے کہ کون ایمان پر غیب پر ایمان لاتا ہے اور کون نہیں، اور یہ اس بات کا بھی اظہار ہے کہ ماوریت سے ماوراء بھی کوئی طاقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”آلہم۔ یہ کتاب کہ کوئی شبہ نہیں اس میں، ہدایت ہے ڈر رکھنے والوں کے لیے، جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا اس میں سے خرچ کرنے ہیں، اور جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اُس پر جو آپ پر اتارا گیا اور جو آپ سے پہلے اتارا گیا اور جو آخرت پر بھی پورا یقین رکھتے ہیں“ (البقرہ: ۱۲۸)

استاذ محمد ابو زہرہ (مرحوم) نے کیا خوب کہا ہے کہ:

”جو غیب پر ایمان نہیں لاتا وہ متکبر ہے، اور جو غیب پر ایمان رکھتا ہے، دیندار ہے“

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو آپ کے جسم مبارک پر سخت کرب طاری ہو جاتا اور پھر سے اس کا اظہار ہوتا جو سرنج ہو جانا اور اس سے پسینہ پھوٹ نکلتا۔ روایت ہے کہ صحابہ بعض اوقات آپ کی تکلیف دیکھ کر آپ کے سر مبارک کو کپڑے سے دھانڈ

دیتے تھے اور اس وقت آپؐ میں عجیب قسم کی قوت پیدا ہو جاتی۔ اس حالت کے بارے میں بعض مستشرقین نے ایسی باتیں کی ہیں جو اسلام کے خلاف تعصب اور ان کے کہنے کا اظہار کرتی ہیں اہل کے رد میں جدید علماء نے کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں استاذ عبد اللہ دراز مرحوم کی کتاب "التبارک العظیم عن القرآن" سب سے عمدہ ہے۔

یوں تو وحی تو اولین فطرت کے خلاف، لیکن عقل کے لیے اس کا سمجھنا محال نہیں، اور بعض فطری مظاہر کے ذریعے اسے سمجھا جاسکتا ہے۔ اگرچہ وحی کی فطرت مختلف ہے، لیکن اس کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ عمل تنویم کے ذریعے معمول تک بعض باتیں اور کام کی ہدایات پہنچائی جاسکتی ہیں، لیکن عمل تنویم اور وحی میں فرق ہے: عمل تنویم میں کسی شخص کے ارادے اور مرضی کا دوسرے انسان پر تسلط ہوتا ہے لیکن وحی میں حقیقہ اطلاع ہوتی ہے، جس میں کوئی تسلط نہیں اور یہ وجدان سے مشابہ ہے۔ گویا ایسا عرفان ہے جس کا منبع انسانی نہیں، لیکن حقیقت میں وہ اس سے بھی مختلف ہے کیونکہ یہ کسی قابل غور مسئلے کا براہ راست حاصل ہونے والا علم ہے یا ایسا علم ہے جس میں عقل بالفعل غوطہ زن ہوتی ہو، لیکن اس میں اعضائے انسانی کا کوئی دخل نہ ہو جیسے ہر نبی کو وحی حاصل ہوتی ہے۔

جہاں تک وحی لانے والے فرشتے کا تعلق ہے تو صحابہ کرامؓ نے کئی بار خود اس کا مشاہدہ فرمایا اور حضرت عمرؓ کی مشہور حدیث کے مطابق جس میں ارکان اسلام اور ایمان اور احسان کا ذکر ہے۔ حضورؐ کی مجلس میں حاضر ہونے والے صحابہؓ نے خود حضرت جبریلؑ کو رسول کریمؐ سے گفتگو اور سوالات فرمانے دیکھا۔

اغلب یہ ہے کہ صرف رسولؐ خدا نے تمہا ہی حضرت جبریلؑ کو نہیں دیکھا، اور اس میں عقلی لحاظ سے کوئی ناممکن بات نہیں کیونکہ ہم اس کا منقابدہ "رنگو ندھے" لوگوں سے کر سکتے ہیں۔ بعض آپؐ تکھیں چند خاص رنگ نہیں دیکھ سکتیں، اسی طرح تخت الامر اور فوق البنفسھی شعاعیں بھی آنکھوں کو نظر نہیں آتیں اور سائنسی طور پر ابھی تک یہ ثابت نہیں ہوا کہ ہر آنکھ ان شعاعوں کو نہیں دیکھ سکتی۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کائنات کی تمام مخلوق کے حواس، اشیاء کے ادراک میں اختلاف رکھتے ہیں۔ اسے "قانون صلاحیت" کہا جاتا ہے۔ یعنی ہر حواس کے لیے ایک پست ترین درجہ

ہے جس سے نیچے مخلوقات اور موجودات کا کوئی درجہ نہیں۔ اسی طرح حواس کا ایک بالائی درجہ ہے جس کے بعد کسی مخلوق یا موجود کے پاس مزید کوئی درجہ نہیں۔ گویا تمام مخلوقات انہی دو درجوں کے درمیان ہی احساس رکھتی ہیں اور یہ دو درجے انسان میں جملہ تمام مخلوقات سے مختلف ہیں۔ مثلاً کتے کے کان ایسی آوازیں سن لیتے ہیں جنہیں انسانی کان نہیں سن سکتے اور گھوڑے کی آنکھ ایسی چیریں دیکھ لیتی ہے جو انسان کی حس باصرہ سے باہر ہیں۔

ہم نے یہ سب کچھ ذہن انسانی کو وحی سے متعارف کرانے کے لیے بیان کیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ عقلی لحاظ سے یہ کوئی ناممکن بات نہیں، ورنہ یہ ان غیر معمولی واقعات میں سے ہے جن پر ایمان، اللہ تعالیٰ پر ایمان کا جزو ہے جو تمام کائنات اور عجائبات کا خالق ہے اور جسے اپنے ہی تخلیق کردہ قوانین و قواعد کے خلاف دوسرے قوانین و قواعد بنانے میں کوئی بات مانع نہیں۔

## تعدّد انبیاء

اب جبکہ ہم نبوت اور ایمان پر گفتگو کر رہے ہیں، تو ایک اور اہم مسئلے، یعنی تعدّد انبیاء کا ذکر بھی ضروری ہے۔ کیا مسلمان کے لیے سب پر ایمان لانا ضروری ہے؟ اور پھر اس تعدّد کا سبب کیا ہے؟

اسلام جہ تمام سماوی نبوتوں پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے تو یہ حقیقت میں اس بات کا اعلان ہے کہ انبیاء کے پیغام کا سرچشمہ ایک ہے ان کا پیغام ہے اور انسانیت ایک ہے:

”کہنہ دو کہ ہم تو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہم پر اتارا گیا، اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد (یعقوب) پر اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور اس پر جو دوسرے انبیاء کوران کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا اور ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ ہی کے حکم دار ہیں“

(البقرہ: ۱۳۶)

اور پھر فرمایا:

”پیغمبر ایمان لائے اس پر جو ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے

اور مومنین (بھی) یہ سب ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر۔ ہم اس کے پیغمبروں کے درمیان باہم کوئی فرق بھی نہیں رکھتے اور کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا ہے اور ہم نے اطاعت کی۔ ہم تیری مغفرت (طلب کرتے ہیں) اے ہمارے پروردگار اور تیری ہی طرف واپسی ہے۔“ (البقرہ: ۲۸۵)

تعددِ انبیاء کے تین سبب ہو سکتے ہیں: ماحول اور حالات کا اختلاف، انسانی عقل و تجربے کا تنوع اور قوانین و شریعت میں تدریجی ارتقاء۔

انسانی ماحول ایک سا نہیں رہا، اسی طرح انسان کے حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ انسانی عقل و ذہن، انسانی تجربے میں ترقی اور انسانی علم کی فراوانی کی بنا پر مسلسل ارتقاء پذیر رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان تغیرات کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ قوانین میں تدریجی ارتقاء اس لیے بھی ضروری تھا تا کہ اس کے نتائج ظاہر ہوں اور ان کا صحیح قرینے سے نفاذ کیا جائے۔ یہ اس لیے ہوا کہ جو بات بعض لوگوں کے لیے مخصوص زمان و مکان میں مخصوص تھی وہی بات دوسروں کے لیے مختلف حالات و زمانے میں غیر مناسب ہو گئی۔ انسانی سرگرمیوں کے ہر پہلو پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ تعددِ رسالتِ الہیہ سے یہ مراد نہیں کہ ان کے درمیان تناقض ہے یہ تو خدائے دانا و بینا کا انسانی حالات کو ملحوظ رکھنے کا نتیجہ ہے کہ انہیں ہمیشہ وہی دیا جو ان کی عقلوں اور سمجھ کے مطابق تھا۔ گویا سماوی نبوتیں عقلوں اور رجحانوں کے لیے ویسا ہی طریقہ علاج ہیں جس طرح جسم و بدن کے لیے طب ہے اور جس طرح طبیب دوا دیتے ہوئے مریض کی عمر اور حالت کو ملحوظ رکھتا ہے اور اسے ساری دوا ایک ہی گھونٹ میں پی جانے سے منع کرتا ہے کہ کہیں زہر ہی نہ بن جائے۔ بعینہ اسی طرح خدائی نبوتوں اور رسالتوں کا حال ہے جو وجدانی تبدیلیوں اور عقل و فہم کے معیار کی مقررہ حدود کو ملحوظ رکھتی ہیں۔

## رسالتِ محمدی کی خصوصیات

رسالت پر ایمان کے مفہوم کی عام تشریح کے بعد، اب مناسب ہے کہ ہم بات کو محمدؐ کی نبوت

کی خصوصیات بیان کر کے ختم کریں۔ ان خصوصیات کا چار پہلوؤں سے جائزہ لیا جاسکتا ہے:

۱۔ ہمہ گیری اور تغیر پذیری۔  
۲۔ باقی ماندہ جملہ رسالتوں کے مقابلے میں قابل اعتماد ہونا۔  
۳۔ جامعیت اور کمال۔

۴۔ تمام رسالتوں کا تتمہ اور تکملہ۔

جہاں تک نبی کریم کی رسالت کی ہمہ گیری اور تغیر پذیری کا تعلق ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ یہ سب انسانوں کے لیے بھی گئی اور صرف ایک نسل یا ایک گروہ یا ایک زمانے سے مخصوص نہ تھی:

”کہہ دیجئے کہ اے انسانو! بے شک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف...“

(الاعراف: ۱۵۸)

اس سے پہلے کی رسالتیں مخصوص امتوں کے لیے تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے طے کر دیا کہ آپ کی رسالت، قیامت کے دن تک، تمام بتی نوع البشر کے لیے ہو جس طرح خود ہی یہ ذمہ لیا کہ قرآن کریم بھی ابد الابد تک محفوظ رہے جو اس نبوت کی دستاویز ہے:

”اس ذکر کو تو ہمیں نے نازل کیا اور ہمیں اس کے محافظ ہیں“ (الحجر: ۹)

اس کے بعد رسالتِ محمدیؐ ان تمام رسالتوں کے مقابلے میں، جن میں تخریف و تغیر ہو چکا ہے، زیادہ محفوظ رہی ہے اور حضورؐ کی سیرت تمام انسانوں اور انبیاء کی سیرت سے زیادہ صحیح حالت میں موجود ہے۔ مسلمانوں کے قرآن کریم کو اس طرح بالذات نقل یا روایت کیا ہے کہ ہم کسی تردد کے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ صدیاں گزرنے پر بھی اس کا ایک لفظ تک متغیر نہیں ہوا۔ اسی طرح حضورؐ کی سیرت، آپ کے اقوال، عمل سب ہمارے پاس کتب حدیث و سیرت میں محفوظ ہیں۔ اسلام کی اشاعت کے سانچہ کچھ مخصوص علوم بھی وجود میں آئے جن میں اہم ترین صحیح سیرت اور صحیح حدیث کو پیش کرنے سے متعلق ہیں۔ اسی لیے ہمیں حضورؐ کی زندگی کی ایک ایک بات، چھوٹی ہو یا بڑی، معمولی ہو یا اہم، صحیح اور مکمل طور پر معلوم ہے۔ کتب حدیث و سیرت میں حضورؐ کی زندگی کے تمام واقعات، آپ کا کھانا پینا، سیاسی زندگی، جہاد میں شجاعت، اخلاق اپنے اصحاب، ازدواجِ مطہرات اور عام مسلمانوں سے سلوک۔ واضح طور پر درج ہیں یہ سب

کچھ اس حالت میں موجود ہے کہ ہم فخر سے یہ سچا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ جیانت رسولؐ تمام تاریخ انسانی میں سب سے زیادہ صحیح حالات زندگی پیش کرتی ہے۔

رسالتِ محمدیؐ کی جامعیت کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ زندگی کے تمام تقاضوں اور ضرورتوں کا احاطہ کرتی ہے جن معاملات میں لوگ نبیؐ کی زندگی کو نمونہ بتانا چاہتے ہیں، ان سب میں سیرتِ نبیؐ ان کو رہنمائی عطا کرتی ہے۔ اسلام نے زندگی کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا جس کا علاج اور حل پیش نہ کیا ہو۔ چنانچہ، سیرتِ رسولؐ پوری انسانی زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ وہ صفاتِ کمال، جو باقی تمام انبیاء پر تقسیم کی گئیں، نبی کریمؐ کی ذاتِ گرامی میں جمع کر دی گئیں۔ مثلاً حضرت نوحؑ تبلیغ میں بڑے حوصلے، جفاکش اور تحمل کے مالک تھے۔ حضرت ابراہیمؑ جو دو کرم کے مالک اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے تھے۔ حضرت داؤدؑ نعمتوں کا شکر ادا کرنے والوں میں سے تھے اور حضرت ذکریاؑ، یحییٰؑ اور عیسیٰؑ ترک دینا کرنے والوں اور شہوات پر علیہ پانے والوں میں سے تھے اور حضرت یونسؑ ان لوگوں میں سے تھے جو فراخی میں شکر اور تنگ دستی میں صبر کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ صاحب شجاعت و جرات تھے اور ہارونؑ نرم دل اور حلیم الطبع تھے، لیکن سیرتِ محمدؐ ان تمام صفاتِ کمال کا مجموعہ ہے۔ صاحب ہمت و شجاعت لوگ اس میں ایسا انسان پائیں گے جو حاکم بن کر ثابت قدم رہتا ہے۔ سخاوت و کرم کے مالک اس میں ایسا کرم دیکھیں گے جو بلا حساب عطا کرتا ہے، اور یہی حال باقی تمام صفات کا ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ رسالتِ محمدیؐ جملہ تمام رسالتوں کی خاتم ہے۔ قرآنِ کریم نے اسی معنی میں فرمایا ہے:

”محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔ البتہ رسول اللہ اور خاتم النبیین

ہیں۔“ (الاحزاب : ۴۰)

یعنی حضورؐ اس لیے مبعوث ہوئے کہ انبیاء کے مشن کی تکمیل اور زمین تک پہنچنے والی آسمانی نبوتوں کا اختتام فرمایا۔ حدیث میں آیا ہے:

”میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے کوئی عمارت بنائی اور اسے خوب سنوارا، نکھارا، مگر ایک گوشے میں ایک اینٹ کی جگہ رہ گئی۔ لوگ اس کے گرد چکر لگاتے، تعجب کرتے اور کہتے: بھلا یہ اینٹ کیوں نہ

لگائی، تو میں ہی وہ اینٹ ہوں اور خاتم النبیین۔“

انبیاء کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ یا کسی امت میں اس سے پہلے کوئی رسول آیا ہی نہ ہو، یا پھر گذشتہ رسالت میں تحریف ہو چکی ہو، یا پھر اس لیے کہ سابقہ رسالتوں کی دعوت جامع اور پیغام مکمل نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت و علم کے مطابق یہ مقدر فرمایا کہ حضور کے زمانے میں انسانیت بلوغ پہنچ گئی ہے اور اس کے نتیجے میں یہ ممکن ہو گیا کہ رسالت الہی کا خاتمہ فرما دیا جائے اور اسے آخری رسالت سے سرفراز کیا جائے۔ بہر حال، علوم میں پیش رفت اور ایجادات میں تسلسل کے یہ معنی نہیں کہ اس وقت سے اب تک انسانیت عقلی طور پر بلوغ و ہدایت تک نہیں پہنچی کیونکہ یہ ترقی تو محض علم اور تجربے کی نشوونما اور اس کی پختگی اور اس میں کام آنے والے آلات کے ارتقاء کا فطری نتیجہ ہے، ورنہ عقلی و فکری اساس تو ایک ہی ہے جو تبدیل نہیں ہوتی۔

ایمان کے موضوع کو ختم کرنے سے پہلے، یہ اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ایمان باللہ اور تمام انبیاء پر نازل شدہ کتابوں پر ایمان لانے کا تقاضا یہ ہے کہ ان تمام باتوں پر ایمان لایا جائے: جبرائیل و اسرافیل کے بعد الموت اور یوم حساب کو اللہ کے سامنے حضور ہی، جہاں ہر انسان کو اس کے اعمال اور زیادتیوں کی تفصیل پیش کی جائے گی۔ چنانچہ ہر انسان کا محاسبہ ہو گا۔ بُرے کو اس کی برائی کا اور نیکیوں کا اس کی نیکی کا بدلہ ملے گا۔ پیغام نبوی، فرائض و احکام کا مجموعہ ہے اور چونکہ انسان مکلف ہے اس لیے اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہے۔ قرآن کریم کی متعدد آیات میں اس یوم عظیم کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ نیکیوں کا روں کو نعمتیں اور بدکاروں کو عذاب شدید ملے گا۔ اس اہم بات کا تقاضا ہے کہ ہم عبادت، عمل اور جواب دہی کے موضوع سے الگ باب میں بحث کریں۔

## حق و صداقت

”حق“ ان مثالوں میں سے ہے جن پر اسلام، مسلمانوں کے تزکیہ نفس اور رفعت شان کے لیے زور دیتا ہے۔ اپنی منثالی شکل میں ”حق“ صحیح عقیدے، علم نافع، عمل صالح اور اخلاق کریم میں نظر آتا ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ ”حق“ کا اطلاق، قرآن کریم میں اسلام پر ہوتا ہے:

”وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام

دینوں پر غالب کر دے۔“ (الفتح، ۲۸)



”اور آپ کہہ دیجئے کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل تو مٹنے ہی والا تھا“ (نبی اسرائیل: ۸۱)

”اور ہم نے اس (کلام) کو حق کے ساتھ نازل کیا اور حق کے ساتھ نازل ہو گیا اور ہم نے آپ کو صرف بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے“ (نبی اسرائیل: ۱۰۵)

اس معنی کے لحاظ سے اسلام تمام انبیاء کی رسالتوں کی تکمیل کرتا ہے۔ کیونکہ بلا استثناء تمام انبیاء کی دعوت، دعوت حق تھی۔

”لوگ ایک ہی امت تھے۔ پھر اللہ نے انبیاء بھیجے جو شجرہ دینے والے اور ڈرانے والے اور ان کے ساتھ کتب حق نازل کیں کہ وہ لوگوں کے درمیان اس بارے میں فیصلہ کرے جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے اور کسی نے اس میں اختلاف نہیں کیا، مگر انہی نے جنہیں وہ (کتاب) ملی تھی انہی کی ضد کے باعث، بعد اس کے کہ انہیں کھلی ہوئی نشانیاں پہنچ چکی تھیں۔ پھر اللہ نے اپنے فضل سے انہیں جو ایمان والے تھے وہ امر حق بنا دیا جس کے بارے میں وہ اختلاف کر رہے تھے، اور اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست بتا دیتا ہے۔“ (البقرہ: ۲۱۳)

حق و باطل دو متضاد جہتیں ہیں۔ کوئی عمل اور عقیدہ ان میں سے کسی ایک طرف مائل ہونے سے خالی نہیں ہوگا کیونکہ حق و باطل اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اگر اسلام ہی دینِ حق ہے تو دوسرے عقائد کی طرف دعوت دینے والے باطل ہیں۔ حق و باطل میں آویزش بھی لازمی بات ہے اور یہ آویزش انسانیت ہی جتنی قدیم ہے بلکہ اس وقت سے موجود ہے جب سے دنیا میں حق و باطل کی تمیز پیدا ہوئی بعض اوقات باطل کیسا ہی غالب کیوں نہ آجائے آخر میں فتح حق ہی کی ہوتی ہے اور وہی قائم رہتا ہے اور نفع بخش ثابت ہوتا ہے، کیونکہ جھاگ تو مٹ جاتا ہے اور جو چیز نفع بخش ہے وہی دنیا میں باقی رہتی ہے۔ اسلام مسلمانوں کو دعوت ہے کہ وہ حق کو نفاذ میں اور ہر کام میں اسی کو اختیار کریں اور اپنی بساط بھرا اعلانے کلمۃ الحق کے لیے جدوجہد کریں یہاں تک کہ کلمۃ حق بلند ہو جائے اور حق کی پاسداری تمام انسانیت کا شیوہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ حق بذاتِ خود قائم نہیں ہوتا بلکہ یہ کام عالی صفت اور بلند ہمت لوگ سرانجام دیتے ہیں۔

حق کی دعوت دینے والوں کی صفات : داعین الی الحق کے لیے سب سے اہم یہ ہے کہ وہ حق پر جمے رہیں۔ اور اسی کو تھامے رہیں، کیونکہ کسی شخص کی شرافت و کرامت کا معیار اتنا ہی ہے جتنی اس کی حق کی معرفت اور اس پر ثابت قدمی اور یہی بات اس کی قدر و منزلت میں اضافے کا باعث ہے۔

”بہر حال آپ اس سے تمسک کیے جائیے جو آپ پر وحی کیا گیا ہے۔ بے شک آپ سیدھے راستے پر ہیں اور یہ (قرآن) آپ کے اور آپ کی قوم کے لیے بڑے شرف کی چیز ہے۔۔۔۔۔“ (الزخرف : ۲۳-۲۴)

یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے لوگ جبری ہوں کہ وہ بے خوف و خطر، اور ہزدلی کے بغیر، اعلانِ حق اور اس کا کھلم کھلا اظہار کر سکیں، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشاعتِ حق اور لوگوں میں اس کی تبلیغ کے لیے نامزد ہیں :

”اور ضرور ہے کہ تم میں سے ایسی جماعت رہے جو نیکی کی طرف بلا یا کر سے اور بھلائی کا حکم دیا کر سے اور بدی سے روکا کرے۔۔۔۔۔“ (آل عمران : ۱۰۴)

بے شک، حق کا اعلیٰ الاعلان اظہار بہت فضیلت ہے کیونکہ باطل، حق کی عقلمندی سے فائدہ اٹھا کر ہی قدم جمانا ہے۔ جب تک داعین الی الحق اس کا کھلم کھلا اعلان اور اس کی اشاعت کرنے نہیں گئے اس وقت تک باطل ڈبکا ہوا اور مقہور رہے گا۔ کسی جماعت یا امت کی نہضت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس میں حق کی طرف بلانے والے نہ ہوں۔ اگر یہ گروہ مفقود ہو جائے تو یہ گویا اس امت کی قوت کے زوال کا اعلان اور اس کے ارکان کی کمزوری کی ابتدا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا :

”جب میری امت ظالم کو ظالم کہنے سے ڈر جائے تو اس سے الگ ہو جاؤ۔“

داعین الی الحق کے لیے لازم ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی سے ڈریں نہ خوفزدہ ہوں، کیونکہ حق کے لیے آواز اٹھانے سے رزق کم ہوتا ہے۔ نہ موت وقت سے پہلے آتی ہے اس لیے کہ زندگی اور رزق صرف اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے :

”(یہ وہ لوگ ہیں) جو اللہ کے پیغامات پہنچایا کرتے تھے اور اسی سے ڈرتے تھے

اور بجز اللہ کے کسی سے نہیں ڈرتے تھے، اور اللہ حساب کے لیے کافی ہے۔“ (الاحزاب : ۳۹)

جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو فرعون تک دعوتِ حق پہنچانے کا حکم دیا اور ان پر بشری کمزوری غالب آگئی جو ظالموں اور جابروں کے سامنے ہر انسان پر غالب آسکتی ہے تو آپ کے کہا:

”..... ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے یا کہ زیادہ سرکشی نہ کرنے لگے۔“ (ظہر : ۴۵)

تو رب العزت نے جواب دیا:

”..... تم ڈر نہیں تم دونوں کے ساتھ میں ہوں، (سب) سستا اور دیکھتا ہوں“

(ظہر : ۴۶)

اور جس کے ساتھ خدا ہو وہ کمزور ہونہیں رہتا۔ کیونکہ اُسے اللہ تعالیٰ اپنے پاس سے قوت عطا کرتا ہے اور ایسی جرأت بخشتا ہے جس کے سامنے تمام سرکش و جبار حقیر نظر آتے ہیں۔

ابراہیمؑ نے جب کسی ڈر اور گھبراہٹ کے بغیر اعلانِ حق فرمایا تو ان کا یہی موقف تھا، حالانکہ اس وقت ان کا کوئی حامی یا مددگار نہ تھا۔ حتیٰ کہ ان کے والد بھی بت پرستوں کے ساتھ تھے۔ اس کے باوجود شیخ الانبیاء نے کسی ہچکچاہٹ اور تردد کا اظہار نہ کیا اور لوگوں میں اعلان کیا کہ:

”یقیناً میں نے تو اپنا رخ یک سو ہو کر اسی کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔“ (الانعام : ۷۹)

جب آپ کی قوم نے آپ سے جھگڑا کیا تو فرمایا:

”کیا یہ جھگڑا مجھ سے اللہ کے معاملے میں کرتے ہو درد آنچلیکہ وہ مجھے ہدایت کر چکا ہے میں ان سے نہیں ڈرتا جنہیں تم اللہ کے شریک ٹھہراتے ہو، ہاں البتہ اگر میرا پروردگار ہی کوئی چیز چاہے۔ میرا پروردگار ہر چیز کو علم سے گھیرے ہوئے ہے، تو کیا تم خیال نہیں کرتے؟ اور میں اس سے کہوں ڈروں جس کو تم نے شریک ٹھہرا رکھا ہے۔ درد آنچلیکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ کا شریک ٹھہرا رکھا ہے جن کے بارے میں اس نے تم پر کوئی بھی دلیل نہیں اناری سو دونوں گروہوں میں سے امن کا زیادہ حق دار کون ہے، اگر تم جانتے ہو؟ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک سے مخلوط نہیں کیا، پسوں ہی کے لیے تو امن ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔“ (الانعام : ۸۰-۸۳)

اصحاب رسولؐ کے مقابل، مشرکین کا طرز عمل بھی یہی تھا کہ وہ انہیں دعوت الی الحق سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور انہیں خود فرزدہ کرتے تھے لیکن ہوا یہ کہ وہ حق پر اور زیادہ ثابت قدم ہو گئے اور ان کا ایمان زیادہ قوی ہو گیا،

”یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان سے کہنے والوں نے کہا کہ لوگوں نے تمہارے خلاف بڑا سامان اکٹھا کیا ہے، ان سے ڈرو، لیکن اس نے ان کا (جوش) ایمان اور بڑھا دیا اور انہوں نے کہا کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ سو یہ لوگ اللہ کے انعام و فضل کے ساتھ سے واپس آئے کہ انہیں کوئی ناگواری پیش نہ آئی اور یہ لوگ رضائے الٰہی کے تابع رہے اور اللہ بڑا فضل والا ہے۔ یہ تو شیطان ہی ہے جو تمہیں اپنے دوستوں کے ذریعے سے ڈراتا ہے سو تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھی سے ڈرو اگر ایمان والے ہو“ (آل عمران: ۱۷۳-۱۷۵)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف حالات اور تنگی و ترشی میں داعی الی الحق کی ثابت قدمی کے نتیجے ہی میں حق کی جڑیں زمین میں گہری اترتی ہیں اور دنیا میں اسے ثبوت و بقا حاصل ہوتی ہے کیونکہ یہ نتائج داعی الی الحق سے صبر، قوت برداشت اور تکالیف پر استقلال کا مطالبہ کرتے ہیں، اسی طرح وہ جان، مال، جد و جہد اور وقت کی قربانی بھی چاہتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس طرف کئی آیات میں اشارہ کیا ہے :

”کیا لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ محض یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے چھوٹ جائیں گے اور وہ آزمائے نہ جائیں گے اور ہم تو انہیں بھی آزما چکے ہیں جو ان سے قبل گزرے ہیں۔ سو ان لوگوں کو جان کر رہے گا جو پسے تھے اور جھوٹوں کو جان کر رہے گا“ (العنکبوت: ۲-۳)

”کیا تم یہ گمان رکھتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے در آنحالیکہ (ابھی) تم پر تم ان لوگوں کے حالات پیش نہیں آئے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ انہیں تنگی اور سختی پیش آئی اور انہیں ہلا ڈالا گیا یہاں تک کہ ہمیر اور جو لوگ ان کے ہمراہ ایمان لائے تھے بول اٹھے کہ اللہ کی امداد (آخر) کب آئے گی؟ سن رکھو، اللہ کی امداد یقیناً قریب ہی ہے“ (البقرہ: ۲۱۴)

”پہلے بھی ملتیں دی جا چکی ہیں، حتیٰ کہ پیمبر یا لوکس ہو ہو گئے اور گمان کرنے لگے کہ ان سے غلطی ہوئی (کہ اتنے میں) انہیں ہماری مدد آپہنچی، سو ہم نے جس کے لیے چاہا وہ بچا لیا گیا، اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے ہٹتا نہیں“ (یوسف : ۱۱۰)

اسی حق، اس پر ثابیت قدمی، اس کی طرف اور اس کے نتائج کی برداشت سے مسلمان بدر و خندق حد پیہہ اور فتح مکہ میں سر بلند اور کامیاب ہوئے اور ان تمام معرکوں میں جو انہیں فارسیوں، رومیوں، صلیبیوں، تاتار اور آبادکاروں کے خلاف پیش آئے فتح مند ہوئے۔ یہ کامیابیاں صرف شجاعت ایمان باللہ، خدا پر بھروسے، تمسک بالحق اور اس پر ثابیت قدمی کی بدولت حاصل ہوئیں۔ چونکہ حق پائیدار ہے، اس لیے اسلام زمانے میں سب سے زیادہ مضبوط، سب سے زیادہ زندہ و جاوید اور اس سے زیادہ بقا کا حامل ہے۔

آخر میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ مسلمان بحیثیت فرد و قوم اپنے موقف میں صرف حق اور اس کی حمایت کے جذبے کی بدولت آگے بڑھے چاہے اس کے نتیجے میں انہیں نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑا، کیوں کہ صرف حق ہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔ افراد و اقوام جب بھی اپنی مصلحتوں اور خواہشوں کے جذبوں کے تحت مصروف عمل ہوتے ہیں تو صرف اسلام ہی اس بات کا سزاوار ہے کہ وہ ایسا بلند سطح نظر اور اصول پیش کرے جس کے مطابق تمام افعال و اعمال صادر ہوں اور وہی حق قرار پائیں۔

## حریت

اسلامی اقدار میں سے ایک اہم قدر حریت ہے۔ یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر انسان کو بنایا گیا اور انسان کا فطری حق ہے اور فقط انسان ہونے کی وجہ سے اس سے لطف اندوز ہونا اس کے لیے لازمی ہے کیونکہ یہ انسانی زندگی کا اہم تقاضا ہے اس سے انسان اور باقی تمام حیوانات میں فرق کیا جاسکتا ہے۔ حیوانات اپنی جبلت وغیرہ کے تابع ہیں اور حریت کے بغیر بھی رہ سکتے ہیں لیکن انسان قصد و ارادے کا مالک ہے اور اس کا ارادہ ایسی کامل اور ہوش مند حریت کی تقاضا کے بغیر سہرا انجام نہیں پاسکتا جو معاشرے کے بنیادی اصولوں سے متعارض نہ ہو اور دوسروں کی آزادی میں دخل انداز نہ ہو۔

اسلام انسانی آزادی کی ضمانت دینے آیا ہے، اور اس کا نصب العین یہ تھا کہ وہ لوگوں کی آادوں کو بحال کرے اور انہیں کھیل تماشائے بننے دے اور انہیں جبر و اکراہ سے باز رکھے خواہ وہ حریت دینی ہو یا سیاسی یا فکری۔ کیونکہ حریت ان تمام عقائد کی بنیاد ہے جنہیں اسلام نے پیش کیا اور انسانی تشخص کے اعلیٰ ترین اصولوں میں سے ہے اور ہر صحت مند انسانی معاشرے کی اساس ہے۔

## دینی آزادی

دینی آزادی درج ذیل امور پر مشتمل ہے:

- ۱۔ کسی کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور نہ کرتا، یا کسی خاص عقیدے کو ماننے پر اصرار کرتا۔
- ۲۔ تمام مذاہب، بالخصوص اہل کتاب کو اپنے شعائر یا عبادات، اسلامی معاشرے میں، ادا کرنے کی پوری آزادی۔ اس لیے ان کا کوئی کلیسا نہیں گرایا جائے گا۔ نہ صلیب توڑی جائے گی۔
- ۳۔ کھانے پینے میں ان کے مذاہب نے جو اجازت دی ہے، اس کی آزادی۔
- ۴۔ شخصی معاملات، مثلاً شادی بیاہ، طلاق، وراثت وغیرہ میں انہیں اپنے عقائد پر عمل کرنے کی آزادی۔

۵۔ ان کے حقوق کی حفاظت اور ناموس کی حمایت اور عقل و منطق اور اخلاق کی حدود کے اندر رہنے ہوئے انہیں آپس میں بحث و مباحث اور تکرار کی آزادی۔

اسلام نے جس دینی آزادی کا اعلان کیا ہے اور جس کی ضمانت لوگوں کو دی ہے، اس کی مثال گزشتہ یا موجودہ دور میں کہیں بھی نہیں ملتی۔ تاریخ اسلام میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ کسی شخص کو اپنا دین ترک کرے اور اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہو، نہ کسی شخص کو اپنے معبود میں اپنے دین کے مقررہ طریقے پر عبادت کرنے سے روکا گیا۔ مسلمانوں کے لشکر ظہور اسلام کے چند برس بعد ہی، شہروں اور آبادیوں میں داخل ہو گئے اور ان لشکریوں کے ارکان میں تھا کہ وہ لوگوں کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کرتے، لیکن مسلمانوں نے ایسا سوچا بھی گوارا نہ کیا کیونکہ ان کا دین، لوگوں کو اپنے مذہب اور عبادت کو برقرار رکھنے کا حکم دیتا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسی اسوۂ حسنہ کی بنا پر، دوسرے مذاہب اہل ذمہ کو کبھی ایذا نہ دی گئی۔ اور اسی سنت پر عمل کرتے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما کے سرداروں کے نام خطوط میں تاکید کی کہ کسی معاہدہ کو اپنا مذہب ترک کرنے

اور اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جائے، اور راہوں کو ان کی خانقاہوں میں تنگ نہ کیا جائے اور اسی ہدایت کی رہنمائی میں حضرت عمر بن الخطابؓ جب عیسائیوں کے گرجا "کھلسائے قیامہ" کے سامنے کھڑے تو نماز اس کے باہر ادا کی اور اندر جا کر نماز ادا کرنے سے انکار کر دیا اور اسی ہدایت کے زیر اثر یہودیوں نے نصاریٰ عرصہ دراز تک اسلامی حکومت کے زیر نگیں آباور ہے کہ یہاں انہیں وہ آسائش اور سکون میسر تھا جو عیسائی حکومتوں کے ہاں مفقود تھا اور وہ حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں تک پہنچے اور ان میں کاتب، حکیم، طبیب، انجینئر اور دانشور تھے۔ اس معاملے میں ان کے دین کا اختلاف، ان تمام امور میں رکاوٹ ثابت نہ ہوا۔

مسلمانوں کی تاریخ میں ویسا طرز عمل نہیں ملتا جیسا کہ ہسپانویوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا جب ہسپانویوں نے اندلس پر قبضہ کر لیا تو مسلمانوں کو اختیار دیا کہ وہ اندلس چھوڑ دیں یا عیسائی ہو جائیں یا پھر قتل کے لیے تیار رہیں۔ اس طرح لاکھوں مسلمان قتل کر دیئے گئے اور اس لوری مملکت میں، جہاں مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی، اللہ کا نام تک لینا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس کے برعکس تاریخ اسلام، رواداری، انسانی ہمدردی اور محبت و حسن سلوک کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ اگر ہم ان باتوں کو پیش کریں جو مذہبی آزادی کے بارے میں اسلام کے موقف کی حمایت کرتی ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ اسلام دین کے معاملے میں کسی جبر کا قائل نہیں، اور لوگوں کو اپنے رب کو اپنے عقیدے کے مطابق ماننے کی آزادی دیتا ہے۔ اس دین کا کیا فائدہ جس میں زبردستی شامل ہو؟ قرآن کریم میں ایسی بے شمار آیات ہیں جو اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور ان کی تاکید کرتی ہیں۔ مثلاً:

"دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت تو مگر اہی سے صاف صاف کھل چکی ہے..." (البقرہ: ۲۵۶)

گویا یہ اعلان تھا کہ حق، واضح ہے، اور ہر انسان ان دو میں سے ایک راستہ اختیار کرنے میں آزاد ہے اور اللہ کے سامنے اس کی جواب دہی، اسی آزادی اختیار کے مطابق طے پاتی ہے۔ اس کی تاکید و تائید میں یہ آیت ہے کہ:

"اور اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو روئے زمین پر جتنے بھی لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔ تو کیا آپ لوگوں پر جبر کر سکتے ہیں کہ وہ سب مسلمان ہو جائیں؟" (یونس: ۹۹)

اس کے بعد فرمایا:

”کسی شخص کو یہ (قدرت حاصل) نہیں کہ وہ ایمان لے آئے بجز اللہ کی مشیت کے۔ وہ گندگی واقع کرتا ہے۔ ان لوگوں میں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ آپ کہہ دیجئے کہ تم دیکھو تو کیا چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں، اور کوئی بھی نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچانے جو ایمان نہیں لاتے۔“ (یونس : ۱۰۰-۱۰۱)

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے امکان میں تھا کہ وہ تمام انسانوں کو مسلمان بنا دے، لیکن یہ ان کی تخلیق کی حکمت سے متعارض تھی۔ اس لیے اللہ نے انہیں پیدا کیا اور ان کی عقلوں کو سلیقہ بخشنا اور ان کی عقل و حواس کے سامنے مختلف نشانیاں اور دلائل پیش کیے جو اللہ کی طرف دلالت کرتے ہیں اور صحیح عقیدے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد لوگوں کو اختیار ہے کہ وہ ایمان لائیں یا گمراہ ہو جائیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”پھر اگر یہ لوگ آپ سے حجت کیے جائیں تو خیر آپ کہہ دیجئے کہ میں تو اپنا رخ اللہ کی طرف کر چکا اور جو میرے پیرو ہیں (وہ بھی) اور آپ اہل کتاب سے اور ایموں سے دریافت کیجئے کہ تم اسلام لاتے ہو؟ سو اگر وہ اسلام لے آئیں تو بس راہ ہدایت پر آگئے اور اگر وہ روگرداں رہے تو آپ کے ذمے تو بس تبلیغ ہی ہے اور اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔“ (آل عمران : ۲۰)

شعائر دینی پر عمل کی آزادی کی اسلام میں اس طرح ضمانت دی گئی ہے کہ اس کی مانند کسی اور دین یا نظام میں نظر نہیں آتی۔ رسول کریم نے غیر مسلموں کو اپنے عقائد کی آزادی دے رکھی تھی۔ اور یہ دونوں اسلامی حکومت کے سائے میں اپنی اپنی عبادت گاہوں میں آزادانہ آتے جاتے تھے، اور یہ کہیں بھی نظر نہیں آتا کہ کسی مسلمان حاکم نے کسی کلیسا کو منہدم کیا ہو یا کسی خانقاہ کو متفقل کر دیا ہو یا انہیں مسجد میں تبدیل کر دیا ہو۔ درآنحالیکہ غیر مسلم حکومتوں میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ مسلمانوں کو ان کے شعائر ادا کرنے سے روک دیا گیا۔ اندلس میں تمام مساجد شہید کر دی گئیں یا انہیں کلیساؤں میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس طرح کئی ہماک میں مسلمانوں کو اپنے اسلام کا اعلان بالجبر کرنے یا آپس میں اور اپنے طور پر اس پر عمل کرنے سے روک دیا گیا۔ تاریخ اسلام مسلمانوں کی رواداری کی ائینہ دار ہے اور ہر اس شخص کی جو مسلمانوں پر شعائر دینی پر عمل کرنے سے روکنے کی نہمت عائد کرتا ہے۔ سختی سے تردید کرتی ہے۔ اسلام میں رواداری کی انتہا یہ ہے



کہ کسی مسلمان کی بیوردی یا عیسائی بیوردی کو بھی اپنے کلیسیا یا مسجد میں جانے کا حق دیا ہے اور اس کے شوہر کو اس سے روکنے کی اجازت نہیں دی۔

جہاں تک دوسرے مذاہب کا اپنے مذاہب کے مطابق کھانے پینے کا تعلق ہے تو اسلام اس میں بھی ہمیں بلند خیال پر نظر آتا ہے اور ان کے سؤروں کو تلف کرنا ممنوع قرار دیا، کیونکہ وہ ان کا گوشت کھاتے ہیں۔ حالانکہ اسلام اپنے پیروکاروں پر اسے حرام قرار دیتا ہے، اس طرح ان کی شراب کو جسے وہ پیتے ہیں ضائع کرنے سے منع کر دیا جبکہ اس کا پینا مسلمان پر حرام ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کے خنزیر کو مار دے یا اس کی شراب کو ضائع کر دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں، لیکن اگر کسی عیسائی کی شراب یا خنزیر کو نقصان پہنچائے تو اس پر اس کی قیمت ادا کرنا واجب ہے۔ کیا آزادی کی ضمانت دیتے اور رواداری کی اس بلندی پر کوئی اور دین یا کوئی اور نظام پہنچ سکا ہے؟ غیر مذاہب کے ماننے والوں کو اسلام نے اپنے شخصی معاملات، مثلاً شادی بیاہ، طلاق، نان نفقہ اور میراث میں کسی تعرض یا جبر کے بغیر آزادی دی ہے اور شریعت اسلامی پر عمل کرنے پر مجبور نہیں کیا، کیونکہ اسلام انسان کی آزادی اور شرف کا احترام کرتا ہے اور اس لیے انہیں کسی قید و بند کے بغیر اپنے معاملات نمٹانے میں کھلا چھوڑ دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو عقل، منطق اور اخلاق کے حدود کے اندر رہ کر، اور حکومت وقت کے خلاف سرکشی کیے بغیر، بحث و مباحثہ کی اجازت دی ہے، بلکہ مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ان کے معاملات میں بحث و تجسس کے سلسلے میں سختی اور درشتی سے کام نہ لیں۔ اس سے اللہ کا یہ قول واضح ہو جاتا ہے:

”آپ اپنے پروردگار کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت سے بلائیے اور ان کے ساتھ پسندیدہ طریقے سے بحث کیجئے“ (النحل: ۱۲۵)

اور پھر فرمایا:

”اور تم اہل کتاب سے مباحثہ کرو کرو، مگر مذہب طریقے سے، سوائے ان لوگوں کے جو زیادتی کریں، اور کہہ دو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اس (کتاب) پر بھی جو ہم پر نازل ہوئی اور ان (کتابوں) پر بھی جو تم پر نازل ہوئیں اور ہمارا معبود اور تمہارا معبود تو ایک ہی ہے اور ہم تو اسی کے فرمانبردار ہیں“ (العنکبوت: ۲۶)

یہاں اسلام میں مرتد کی سزا کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس موضوع پر فقہانے جس کی پوری طرح چھان پھٹک کی ہے کسی بحث میں پڑیں۔ لیکن درج ذیل امور کی طرف ضرورتاً دلانا چاہتے ہیں:

۱۔ ”اسلام سے خروج“ (جو عموماً انفرادی فعل ہوتا ہے) اور اسلام پر خروج (یعنی بغاوت جو عموماً اجتماعی حرکت ہوتی ہے) میں فرق ہے جیسے رسول کریم کے عہد میں یہودی مرتدین اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں عرب مرتدین۔

۲۔ کسی کام کے حرام ہونے، اور اس کے قابل سزا جرم ہونے میں فرق ہے۔

۳۔ مرتد کا جرم ”حدود“ کے جرائم میں شمار نہیں ہوتا بلکہ تعزیری ہے، یعنی دائمی حکومت پر چھوڑا ہوا ہے۔ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کی حدیث اور صحابہ کرام کا عمل موجود ہے کہ مرتد کو قتل کیا جائے۔

مرتد کی سزا کے بارے میں ابن قیم کا قول ہے:

”یہ ایسا مسئلہ ہے جس کا اسلام میں دی گئی عقیدے کی آزادی سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ تو حکمت عملی ہے جس کا مقصد مسلمانوں اور مملکت اسلامی کے اداروں اور ان کے رازوں کو ان دشمنوں کے ہاتھ میں پہنچنے سے بچانا ہے جو اسلام کا دعوے کرتے ہوئے انہیں نقصان پہنچانا چاہے یا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن نے اسی مفہوم میں کہا ہے: ”اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے۔ دن میں اس پر ایمان لے آؤ جو مسلمانوں پر نازل ہوا ہے اور دن تمام ہونے پر ان سے انکار کر دو، عجیب کیا کہ (وہ بھی) پھر جائیں“ (آل عمران: ۷۲)

## فکر و اظہار کی آزادی

اسلام کو آزادی فکر و اظہار کرنے، اور اسے جاری و ساری رکھنے پر بڑا اصرار ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے عقل و علم کو کتنی بڑی اہمیت دی ہے کیونکہ عقل سے انسان حیوانات سے متمیز ہوتا ہے اور عقل ہی سے غور و فکر کرتے اور علم حاصل کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اگر عقل ان دونوں باتوں سے الگ کر دی جائے تو انسان اپنی اہم صفت سے محروم ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم میں وہ آیات جو "يعقلون" یا "يعملون" یا "يتفكرون" یا "يتدبرون" کے الفاظ پر ختم ہوتی ہیں، بے شمار ہیں۔ اس طرح غور و فکر کرنے، سوچنے اور سمجھنے کی تلقین کرنے والی آیات بھی بہت ہیں اور اسلام غور و فکر ہی کو اپنا مثالی طریقہ کہتا ہے جس سے اللہ کی معرفت اس کی خشیت، اس کی شریعت کی پابندی اور حدود و کا احترام حاصل ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ عقل کے غور و فکر کرنے اور غور و فکر کے اظہار کی مکمل آزادی کی فضا کے بغیر حاصل ہوتا، بعید از قیاس ہے۔

اسلام عقل کو اسیری سے رہا کرانے اور ان زنجیروں سے چھڑانے آیا تھا، جنہوں نے اُسے صدیوں سے پابند و معطل کر رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"کہ دو کر جو کچھ آسمان و زمین میں ہے اسے (غور سے) دیکھو" (یونس: ۱۰۱)

پھر کہا:

"کیا ان لوگوں نے آسمانوں اور زمین کی حکومت پر نظر نہیں کیا اور اس پر بھی جو

پھر اللہ نے پیدا کیا ہے....." (الاعراف: ۱۸۵)

ان دونوں آیتوں میں، کسی پابندی کے بغیر، عقل کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تاکید فرماتے ہوئے کہا:

"اللہ اسی طرح تمہارے لیے کھول کر احکام بیان کرتا ہے تاکہ تم سوچ سکو، یا کرو، دینا

اور آخرت کے معاملات میں....." (البقرہ: ۲۱۹ - ۲۲۰)

حریت فکر کے معاملے میں اسلام اس حد تک جا پہنچا ہے جو تقلیدی ایمان کے لیے پیام اجل ہے یعنی وہ ایمان جو محض آباؤ اجداد کی تقلید پر قائم ہے۔ اس قسم کا ایمان طوفانوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا اور نہ ایجابی ہو سکتا ہے۔ اسلام نے فقط ایک بات میں عقل دوڑانے سے منع کیا ہے اور وہ ہے ذات باری تعالیٰ، کیونکہ انسان کی محدود اور لاجار عقل ذات خداوندی کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اس موضوع پر غور و فکر کی طاقت صرف کرتا محض نصیح اوقات اور انسانی فوی کا غلط استعمال ہے جس کا کچھ فائدہ نہیں۔ عقل کے بے کائنات میں اللہ کی اتنی نشانیاں موجود ہیں کہ ان کے بعد ذات خداوندی میں غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

حریت فکر پر زور دینے کے بعد قدرتی طور پر اسلام مختلف طریقوں سے اس کے اظہار

کی آزادی پر بھی اصرار کرتا ہے اور یہ اظہارِ خواہ زبان سے ہو خواہ قلم سے، اور اسی کو آزادیِ رائے کہا جاتا ہے۔

رسولِ کریمؐ نے اپنے اصحاب کو ہر حالت میں حق بات کہنے کی تلقین فرمائی، اور یہ بھی تاکید کی کہ جسے صحیح سمجھتے ہوں اس کے اظہار میں کسی ملامت یا مذمت کی پرواہ نہ کریں اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔ اسی باعث آپؐ نے فرمایا:

”حق پر گونگا رہنے والا گونگا شیطان ہے“

آپؐ نے یہاں تک فرمایا کہ اگر مسلمان کوئی ایسی بات کہتا ہے جس سے جابر اور ظالم حاکم غضب ناک ہو جائے تو اس سے بھی دریغ و تامل نہیں کرنا چاہیے خواہ اس کے کہنے سے اسے قتل ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔ اور اسے سچی رائے کا اظہار کرنے پر اعلیٰ درجات کی بشارت دی: ”حمزہ بن عبد المطلبؓ اور وہ شخص سید الشہداء ہیں جو جابر حاکم کے سامنے کھڑا ہوا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کی، لیکن قتل کر دیا گیا“

اس حریتِ رائے اور اعلانِ حق کی دعوت کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمان کسی غلطی سے متنبہ کرنے سے نہیں ڈرتے تھے اور اپنے حکام پر تنقید کرتے تھے۔ اگر ان کی رائے صحیح ہوتی تو حاکم اپنی غلطی سے باہر آجاتا اور نہ اپنی رائے اور موقف کے صحیح ہونے پر انہیں مطمئن کرتا۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ مسلمانوں سے خطاب کرنے کھڑے ہوئے آپ نے مالِ غنیمت سے علی ہوئی ایک ایسی چادر کا کرتہ پہن رکھا تھا جس سے کسی متوسط قدر کے انسان کا لباس نہیں بن سکتا تھا جبکہ حضرت عمرؓ دراز قد انسان تھے۔ جب آپ نے مسلمانوں سے کہا: ”میری بات سنو اور اطاعت کرو“ تو ایک شخص نے کہا ہم بات سنیں گے نہ حکم مانیں گے حضرت عمرؓ نے اس کا سبب پوچھا تو سائل نے کہا کہ عمرؓ جیسے طویل قامت شخص کے لیے اس چادر سے لباس بنوانا کس طرح ممکن ہوا؟ کیا اس کا سبب یہ تو نہیں کہ اس نے زیادہ کپڑے لے لیا اور مسلمانوں پر اپنے آپ کو فوقیت دی؟ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبد اللہؓ کو طلب کیا اور کہا انہیں بتاؤ کہ میرا لباس کس طرح تیار ہوا تو عبد اللہؓ نے لوگوں سے کہا کہ انہوں نے اپنے حصے کی چادر بھی باپ کو دے دی تو اعتراض کرنے والے نے کہا: ”اے امیر المؤمنینؓ! اب ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔“

آزادی رائے کا اظہار تو عورتیں بھی قانونی اداروں کے سامنے بر ملا کرتی رہی ہیں اور حکام اس رائے کے صحیح ہونے کی صورت میں اسے تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ حضرت عمرؓ نے چاہا کہ لوگوں کو ہر زیادہ دینے سے روکا جائے۔ ایک عورت نے اُن سے کہا:

”اگر تم ایک بیوی کی جگہ (دوسری) بیوی بدن چاہو اور تم اس بیوی کو (مال کا) اتنا دے چکے ہو تو تم اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔ کیا تم بہتان رکھ کر اور صریح گناہ کر کے اسے (واپس) لو گے؟“ (النساء: ۲۰)

تو حضرت عمرؓ نے فرمایا:

”عمر! سب لوگوں سے زیادہ علم رکھتے ہیں، حتیٰ کہ عورتیں بھی! اس عورت نے درست کہا اور عمرؓ نے غلطی کی۔“

اس کے بعد آپ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

اس آزادی کا یہ نتیجہ تھا کہ علماء اور مفکرین اپنی خواہش کے مطابق رائے اختیار کرتے رہے اور جو چاہتے تھے تعلیم دیتے رہے اور اسلام یا اسلامی حکومت ان کے رائے میں حائل نہ ہوتی، اس سے علوم و ثقافت کے گلزار کھل اٹھے اور اسلامی مکتبہ فکر رنگارنگ کے ثقافتی معجزانوں سے مالامال ہو گیا، جن میں ہر قسم کے علوم و فنون، مثلاً فلسفہ، منطق، توحید، اصول، فقہ، تصوف، طب، کیمیا، طبیعیات، ہندسہ، ریاضی وغیرہ شامل ہیں جنہوں نے انسانیت کو ترقی کے راستے پر ڈال دیا اور درحقیقت یہی پیمبر جدید یورپی تہذیب کی نشاۃ کی بنیاد بنی۔

اسلام کے فقط ایک بات کو ناجائز قرار دیا یعنی دین اور اخلاق کو کمزور کرنا یا نقصان پہنچانا اور الحاد و زندقہ کی ترویج۔ کسی بھی عقلمند شخص کو اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ دین کو ضعف پہنچانے یا اخلاق کو تباہ کرنے یا کفر و الحاد و زندقہ کی تبلیغ، شیطان اور خبیثیت دعوت ہے جس پر پابندی لگانا اور مخالفت کرنا ضروری ہے۔

اگر ہم اس موضوع کا عملی جائزہ لیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ:

(۱) اسلام کے ظہور سے لے کر چوتھی صدی ہجری تک (جب اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا۔ دینی اور شرعی امور میں آزادی رائے کی عام طور پر ضمانت دی گئی تھی۔ اس دور کے وہ چند واقعات متنتی ہیں جو خلیفہ مامون الرشید کے ”خلق قرآن“ کے موقف سے تعلق رکھتے ہیں

(۲) سیاسی معاملات میں آزادی رائے کی انتہائی حد تک ضمانت دی گئی تھی، اور ہم نے اوپر اس کی مثالیں دی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اہم مثال حضرت علیؑ کی خلافت کے متعلق ہے جب خوارج ان سے کٹ گئے، جن کی تعداد تقریباً آٹھ ہزار تھی تو حضرت علیؑ نے عبداللہ ابن عباسؓ کو ان سے مناظرے کے لیے بھیجا تو ابن عباسؓ نے بحث سے تقریباً ۱۰ ہزار کو فائل کر لیا جو خوارج سے الگ ہو گئے جو باقی رہ گئے انہیں حضرت علیؑ نے لکھ بھیجا کہ:

”جہاں جا ہو رہو، تم میں اور ہم میں یہ عہد ہے کہ اس خون کو، جسے حرام قرار دیا گیا ہے، نہیں بہائیں گے، نہ راہزنی کریں گے یا کسی پر ظلم کریں گے۔ اگر تمہیں یہ منظور ہو تو ہم تم سے جنگ سے ہاتھ اٹھالیں گے۔۔۔۔۔ ہم اس وقت تک جنگ شروع نہیں کریں گے جب تک تمہاری طرف سے گڑبڑ اور فساد شروع نہ ہو۔“

(۳) جہاں تک علمی میدان میں عام اور خاص مسائل کے بارے میں آزادی رائے کا تعلق ہے تو اس کی پوری پوری ضمانت دی گئی تھی، یہاں تک کہ مخالف حکومت کے زیر سایہ مؤرخین بھی اپنی رائے اور میدان کا حسبِ خواہش اظہار کرنے رہے۔

## سیاسی اور شہری آزادی

دینی آزادی اور آزادی رائے و فکر کے ساتھ ساتھ، اسلام نے سیاسی اور شہری آزادی بھی عطا کی ہے، جن میں:

- (۱) حکومت اور حکام کے انتخاب میں اشتراک کا حق دار، اور
  - (۲) حکام کے اعمال کی نگرانی، ان پر تنقید اور ان کے بارے میں رائے کا اظہار، شامل ہیں۔
- جہاں تک حکومت اور انتخابِ حکام کا تعلق ہے تو یہ اسلام میں ”شہری“ کا ایسا طریقہ مقرر کرنے کا فطری نتیجہ ہے، جو عوام اور حکومت کے درمیان تعلقات کی بنیاد ہے۔ مسلمان عوام ”بیعت“ یا عام انتخابات کے ذریعے حکومت کے انتخاب، اور اہل حل و عقد کے تقرر کرنے میں شریک ہوتے ہیں۔ خلیفہ راشدینؓ کے انتخاب کے طریقے سے ہمیں عوام اور اہل حل و عقد کی شرکت کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ رسول کریمؐ مسلمان پر کوئی خلیفہ مقرر کیے بغیر حضرت ہو گئے۔ آپؐ کی رحلت کے بعد مسلمانوں نے آپؐ کا خلیفہ چننے کے لیے باہم صلاح و مشورہ کیا اور سب نے اپنی اپنی رائے پیش کی، اور دلیل

منطلق کے ذریعے اس پر بحث کی۔ پھر سب کا حضرت ابو بکرؓ کو ولی الامر بنانے پر اتفاق ہو گیا۔ حضرت ابو بکرؓ کی وفات سے پہلے مسلمانوں نے آپ سے پوچھا کہ ان کے بعد کون ان کا امیر ہو گا؟ تو آپ نے صحابہ کرامؓ، اہل حل و عقد، امراء اور سرداروں کی رائے طلب کی۔ جب سب کا حضرت عمرؓ بن الخطاب پر اتفاق ہو گیا تو حضرت ابو بکرؓ نے وثیقہ خلافت قلمبند کروا دیا۔ یہ دور مسلمانوں کے ارادے اور رائے کے لحاظ سے مثالی تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بعد خلیفہ منتخب کرنے کا اختیار ان چھ اصحاب کو دیا جن کی فضیلت پر مسلمان متفق تھے۔ ان چھ اصحاب میں طویل مشاورت ہوئی۔ یہاں تک کہ اکثریت حضرت عثمانؓ بن عفان پر متفق ہو گئی۔ اس پر بھی مسلمان، ان تمام حالات میں، منتخب شدہ شخص سے بیعت عام کے ذریعے اظہار اطاعت و قبول کرنے نئے نئے اجوان کی رائے، اقرار اور شرکت کا اعلان تھا۔

جب حاکم منتخب ہو جائے تو اس کا فرض ہے کہ وہ امت کی طرف رجوع کرے اور امور حکومت خصوصاً اہم معاملات میں ان سے رائے طلب کرے۔ حاکم وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اور وکالت کا تقاضا ہے کہ حاکم کے اختیارات، احکام خداوندی کے تابع ہوں۔ اس طرح احکام خداوندی اور امت سے مشاورت وہ اہم اصول ہیں جو حاکم صالح کے تقرر میں آزادی مشارکت کی ضمانت دیتے ہیں۔ جہاں تک اظہار رائے کی آزادی اور مسلمان حاکم کی نگرانی کا تعلق ہے تو ہم نے چند باتوں کا ذکر آزادی اظہار و افکار کے تحت کیا تھا۔ اس پر ہم یہ اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان حاکم خود اس بات پر اصرار کرتے رہے اور مسلمانوں کو اس حق کے استعمال کی ترغیب دیتے رہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے بیعت کے بعد لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”اے لوگو! میں تم پر حاکم بنایا گیا ہوں، مگر میں تم سے بہتر نہیں۔ اگر تم مجھے حق پر پاؤ تو میرا ساتھ دو، اور غلط دیکھو تو مجھے روک دو۔ جب تک میں خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں تو میری اطاعت کرو اور اگر میں ان کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔“

کسی شخص کے حضرت عمرؓ بن الخطاب سے کہا: ”اے امیر المؤمنین، خدا سے ڈرو اور دوسرے نے اس پر اعتراض کیا اور کہا: ”تم امیر المؤمنین سے کہتے ہو کہ خدا سے ڈرو؟“ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا:

”اسے کہتے دو۔ تم میں خیر اسی وقت تک ہے جب تک تم یہ کہتے رہو گے، اولہ ہم میں خیر اسی وقت تک ہے جب تک ہم اسے مانتے رہیں گے۔“  
ایک روز آپؐ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:  
”اے لوگو! جو شخص مجھ میں کجی دیکھے، اُسے چاہیے کہ اُسے سیدھا کر دے۔“

کسی بدو نے جواب دیا:

”خدا کی قسم اے امیر المؤمنین! اگر ہم نے کبھی آپؐ میں کجی دیکھی تو اسے ہم ان تلواروں سے سیدھا کر دیں گے۔“

تو حضرت عمرؓ نے فرمایا:

”خدا کا شکر ہے جس نے اس امت میں ایسے لوگ پیدا کیے جو عمر میں کجی دیکھیں تو اُسے تلوار سے سیدھا کر سکتے ہیں۔“

نظام اسلامی میں اظہار رائے کی آزادی اس حد تک تھی کہ رسول کریمؐ نے منافقین کی شرانگیزی

اور طعنہ دہنی کے باوجود انہیں کوئی سزا نہ دی۔ عبداللہؓ ابن مسعود سے روایت ہے کہ:

”جنگِ حنین میں رسول کریمؐ نے چند لوگوں کو ان میں مال تقسیم کرنے کے لیے منتخب کیا۔ آپؐ نے افرع بن حابس کو سواد نٹ دیے اور اتنے ہی عینہ بن حصف کو دیئے اسی طرح آپؐ نے اشرافِ عرب کو مال عطا فرمایا اور اس دن تقسیم کے معاملے میں انہیں ترجیح دی کسی سازشی نے کہا، اُس تقسیم میں آپؐ نے انصاف نہیں کیا اور نہ خدا کی رضا جوئی شامل ہے۔ میں نے کہا: واللہ! میں یہ بات ضرور رسول اللہؐ سے کہوں گا۔ چنانچہ میں نے جا کر حضورؐ سے عرض کیا جو اس شخص نے کہا تھا۔ یہ سن کر حضورؐ کا پہرہ ٹرخ ہو گیا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ”اگر اللہ اور اس کا رسول ہی انصاف نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟“ پھر فرمایا: ”اے موسیٰ! پر رحم فرمائے، انہیں اس سے زیادہ تنگ کیا گیا مگر انہوں نے صبر کیا۔“

اس پر حضرت عمرؓ کا عمل تھا۔ حضرت عبداللہؓ ابن عباس سے روایت ہے کہ عینہ بن حصف اپنے بھتیجے حمر بن قیس کے پاس آئے (جو حضرت عمرؓ کے مقرر بن میں سے تھے اور قاری ہونے کے وجہ سے حضرت عمرؓ کی مجلس مشاورت میں شامل تھے تو عینہ نے کہا: ”اے بھتیجے! تمہیں امیر کے پاس



تعام حاصل ہے۔ مجھے اس سے (علنی کی) اجازت لے دو۔ انہوں نے حضرت عمرؓ سے اجازت  
 دلوادی۔ جب وہ حضرت عمرؓ کے پاس آئے تو کہا۔ "اے ابن الخطاب! آپ نے ہمیں وافر و باز  
 ہم میں انصاف سے حکومت کی" حضرت عمرؓ غضبناک ہو گئے اور ارادہ کیا کہ اس سے الجھ جاب میں  
 تو حترنے اُن سے کہا۔ "اے امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا: "یہ شخص جاہلین"  
 میں سے ہے" خدا کی قسم، عمرؓ نے اس آیت کی تلاوت سن کر اس کی خلاف ورزی نہ کی۔

بے شک رواداری اور لوگوں کو آزادی عطا کرنے کا یہ مرتبہ کسی بھی نظام کے زیر سایہ کسی  
 معاشرے کے لیے حاصل کرنا نا در بات ہے، اسلام نے کسی بھی فرد کی آزادی کو محدود کرنے کی  
 اجازت نہیں دی۔ سوائے اس کے کہ اس پابندی میں معاشرے کی حقیقی مصلحت پوشیدہ ہو  
 اور کسی حاکم کی ذاتی خواہشات یا اس کے دل میں انتقام کی آگ بجھانے کے لیے ہرگز ایسا  
 نہیں کیا۔

سیاسی آزادی ہی کا ضروری حصہ شہری آزادی ہے۔ یہ انسان کی شخصی آزادی اور تمام انسانوں  
 سے آزادانہ معاملہ کرنے پر قادر ہونے سے عبارت ہے۔ اسی میں نافذ شدہ قوانین کی حدود کے اندر  
 معاہدے کرنا یا انہیں فسخ کرنا بھی شامل ہے۔ اس کی ضد غلامی ہے، جس سے انسانیت واقف ہے  
 اور خواہ وہ کسی صورت اور کسی شکل میں ہو ضرور باقی رہے گی۔

غلامی کے موضوع کو اسلام کے خلاف افترا پردازوں اور مسلمانوں کے خلاف سازش کا  
 وسیع میدان بنا لیا گیا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام غلامی کے نظام کو قائم کرنا چاہتا ہے اس  
 اعتراض کا جواب دینے کے لیے ہمیں غلامی کے نظام پر تاریخی پہلو سے نگاہ ڈالنی چاہیے تاکہ ہمیں  
 یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اسلام سے پہلے اور بعد میں موجود تھا۔ اس کے بعد ہم اس کے بارے  
 میں اسلام کا نظری اور عملی موقف جان سکتے ہیں کہ اسلام نے آزادی پر زور دیا، غلامی پر نہیں  
 اور جو ہر قسم کی غلامی سے، خواہ وہ کسی رنگ روپ کی ہو، آزادی کا مدعی ہے۔ اس میں فرد  
 کی غلامی یا کسی گروہ کی غلامی، مثلاً "استعمار یکساں ہیں۔ ہمارے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ  
 اس موضوع سے مفصل بحث کر سکیں لیکن اتنا اشارہ کافی ہو گا کہ اپنی تحریف شدہ صورت میں  
 یہودیت نے غلامی کی توثیق کی، اس پر اصرار کیا اور غلاموں کے حصول کے کئی طریقے ایجاد کیے  
 اسی طرح تحریف شدہ صورت میں عیسائیت غلام کی اپنے آقا کی اطاعت کو خدا کی اطاعت

قرار دے کر غلام کو اس بات پر مجبور کرتی ہے اور پھر غلامی سے نجات کو کوئی راستہ باقی نہیں چھوڑتی۔

اسی طرح یونان کے فلسفیوں وغیرہ افلاطون اور ارسطو نے غلامی کی تائید کی، اور اسے ان حالات میں سے ایک حالت خیال کیا جس پر لوگ فطرتاً پیدا کیے گئے اور انہوں نے غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے کوئی کوشش نہ کی۔

رسول کریمؐ کے معاصر عہد میں غلامی کا نظام بالاتفاق غیر نزاعی مسئلہ سمجھا جاتا تھا اور اسے معائنہ کا بنیادی عنصر خیال کیا جاتا تھا۔ اس نے اس متفق علیہ بات سے بغاوت کی اور انسان کے شرف اور انسانوں میں مکمل مساوات کا اعلان کیا۔ اسلام وہ فضا پیدا کرنے آیا جس میں غلام کی آزادی کی حمایت کی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے دلوں کو ہموار کیا کہ وہ مساوات اور انسانی آزادی کا استقبال کر سکیں۔ اس کے بعد اس نے ایسا نظام وضع کیا جو غلام کو مکمل آزادی عطا کرے۔ یہ نظام چارہ ستونوں پر قائم ہے:

۱۔ اساس فکری، یعنی اسلامی اقدار کی اشاعت کے لیے سازگار ماحول کی تشکیل، جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔

۲۔ ان اسباب کا قلع قمع جو غلامی پیدا کرنے ہیں۔ ایسے اسباب اسلام سے قبل بے شمار تھے لیکن اسلام نے ان میں سے صرف ایک باقی رکھا، یعنی جنگ

۳۔ غلام کو آزادی دینے کے ذرائع میں اضافہ۔

۴۔ لوگوں کو غلام آزاد کی ترغیب۔ اسلام نے اسے اللہ کی اطاعت اور تقویٰ سے تعبیر کیا۔

رسول کریمؐ اس معاملے میں لوگوں کے لیے بہترین نمونہ تھے۔ آپؐ نے اپنے چچا حمزہؓ اور اپنے آزاد کردہ غلام زبیرؓ کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا اور زبیرؓ سے اپنی پھوپھی زاد بہن زینبؓ کا نکاح کیا اس طر اور بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

## مساوات

اسلام سے قبل اور بعد میں، اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر (یعنی انقلاب فرانس) تک ہر قوم اپنی ہی قوم کے مختلف طبقات اور افراد کے درمیان طرح طرح کے امتیازات برتتی تھی، بلکہ

کئی مذاہب لوگوں میں تفریق و امتیاز کی تائید کرتے تھے اور غلامی و طبقاتی نظام کو انسانیت کے لیے طے شدہ امر تصور کرتے تھے۔ قومی اور فرقہ وارانہ تعصبات، نسلی اور طبقاتی امتیازات کو مسلسل ہوا دیتے رہے۔ یہودیوں کو گمان تھا کہ وہ خدا کی پسندیدہ قوم ہیں اور اللہ کے محبوب اور مقرب ہیں۔ اپنے قوانین میں انہوں نے یہود اور غیر یہود میں تفریق پیدا کی۔ (جرمنی میں) نازیوں نے دعویٰ کیا کہ لوگوں کو نسلی طبقات کے لحاظ سے ترتیب دینا چاہیے، اور جرمن نسل، سب نسلوں اور قوموں سے برتر ہے ان قوموں پر جو ترقی یافتہ اور مہذب ہونے اور تمام بنی نوع انسان کے ایک ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں، نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ تفریق و عدم مساوات کی سوچ، دنیا کے بیشتر خطوں میں راسخ ہو چکی ہے۔ مثلاً امریکہ کے حبشی وہاں کے گوروں کے مساوی نہیں حالانکہ دونوں ایک ہی ملک کے شہری ہیں۔ امریکی سفید فام جیشیوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے رہتے اور لین دین سے بہلوتھی کرتے ہیں۔ افریقی سفید فام (جنوبی افریقہ میں) وہاں کے جیشیوں کو خفارت دیکھتے ہیں اور وہیں دوسرے بائیسرے درجے کی مخلوق خیال کرتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں، اسلام نے لوگوں میں مساوات قائم کی اور آج سے چودہ سو برس پیشتر بنی نوع انسان کی وحدت کا اعلان کیا اور فرد کے شعور کی پربادخت اور اس کے ضمیر کی آزادی کے ذریعے اسے پروان چڑھایا، اور اس کے ساتھ ساتھ ایسے مناسب قوانین وضع کیے جو حقیقی مساوات کے حصول کی ضمانت دے سکیں۔ اسلام نے نسلی، طبقاتی اور گروہی نظام کے تمام آثار کے خاتمے کا اعلان کیا اور نسل، طبقہ، رنگ، ثروت وغیرہ کے تمام امتیازات کو جہتیں لوگ تفریق اور عدم مساوات کے اسباب سمجھتے تھے، مسترد کر دیا۔

”اسلام اس لیے آیا کہ ابتداء و انتہا، زندگی و موت، حقوق و فرائض، اللہ اور قانون کے روبرو اور دنیا و آخرت میں بنی نوع انسان کی وحدت قائم کرے۔ یہاں نیک عمل کے بغیر کوئی فضیلت نہیں اور نیکو کاروں کے سوا کسی کو شرف حاصل نہیں۔ اسلام کا یہ فیصلہ انسانیت کے لیے ایسی جست تھی جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی اور یہ کام ایک ایسی چوٹی ہے جسے اس سے پہلے انسان نے کبھی سر نہ کیا تھا۔ انقلاب فرانس اور دوسری سکوں نے جن انسانی قوانین کو نظر یاتی طور پر ضروری قرار دیا تھا، اسلام نے انہیں صدیوں پہلے نہایت عمدہ اور بلیغ انداز

میں عملی طور پر نافذ کیا۔

ساری انسانیت کا منبع و مصدر ایک ہے :

”اے لوگو! اپنے پروردگار سے تقویٰ اختیار کرو جس نے تم (سب) کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بکثرت مرد اور عورتیں پھیلا دیئے اور اللہ سے تقویٰ اختیار کرو جس کے واسطے سے ایک دوسرے سے مانگنے ہو اور قرابتوں کے بارے میں (تقویٰ اختیار کرو) بے شک اللہ تمہارے اوپر نگران ہے“ (النساء: ۱)

اور پھر فرمایا:

”اے لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور خاندان بنا دیا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک تم میں سے پرہیزگار تم اللہ کے نزدیک معزز تر ہے“ (الحجرات: ۱۳)

رسول کریمؐ نے اپنے آخری خطبے میں ارشاد فرمایا:

”اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔ تم سب آدمؑ سے ہو اور آدمؑ مٹی سے ہیں۔ بے شک تم میں سے پرہیزگار تم اللہ کے نزدیک معزز تر ہے۔ کسی عربی کے لیے عجمی، یا کسی عجمی کے لیے عربی، یا کسی سرخ فام کے لیے سفید فام، یا سفید فام کے لیے سرخ فام پر کوئی فضیلت نہیں ہوئے تقویٰ کے“

اگر امتیاز کا سبب بعض لوگوں کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ ”خدا فی نسل“ سے ہیں تو اللہ تو کہے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ

”اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدائے رحمن نے اولاد اختیار کر رکھی ہے۔ تم نے یہ حرکت

ایسی سخت کی ہے کہ کچھ بعید نہیں جو اس کے باعث آسمان ٹوٹ پڑیں اور زمین بھٹ

جائے اور پہاڑ کانپ کر گر پڑیں۔ اس سلسلے سے کہ یہ لوگ خدائے رحمن کی طرف

بیٹے کی نسبت کرتے ہیں اور خدائے رحمن کے لائق یہ (کسی طرح) نہیں کہ وہ بیٹا

اختیار کرے۔ جتنے بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں سب خدائے رحمن کے روبرو

عبد کی حیثیت سے حاضر ہوتے ہیں، اس نے ان کو احلے میں لے رکھا ہے اور انہیں خوب شمار کر رکھا ہے اور قیامت کے دن ان میں سے ہر ایک اس کے پاس تنہا حاضر ہوگا۔“ (مریم: ۸۸-۹۵)

اگرچہ وجہ امتیاز ”تیلے شریف خون“ یا عام خون کی نسل سے ہوتا ہے، تو قرآن انسان کی توجہ انسانیت کی مشترک اور واحد اصل کی طرف مبذول کرتا ہے:

”کیا ہم نے تمہیں ایک بے قدر پانی سے نہیں بنایا ہے؟ پھر ہم نے اسے ایک نکتہ مقرر تک ایک محفوظ جگہ میں رکھا۔ غرض ہم نے ایک اندازہ ٹھہرایا اور ہم کیسے اچھے اندازہ ٹھہرانے والے ہیں۔“ (المرسلت: ۲۰۱-۲۲۳)

”سو انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ ایک اچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پشت اور پسلیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔“ (الطارق: ۷۵)

انسان۔ ہر انسان۔ مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا ہوا ہے۔ پھر کسی اعلیٰ یا برتر حسب نسب کے دعویٰ کے سبب، امتیاز و تفریق کس لیے؟

”اللہ نے تمہیں مٹی سے بنایا پھر نطفے سے اور پھر تم کو جوڑے جوڑے بنایا۔“ (فاطر: ۱۱)

اسلام، تفریق و امتیاز اور ایک دوسرے پر برتری کے اسباب کی، خواہ وہ کسی شکل،

صورت یا انداز کے ہوں، ٹوہ میں لگا رہا کہ انہیں بیکسر نیست و نابود کر دے اور رسول کریمؐ ہمیشہ لوگوں میں یہ اعلان کرتے رہے کہ آپؐ جملہ انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں اور آپؐ کو حد شرع تھا کہ مسلمانوں کی آپؐ سے محبت کہیں افراط و تفریط کی طرف نہ لے جائے تو آپؐ نے اس سے یہ کہہ کر منع فرمایا:

”مجھے میرے مقام سے اس طرح مت بڑھاؤ جیسے کہ نصاریٰ نے ابن مریم کو

بڑھایا، کیونکہ میں تو فقط عبد اللہ ہوں، اس لیے عبد اللہ و رسول کہو۔“

آپؐ قریش کے کسی قبیلے میں تشریف لے گئے اور فرمایا:

”اے قریش کے لوگو! اللہ کے معاملے میں میں تمہارے کسی کام نہ آؤں گا۔ اے

بنی عبد مناف، اللہ کے معاملے میں میں تمہارے کسی کام نہ آؤں گا۔ اے صفیہ

(رسولِ پاکؐ کی چھوٹی) اللہ کے معاملے میں میں تمہارے کسی کام نہ آؤں گا۔“

جب قریش نے زعماء عرب نے اس اصول، یعنی اصول مساوات کا انکار کیا اور بلال حبشیؓ سے تقاضا کیا کہ انہیں اپنی مجلس سے دور ہٹادیں تاکہ وہ حاضر ہو سکیں اور آپؐ کا وعظ سن سکیں رسول کریمؐ نے اس بات کو رد کر دیا تو ان لوگوں نے کہا کہ پھر ایسا کریں کہ ایک دن ان کے لیے اور ایک دن ہمارے لیے مقرر کر دیں۔ قریب تھا کہ رسول کریمؐ اس لاپنج میں کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں، اس خواہش کو قبول فرما لینے کہ وحی نازل ہوئی جس میں رسول اللہؐ کو متنبہ کیا گیا:

”اور ان لوگوں کو نہ لکھا لے جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں، خاص اس

کی رضا کا قصد کرتے ہوئے۔ آپؐ کے ذمے ان کا حساب ذرا بھی نہیں اور نہ ان

کے ذمے آپؐ کا ذرا بھی حساب ہے جس سے آپؐ انہیں نکانے لگیں اور آپؐ کا

شمارے انصافوں میں ہو جائے اور اسی طرح ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے

کے ذریعے سے آزمائش میں ڈال رکھا ہے جس سے لوگ کہیں گے کہ کیا یہی لوگ

ہمارے درمیان سے ہیں جن پر اللہ نے اپنا فضل کیا ہے؟ کیا اللہ شکر گزاروں سے

خوب واقف نہیں؟ اور جب آپؐ کے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری نیتوں

پر ایمان رکھتے ہیں تو آپؐ کہہ دیجئے کہ تم پر سلامتی ہو، تمہارے پروردگار نے

اپنے اور رحمت لازم کر رکھی ہے۔۔۔۔۔“ (الانعام: ۵۲-۵۴)

ایک بار جب محمدؐ پر انسان ہونے کی حیثیت سے ضعف بشری کا لمحہ آیا تو آپؐ نے ایک غریب شخص

ابن ام مکتوم سے توجہ ہٹا کر سردار قوم ولید بن مغیرہ کی طرف رخ کر لیا۔ اسی وقت غناپ شدید

نازل ہوا جو تشبیہ کی طرح تھا جس نے مطلق مساوات کے مکمل معیار قائم کر دیے:

”پیغمبر! چس چس ہوئے اور منہ پھیر لیے اس بات پر کہ ان کے پاس نابینا آیا۔۔۔“

(چس چس - دیکھئے آیات ۱-۱۰)

ایک مرتبہ ابوذر غفاریؓ اور کسی حبشی غلام میں رسول کریمؐ کے سامنے جھگڑا ہو گیا تو ابوذرؓ

نے گرمی سے پکار کر کہا: ”اے کالی عورت کے بیٹے! رسول کریمؐ نے حد غضب ناک ہوئے اور

کہا: ”بس اب حد ہو گئی، کسی گوری کے بیٹے کو کالی کے بیٹے پر فضیلت نہیں، مگر تقویٰ اور عمل

صالح کے سبب“

رسول کریمؐ نے کئی بار حضرت بلالؓ کو مدینے کا والی مقرر کیا حالانکہ وہ آزاد کر وہ غلام تھے جنہیں حضرت ابوبکرؓ نے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ دراصل ایک مدینے میں بڑے بڑے صحابہؓ اور مہاجرین موجود تھے۔ اسی طرح آپؐ نے باذان فارسی کو مین کا والی بنایا۔ جب وہ فوت ہو گئے تو ان کی جگہ ان کے بیٹے کو دے دی۔ تاریخ اسلامی اور تاریخ ثقافت کے علاوہ سرداروں، امراء اور سرداران لشکر کے حالات دیکھئے۔ ہماری بات کی تصدیق ہوگی کہ بنی نوع انسان کی حقیقی مساوات اور وحدت کا صحیح نفاذ اسلام میں کیا گیا اور فتوحات، نظام حکومت اور ثقافت میں ہر رنگ و نسل کے لوگوں کو شریک کیا گیا۔ جن میں ایمان، روم، عرب، ہندوستان کے لوگ اور آزاد و غلام اور گورے اور کالے سبھی شامل تھے۔ یہ صورت حال کسی اور قوم یا کسی اور ثقافت کی تاریخ میں نہیں ملے گی۔

پوری کی پوری نوع بشر کا اسلام میں وہ احترام ہے کہ اس کا استحصال گوارا نہیں کیا جا سکتا اور اسلام جب مساوات کی حمایت کرتا ہے تو محض شرف و کرامت کی خاطر، جو اس کی انسانیت ہی کا تقاضا ہے:

”اور ہم نے ان کو نفیس چیزیں عطا کیں اور ہم نے ان کو بہت سی مخلوقات پر بڑی فضیلت دی ہے“ (بنی اسرائیل: ۷۰)

اسلام کی بنی نوع انسان کی تکریم پوری کی پوری انسانیت کے لیے تھی نہ کہ چند لوگوں یا نسلوں یا قبائل کے لیے۔ یہ تکریم بھی مطلق مساوات کی مانند ہے۔ سب کے سب آدمؑ سے ہیں اور جب آدمؑ سے بنائے گئے اور جب آدمؑ اللہ کے نزدیک معزز تھے تو ان کے بیٹے یہاں باہاں سب کے سب، اس بات میں مساوی ہیں۔

مساوات کی ضمانت دینے کے لیے اسلام نے جو قوانین بنائے ہیں۔ ان کی تفصیل ہم اس وقت بیان کرنے سے قاصر ہیں، لیکن اسلام نے حقوق و فرائض متعین کر دیئے ہیں اور لوگوں کو قانون کی نظر میں مساوی قرار دیا ہے۔ خود رسول کریمؐ نے مساوات کے قانون کی برتری کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

”اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرے گی تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔“

حالانکہ انشرف قریش کسی مخزومی عورت کے بارے میں جس پر حد قائم کی جانے والی تھی ہنری

کی سفارش لے کر آئے تھے۔ رسول کریم نے انہیں مساوات کے بنیادی اصول سے آگاہ کیا۔ اور واضح کر دیا کہ ان سے پہلی قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں کوئی امیر جو پوری کرتا تو چھوڑ دیا جاتا اور فقیر جو پوری کرتا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا۔

## ر عدل و انصاف

انصاف ان بنیادی مثالوں میں سے ہے جنہیں انسانوں کے درمیان بروٹے کار لانے کے لیے اسلام آیا اور اسلام کے لیے جو انسانی شرف کا حامی ہے اور اس حق کی پاسداری کرتا ہے انصاف کا قیام عین فطرت ہے۔ حق و صداقت کے قیام کے لیے انصاف ضروری ہے اور عدل کی ضمانت مل جانے سے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ امن و سکون کی فضا پیدا ہوتی ہے اور افراد انسانی کے ایک دوسرے سے تعلقات مضبوط ہوتے ہیں اور ان روابط میں توازن، ہم آہنگی اور اخوت پیدا ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کئی آیات اور احادیث رسول انصاف کی پُر زور تلقین کرتی ہیں تاکہ ایسا حق ناظم ہو جس میں ظلم و زیادتی کا ذرا بھی شائبہ نہ پایا جائے اور اس کا بہت سختی سے احترام کیا جائے اور جس کی خلاف ورزی پر سخت عذاب کی وعید دی گئی ہے۔

قرآن کریم نے اعلان کیا:

”بے شک اللہ عدل کا اور حسن سلوک کا اور قربت داروں کو دیتے رہنے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی سے اور مطلق برائی سے اور ظلم و سرکشی سے ممانعت کرتا ہے“ (النحل: ۹۰)

اللہ تعالیٰ نے جس عدل کو اپنا ایک وصف قرار دیا، محض عدل و حق کے قیام کے لیے اپنے رسولوں کو بھیجا، کتابیں نازل کیں اور لوگوں کو شریعتوں کا پابند بنایا:

”ہم نے اپنے پیغمبروں کو واضح باتوں کے ساتھ بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ

کتاب اور میزان نازل کیا تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں.....“ (الحمدید: ۲۵)

آسمان وزمین صرف عدل ہی پر قائم ہیں:



”اور آسمان کو اسی نے بلند کیا اور اسی نے میزان وضع کر دی تاکہ تم تولتے میں گڑبڑ نہ کرو اور وزن کو انصاف کے ساتھ ٹھیک رکھو اور تول کو گھٹاؤ مت“ (الرحمن: ۷-۹) عدل کا قیام رسولؐ کے فرائض میں سے ہے :

”اور آپؐ کہہ دیجئے کہ اللہ نے جو بھی کتابیں نازل کی ہیں میں ان پر ایمان لانا ہوں اور مجھے یہ حکم ملا ہے کہ (اپنے اور) تمہارے درمیان کروں“ (الشوریٰ: ۱۵) جہاں تک ظلم کا تعلق ہے تو یہ ایسی بات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پر بھی حرام قرار دیا اور اپنے بندوں کے لیے بھی حرام بنا دیا :

”..... اور اللہ بندوں پر کسی قسم کا ظلم نہیں کرتا چاہتا“ (المؤمن: ۳۱) اور حدیثِ قدسی میں آیا ہے :

”اے میرے بندو! میں نے اپنی ذات پر ظلم حرام قرار دیا ہے اور تمہارے بائیں بھی اسے حرام کر دیا ہے اس لیے ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو“ رسول کریمؐ نے ظلم سے منع فرمایا اور اسے قیامت کے دن ”ظلمات“ قرار دیا : ”ظلم سے بچو، کہ ظلم یوم قیامت کی ظلمات ہے“

وہ انصاف، اسلام جس کا داعی ہے ایسا عدلِ مطلق ہے جو لوگوں میں مساوات قائم کرتا ہے : ”اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو...“ (النساء: ۵۸) اور لوگوں میں موجود باہمی عداوت کو ظلم کرنے یا انصاف سے دست برداری کا جواز نہیں بتایا جاسکتا ”لے ایمان والو! اللہ کے لیے پوری پابندی کرنے والے (اور عدل کے راسخ شہادت دینے والے) رہو اور کسی جماعت کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم انصاف ہی نہ کرو۔ انصاف کرتے رہو (کہ) وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو“ (المائدہ: ۸) یہاں تک کہ بات کہتے ہیں بھی انصاف سے کام لینے کی تاکید کی، اور فرمایا :

”..... اور جب یولو تو عدل (کا خیال) رکھو، اگرچہ وہ (شخص) قرابت دار ہی ہو۔ اور اللہ سے جو عہد کیا ہے اسے پورا کرو۔ اس (سبب) کا (اللہ نے) تمہیں حکم دیا تاکہ تم یاد رکھو“ (الانعام: ۱۵۲)

عدل ایسا وصف ہے جو افراد اور معاشرہ دونوں کے لیے ضروری ہے۔ فرد میں انصاف سے مراد یہ ہے کہ ہر حق دار کو اس کا حق مل جائے اور اس کی راہ میں حائل ہونے والی باتوں سے اجتناب کیا جائے۔ انصاف پسند معاشرہ وہ معاشرہ ہے جس کے نظام ہائے زندگی اور قوانین میں کسی فرد کے لیے اپنا حق پانا اور اپنی استطاعت کے مطابق ترقی کرنا آسان ہو۔ کسی فرد کے اپنے معاشرے سے تعلقات کی واضح تعین بھی عدل ہی سے ہوتی ہے اور خواہشات سے کنارہ کشی اور حق کے سوا کسی بات کو ترجیح نہ دینا ہی عدل کی بنیاد ہے۔

عدل کی طرح ہے جس کی تفصیل ہم بیان کریں گے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ہم سب سے پہلے یہ واضح کریں کہ چونکہ عدل اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے اس لیے اسلامی حکومت کا ڈھانچہ عدل کے ستونوں پر قائم ہوتا ہے۔ خلیفہ بننے کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے پہلے ہی خطبہ میں جو ارشاد فرمایا وہ آپ کا دستور الحکم کہا جاسکتا ہے:

”تم میں سے کمزور میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق دلوں  
دوں اور قوی میرے نزدیک ضعیف ہے جب تک کہ میں اس سے حق نہ دلوں  
دوں، انشاء اللہ۔“

حضرت عمرؓ اس کے اتنے خواہش مند تھے کہ اپنے عمال اور والیوں کو عدل کا مسلسل حکم دیتے دیتے رہتے تھے۔ وہ جنہیں عامل مقرر کرتے ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے انہیں مسلسل یہ یاد دہانی کراتے رہتے کہ انہیں اس لیے لوگوں پر حاکم نہیں بنایا گیا کہ وہ ان سے ان کے جان و مال اور آبرو چھین لیں بلکہ اس لیے ولایت سونپی ہے کہ لوگوں کو کتاب اللہ اور اس کے رسولؐ کی سنت کی تعلیم دیں اور ان میں حق کے ساتھ فیصلے کریں اور عدل کے ساتھ تقسیم کریں۔ آپ لوگوں سے کہتے:

”اگر کسی شخص پر کسی عامل نے ظلم کیا ہو تو وہ اس کی نشاندہی کریں تاکہ میں

اس سے قصاص دلوں۔“

عمر بن العاصؓ نے سوال کیا:

”اے امیر المؤمنین! اگر کسی امیر نے کسی شخص کو تادیب کے لیے ایسا کیا

تب بھی آپ ایسا ہی کریں گے؟

تو حضرت عمرؓ نے فرمایا :

”ہاں کیوں نہیں؟ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ نے اپنی ذات سے کبھی قصاص دلوایا۔“

اسلام جس عدل کا تقاضا ہے وہ حکومت میں ہے :

”جیت نم لوگوں میں فیصلہ کرو تو عدل سے فیصلہ کرو“ (النساء : ۵۸)

اور امام عادل اُن سات افراد میں سے ہے جن پر خدا اس دن اپنا سایہ کرے گا جب اس کے سامنے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔ سید الشهداء دو شخص ہیں ایک حمزہؓ بن عبدالمطلب اور دوسرا وہ شخص جو ظالم حاکم کے سامنے کھڑا ہو کر اُسے معزوف کا حکم دے اور منکر سے روکے اور وہ اُسے قتل کر دے۔

اسلام جس عدل کی دعوت دیتا ہے وہ کمزوری کی حمایت ہے۔ جھگڑنے والوں میں برابری ہے خواہ ان کے مرتبے اور درجے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔ یہ حقوق و فرائض کی ادائیگی میں عدل ہے۔ حدود و قصاص کے قیام میں عدل ہے۔ ایک سے زائد بیویوں کے درمیان عدل ہے۔ بولنے لکھنے اور گواہی میں عدل ہے اور مسلمانوں کے آپس میں جھگڑتے والے گروہوں کے درمیان عدل ہے :

اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں جنگ کرنے لگیں تو اُن کے درمیان صلح کرادو پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس سے لڑو جو زیادتی کر رہا ہے یہاں تک کہ وہ رجوع کرے اللہ کے حکم کی طرف۔ پھر جب وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان صلح کرادو اور عدل کے ساتھ، اور انصاف کا خیال رکھو، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے“ (المحرات : ۹)

اسلام میں عدل اس قدر کامل اور عام کہ دشمن اور مخالف بھی اس سے خارج نہیں اور اسی کے نتیجے میں ذمی اور وہ لوگ بھی جن سے معاہدہ طے پایا ہو، بدرجہ اولیٰ اس میں شامل ہیں رسول کریمؐ نے یہ بھی فرمایا :

”جس نے کسی ذمی کو تنگ کیا تو میں اس کی طرف سے مدعی ہوں اور میں جس کا مدعی ہوں گا اس سے قیامت کے دن بدلہ چکاؤں گا۔“

آپ نے یہ بھی فرمایا:

”جن لوگوں سے معاہدہ ہو، خیردار اگر کسی نے ان پر ظلم کیا یا ان کے حق میں کمی کی یا ان کی طاقت برداشت سے زیادہ تکلیف دی یا ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر ان سے کوئی چیز لی۔ ورنہ میں قیامت کے دن اس کا مدعی ہوں گا۔“

آپ نے یہ اس لیے فرمایا کہ غیر مسلم جب بھی دارالسلام میں اقامت پذیر ہوئے تو وہ خدا اور اس کے رسولؐ کی ”ذمہ داری بن گئے“ اور یہ ان کا بنیادی حق ہے کہ ہر حال میں ان کے ساتھ عدل کا برتاؤ کیا جائے۔

## معاملات حکومت میں انصاف

قرآن و حدیث میں اس کے کئی شواہد ہیں جن میں سے بعض کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر حاکم کو حکم دیتا ہے کہ وہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ عدل و انصاف سے کرے۔ اور اپنی خواہشات کی پیروی نہ کرے مبادہ راہ مستقیم سے بھٹک جائے۔ رسول کریمؐ نے واضح فرمایا کہ انصاف کسی حاکم کی حکومت کو بچھڑاتا ہے اور اگر وہ لوگوں میں انصاف سے کام لینا ترک کر دے تو نظام حکومت میں خلل واقع ہوگا اور سلطنت مٹ جائے گی۔

”قریش میں حکومت اس وقت تک رہے گی جب ان سے رحم کی درخواست کی جائے گی تو وہ رحم کریں گے اور جب کریں گے تو عدل سے کام لیں گے اور جب تقسیم کریں گے تو انصاف کو پیش نظر رکھیں گے جو شخص ایسا نہ کرے گا تو اس پر اللہ اور ملائکہ اور انسانوں، سب کی لعنت ہو۔“

حکومت میں عدل اس وقت تک قائم نہیں ہوتا جب تک ہر حق دار کو اس کا حق نہ مل جائے اور حکومت اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ احکام کے مطابق ہونی چاہیے۔ کسی انصاف پسند حاکم کو اعلیٰ مثالوں سے متعارف کرانے کے لیے اس اہم خط کی طرف اشارہ ضروری ہے جو حسن بصریؒ نے امیر المؤمنین عمرؓ بن عبدالعزیز کے نام لکھا تھا انہوں نے لکھا تھا:

”اے امیر المؤمنینؓ! آپ پر واضح ہو کہ اللہ نے امام عادل کو ہر ٹیڑھے کو سیدھا کرنے والا، ہر گم کردہ راہ کا رہنما، ہر خرابی کی اصلاح کرنے والا، ہر ضعیف کی

طاقت، ہر مظلوم کا فریادرس اور ہر دل گرفتہ کا غمگسار بنایا ہے۔ اسے امیر المؤمنین امام عادل اولاد کے لیے شفیق باپ کی مانند ہے جو ان کے لیے بھاگ دوڑ کرتا ہے۔ بڑے ہونے پر تعلیم دیتا ہے۔ اپنی زندگی میں ان کے کمانا ہے اور مرنے کے بعد ان کے لیے ورثہ چھوڑ جاتا ہے۔ اسے امیر المؤمنین، امام عادل مہربان اور نیک ماں کی طرح ہے جو اپنی اولاد کے لیے درد مند دل رکھتی ہے جس کے لیے اس نے پہلے حمل کی تکلیف برداشت کی اور پھر پیدائش کا دکھ جھیلا اور بچپن میں اسے پالا پوسا۔ بچہ جاگتا ہے تو وہ بھی جاگتی ہے۔ وہ چپ ہوتا ہے تو اسے اطمینان ہوتا ہے۔ کبھی وہ دودھ پلاتی ہے، کبھی دودھ پھر پڑواتی ہے۔ وہ عافیت سے ہونو خوش ہوتی ہے، تکلیف میں ہونو پریشان رہتی ہے اور اسے امیر المؤمنین امام عادل تبیموں کا سرپرست اور مسکینوں کا کفیل ہے۔ چھوٹوں کی تربیت کرتا ہے اور بڑوں کی پرورش۔ اور اسے امیر المؤمنین امام عادل سینے میں دل کی طرح ہے۔ وہ ٹھیک ہو تو جسم تندرست ہے مگر بگڑ جائے تو جسم بگڑ جاتا ہے۔ اور اسے امیر المؤمنین امام عادل اللہ اور اس کے بندوں کا درمیانی واسطہ ہے۔ وہ اللہ کے احکام بھی سنتا ہے اور بندوں کی باتیں بھی۔ اللہ کو بھی دیکھتا ہے اور بندوں کو بھی۔ اللہ کا مطیع ہونا ہے اور بندوں کا مطاع۔ اور اسے امیر المؤمنین اللہ نے آپ کو جس چیز کا مالک بنایا ہے اس میں آپ اس غلام کی طرح نہ بنیں جسے اس کے مالک نے امین بنایا اور اپنے مال و عیال کی حفاظت پر مامور کیا لیکن اس نے مال ضائع کر دیا اور عیال کو بے خانماں کر دیا۔ اس کے اہل و عیال کو اس نے تنگ دست کر دیا اور مال لٹا دیا۔ اور اسے امیر المؤمنین جان لیجئے خدانے حدود کا حکم اس لیے فرمایا کہ لوگوں کو خباثت اور نواس سے باز رکھا جاسکے لیکن اگر وہی ایسا کرنے لگے تو کیا ہوگا؟ اسے امیر المؤمنین موت اور بعد الممات کو یاد رکھیے۔ مت بھولیے کہ اس کے مقابلے میں آپ کا کوئی مددگار نہیں اور نہ اس سے بچانے والے دوست ہیں۔ تو موت اور موت کے بعد کی بڑی گھبراہٹ سے بچنے کی تیاری کر لیجئے۔ امیر المؤمنین جان لیجئے

کہ اس گھر کے علاوہ جس میں آپ رہ رہے ہیں، آپ کا ایک دوسرا گھر ہے جہاں آپ کا قیام طویل ہوگا اور آپ کے احباب ساتھ چھوڑ جائیں گے اور آپ کو ایک گڑھے میں اکیلا اور تنہا سو تپ دیں گے، تو اس ”دن کے لیے جب انسان اپنے بھائی، اور ماں اور باپ اور بیوی، اور اولاد سے کٹی کڑا جائے“ (علس: ۳۶-۳۷) ایسا زادِ راہ تیار کیجئے جو آپ کا ساتھ دے۔ یاد رکھیے اسے امیر المؤمنین کہ اہل کی آمد اور انقطاع امید سے پہلے آپ کو فرصت کے چند لمحات حاصل ہیں۔ اے امیر المؤمنین۔ اللہ کے بندوں پر ترمانہ جاہلیت کے مرد جبہ طرفیہ پر حکومت نہ کیجئے اور ان کے ساتھ ظالموں کا راستہ اختیار نہ کیجئے نہ کوتاہ دستوں پر دراز دستوں کو مسلط کیجئے اس لیے کہ وہ کسی مومن کی قرابت داری یا عہد کی حفاظت یا لحاظ نہیں کر سکتے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ اپنے بوجھ تو اٹھائیں گے، ہی لیکن اس کے ساتھ ان کا بوجھ بھی اٹھانا ہوگا اور اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ مزید بہت سی ذمہ داریاں آپ پر آپڑیں گی۔ وہ لوگ جو آپ کی نباہی کے بل پر عیش کر رہے ہیں آپ کو دھوکا دے جائیں۔ وہ آپ کی آخرت کی پاکیزہ نعمتوں کو ضائع کر کے مروج اڑا رہے ہیں۔

اپنے آج کے اختیار و قدرت کو نہ دیکھئے، کل کے اختیار و قدرت پر نظر رکھیے جب آپ موت کے پیچھے کے اسیر ہوں گے اور ملائکہ، انبیاء اور مرسلین کے مجمع میں اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ ”اور (اس روز) تمام پھر اس جی و قیوم کے سامنے جھکے ہوں گے“ (ظہر: ۱۱۱)

اے امیر المؤمنین، اگرچہ میری نصیحتیں ویسی پرتاثر نہیں ہیں جتنی آپ سے پہلے دانش مند لوگوں کی تھیں، لیکن میرے پاس آپ کے لیے شفقت اور خیر خواہی کی کمی نہیں۔ میرے اس خط کو کسی ایسے دوست کے علاج و تدبیر کا مقام دیجئے جو صرف اس لیے تلخ دوا استعمال کروانا ہے کہ مریض کو صحت و عافیت نصیب ہو۔

والسلام علیک یا امیر المؤمنین ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہم نے یہ خط اس لیے درج کیا ہے کہ اس سے حاکم عادل کی وہ صورت واضح ہو جاتی ہے جو لوگوں کو مطلوب ہے اور ہمارے خیال میں عدل کے عملی نفاذ کے لحاظ سے اس کی موجودگی میں کسی اور مثال کی ضرورت نہیں رہتی، ورنہ اسلامی تاریخ، خصوصاً خلفاء راشدینؓ کی تاریخ لوگوں میں عدل قائم کرنے کے سلسلے میں ایسے عجیب و غریب واقعات سے پُر ہے جن پر مشکل سے یقین آتا ہے۔

## عدالتی انصاف

عدلیہ کسی ملک کا ایک اہم ادارہ ہے جس پر وہاں کے باشندے اپنے حقوق اور انصاف حاصل کرنے کے لیے انحصار کرتے ہیں اور عدلیہ ہی کے ذریعے سزائیں نافذ کی جاتی ہیں اور انصاف ملتا ہے۔

عدل کے تحفظ اور حتیٰ کی ضمانت کو مؤثر بنانے کے لیے اسلام نے اس ادارے کو دوام اور اختیارات عطا کرنے میں خاصی دل چسپی لی ہے۔ مسلمان فقہا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ درج ذیل حالات میں قاضی فریقین کو درجہ کا درجہ دینا چاہیے۔

۱۔ اپنے سامنے پیشی میں۔

۲۔ اپنے پاس بٹھانے میں۔

۳۔ ان کی طرف توجہ دینے میں۔

۴۔ ان کی بات سننے میں اور

۵۔ ان کے معاملے میں فیصلہ سنانے میں

عمر بن الخطابؓ نے ابو موسیٰ اشعری کے نام ایک خط میں صاف ستھری اور منصف مزاج کے بنیادی اصول بیان کیے ہیں۔ اسلامی عدلیہ کے پیش نظر باہمی بات کے ثبوت کے طور پر، اس اہم خط کو ہم یہاں درج کر رہے ہیں۔ عمرؓ نے اس میں احکام کا خلاصہ بیان کر دیا ہے اور نہایت اختصار کے ساتھ، بہترین پیرائے میں انہیں پیش کر دیا ہے۔ بعد میں آگے والوں نے اسے اپنے لیے رہنما اصول قرار دیا۔ پھر تو یہ ہے کہ کسی حق پسند کے لیے ان اصولوں سے انحراف ممکن نہیں، نہ ظالم ان سے بچ سکتا ہے۔ انہوں نے فرمایا:

”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اللہ کے نزدیک عمر بن الخطابؓ، امیر المؤمنینؓ سے عبداللہ بن فیس (یعنی ابو موسیٰ اشعری) کی طرف السلام علیکم، اما بعد جھگڑوں کا فیصلہ کرنا بتیاری فرض ہے اور لائق اتباع سنت ہونے پس جان لو کہ جب معاملہ تمہارے سامنے پیش ہو تو کسی ایسے حق کے بارے میں گفتگو کرنا، جو ثابت نہ ہو، بے کار ہے لوگوں میں اپنے سامنے، اپنے انصاف میں اور اپنی مجلس میں مساوات قائم کرو کہ معزز تم سے ناجائز خواہشات والیستہ نہ کر لے اور کمزور تمہارے انصاف سے مایوس نہ ہو جائے۔ بار ثبوت مدعی پر ہے اور مدعا علیہ پر قسم لازم ہے (بشرطیکہ وہ گواہ پیش نہ کر سکے) اور مسلمانوں میں صلح مستحسن ہے، سوائے ایسی صلح کے جس کی وجہ سے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کرنا پڑے (اسلامی نظام عدل تمہیں اس بات سے مانع نہیں کہ اگر آج کسی جھگڑے کا فیصلہ تم نے اپنی عقل اور بہترین صلاحیتوں کے مطابق کر دیا ہے (لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ حق اس سے مختلف ہے) تو تم حق کی طرف رجوع کرو۔ اس لیے کہ حق قدیم ہے اور باطل میں مبتلا ہونے سے حق کی طرف لوٹنا بہتر ہے۔ ایسے معاملات جو کتاب و سنت میں نہ ملیں اور تمہارے لیے ان میں فیصلہ کرنا مشکل ہو تو ان میں اپنی سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے ایشاہ و نظائر پر غور کرو اور ایسے موقعے پر معاملات کو ایک دوسرے پر قیاس کرو اور ان میں سے اس کا انتخاب کرو جو اللہ کے احکام سے قریب تر اور حق کے زیادہ سے زیادہ قریب ہو۔ جو شخص کسی حق غائب یا موجود کا دعویٰ کرے تو اس کے لیے تاریخ مقرر کرو جس پر سارا معاملہ فیصل ہو۔ اب اگر وہ اپنے حق کے گواہ اور ثبوت پیش کر دے تو اس کا حق دلدادہ اور فیصلہ اس کے خلاف کر دو۔ یہ طریق کار شک و شبہ سے بچانے والا اور اندھیرے میں اجالا کرنے والا ہے۔

”گواہی دینے میں) سب مسلمان ایک دوسرے کے معاملے میں معتبر ہیں سوائے اس شخص کے جس پر کوئی حد نافذ ہو چکی ہو یا جھوٹی گواہی میں ملوث



اور مجرب ہو یا جس پر کسی نسبی عصبیت اور باہمی تعلقات کی وجہ سے جا بیداری کا شبہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تم سے پوشیدہ رازوں کے بارے میں درگزر فرمایا ہے اور شہادتوں اور قسموں کی وجہ سے سزاؤں کو ساقط کر دیا ہے۔

”دشمنوں کو پریشان کرنے، ان پر دباؤ ڈالنے یا انہیں ایذا دیتے سے گریز کرو اور مقدمات سامنے لائے جانے پر ناک بھوں نہ چڑھاؤ، کیونکہ مستحق کو حق دلانا اللہ کے نزدیک بہت اجر و ثواب کا کام ہے اور تمہارے میں نیکیوں کا اضافہ ہوتا ہے۔“

”جس کی نیت صاف ہو اور جو اپنا محاسبہ کرتا رہے تو اس کے اور لوگوں کے درمیان جو کچھ پیش آتا ہے، اللہ ہی اس کے لیے کافی ہوتا ہے اور جو لوگوں کے سامنے مصنوعی اخلاق کا مظاہرہ کرے اور اللہ جانتا ہو کہ وہ خوبیاں اس میں نہیں اور اللہ اسے ذلیل کرتا ہے۔ اس شخص پر حیرت ہے جو اجر و ثواب اور رزق اور رحمت کے خزانوں کی غیر اللہ سے اُمید و توقع رکھتا ہے۔ والسلام“

عدالتی انصاف کا تقاضا ہے کہ فیصلوں کے نفاذ اور حدود کے قائم کرنے میں بھی عدل کیا جائے کیونکہ فیصلے صادر ہونے کے بعد اگر ان کے نفاذ کا اہتمام نہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کریں گے اور راہِ راست کے خلاف بغاوت کر دیں گے۔ حقوق کا مفصد دین، آپر و مال، جان اور عقل کی حفاظت ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر رسول کریمؐ نے فیصلوں کے نفاذ اور حدود قائم کرنے میں لوگوں میں مساوات کا مشورہ دیا۔ آپ نے فرمایا:

”تم سے پہلے جس بات نے لوگوں کو ہلاک کیا وہ یہ تھی کہ جب کوئی ضعیف چوری کرتا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیتے اور جب کوئی معزز شخص چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے۔ قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر فاطمہ بنت محمدؑ بھی چوری کرے تو محمدؑ اس کا ہاتھ کاٹ دے گا۔“

**حقوق و فرائض کی ادائیگی اور اجتماعی عدل قائم کرنے میں انصاف**

اسلام تمام انسانوں کو عدل و مساوات کی نظر سے دیکھتا ہے، کیونکہ ان کی اصل ایک ہے

اور کوئی شخص ماں کے پیٹ سے حق لے کر پیدا نہیں ہوتا اور نسل و رنگ کے سبب کسی کو کسی پر فوقیت کا لحاظ کیے بغیر، سب کو برابر کے مواقع حاصل ہیں۔ حقوق کے حصول اور ان کی حفاظت کے سلسلے میں اس عدل عام کی جو صورتیں ہیں، ان میں تمام شہریوں کے لیے تعلیم کا حق، زندہ رہنے کا حق (کیونکہ انسانی خون بھر حال حرام ہے اور حق کے سوا اس کا ہانا جائز نہیں) ملکیت کا حق (جب تک وہ قانونی طریقے سے پورا ہوتا ہے) شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے، اس پر تصرف کا حق، اور فکر و رائے کا حق (جہاں تک دین کی بنیادوں سے متعارض نہ ہو) شامل ہیں۔ اسلام میں اجتماعی عدل پر بحث کرتے ہوئے ہم اس موضوع کی تفصیل دوبارہ بیان کریں گے۔

## اسلامی ثقافت کی خصوصیات

اسلامی ثقافت کا سب سے بڑا منبع خود قرآن کریم ہے اور یہ ہر حقیقہ ابتدا ہی سے ملاوٹ سے پاک چلا کر رہا ہے۔ رسول کریم کی خواہش رہی کہ مسلمانوں کی تربیت اس طرح سے ہو کہ ان پر قرآن کے سوا کوئی اور چیز اثر انداز نہ ہو۔

”کیونکہ آپ چاہتے تھے کہ ایک ایسی نسل تیار کی جائے جس کا دل، دماغ، تصور

شعور اور ترکیب ایسی خالص ہو کہ اس پر کسی قسم کی خارجی اثرات نہ ہوں“

اس پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر ہم اسلامی ثقافت کا وصف بیان کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں

کہ اس کا سرچشمہ ربانی ہے اس لیے کہ اسلامی ثقافت میں کائنات کا تصور اس کے تمام خصائص

اور بنیادی اصولوں سمیت اللہ ہی سے حاصل کر دہ ہے اور انسان نے اسے ان خصوصیات

سمیت کا ملاؤ ہیں سے حاصل کیا کہ اس سے ہم آہنگ ہو اور اپنی زندگی میں اس کے تقاضوں کو

پورا کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کا اعتقاد ہے کہ جس اللہ نے اس کائنات کو پیدا کیا

اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی سنت پر عمل پیرا ہے اور انسان کی منفعت

کے لیے مسخر کی گئی ہے۔ لیکن اس کائنات میں انسان کا مقام متعین ہو جاتا ہے: ایسا انسان جو اللہ

کی زمین میں اس کا نائب ہے۔

لابتہا کی یہ صفت، مادی ثقافت کی تمام اشکال کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہے ایمان باللہ کی اساس پر قائم ہونے والی ثقافت، اشیاء کے مقاصد اور دروس اصولوں سے غرض رکھتی ہے لیکن مادی ثقافت صرف اشیاء کے اسباب و مظاہر کو مد نظر رکھتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ زندگی ہی سب سے اعلیٰ مسلح نظر اور بہترین مثال نہیں بلکہ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق یہ زندگی ایک ایسا مرحلہ ہے جس سے پوری نیک نیتی اور ثابت قدمی کے ساتھ گزرنا ضروری ہے اس طرح مسلمان اپنی قوت، اقتدار اور سیادت کے اوج پر پہنچ کر بھی اپنے رب پر ایمان رکھنا اور اس کے سامنے سرنگوں رہنا ہے اور تکبر و غرور اس میں سرایت نہیں کرتا جیسا کہ یورپی اقوام کا حال ہے کہ جب اسباب حیات ان کے لیے آسان ہو جاتے ہیں اور فطرت کے عناصر ان کے تابع ہوتے ہیں تو وہ خود فریبی میں مبتلا ہو کر فرعون بن جاتی ہیں۔

**اسلامی ثقافت، مقاصد و مسائل اور علم و ایمان کو یکجا کرتی ہے اس لیے دوس کا وجود دین کے اصولوں پر قائم ہے جو کسی موقع پر عقل و علم سے خالی نہیں ہو سکتے اس لیے اسلامی ثقافت کا عقل و علم پر دار و مدار اور ان کی پندیرانی ایسا مسئلہ ہے جو محتاج بیان نہیں اور ہرگز علم و تہذیب کی جگہ نہیں لے سکتا، نہ ان کا مد مقابل ہے بلکہ یہ تو اپنے چوکھٹے اور محور کے اندر علم و تہذیب کے لیے حدود محور اور اسلوب کار نہیا کرتا ہے اور زندگی کے تمام معاملات کو کٹر وول کرتا ہے۔ یہ طرز فکر صحیح نہیں کہ ہم خداوندی دستور العمل کی ہر بات کو ایک پلڑے میں رکھیں۔ اور مادی دنیا میں انسانی اختراعات کو دوسرے پلڑے میں، اور پھر انسانی تہذیب سے کہیں کہ وہ دونوں میں سے (یعنی زندگی میں خداوندی دستور العمل جس میں ایمان کے سوا کوئی چیز شامل نہ ہو اور انسانی علم و عمل کے وہ ثمرات جو خداوندی دستور العمل سے عاری ہوں) کسی ایک کا انتخاب کر لے۔ معاملے کی نوعیت ہرگز ایسی نہیں جیسا کہ استاد سید قطب نے کہا ہے کیونکہ خداوندی دستور العمل، انسانی اختراعات کا مخالف نہیں بلکہ یہ تو انسان کو ان اختراعات پر اکالے اور صحیح راستے پر ڈالنے والا ہے تاکہ انسان زمین میں خلیقہ بننے کا وہ مقام حاصل کر لے جو اللہ تعالیٰ نے اُسے بخشا، اس کے اختیار میں دیا اور اسے ایسی پوشیدہ طاقتیں عطا کیں جو اس مقام کی ذمہ داریوں سے عمدہ برآ ہونے میں اس کی مددگار ہیں اور کائنات کے لیے قوانین اس کے لیے مسخر کیے جو ان ذمہ داریوں کے پورا کرتے ہیں اس کے عمدہ ہوں اور اس**

کی اپنی ساخت اور کائنات کی ساخت میں ہم آہنگی پیدا کی تاکہ وہ بھر پور زندگی گزار سکے، اس کے کاروبار کو چلا سکے اور اختراعات کر سکے۔ بشرطیکہ خود ایجاد و اختراع اللہ کی عبادت ہو اور خدا کی عطا کردہ گراں بہا نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ ہو اور بشرطیکہ وہ خلافت کے آداب کو ملحوظ رکھے۔ یعنی اس کا عمل و حرکت اس دائرے میں ہو جس سے اللہ تعالیٰ خوش ہو۔

یہ انسانیت کی بدبختی ہے کہ علم کو ایمان سے الگ سمجھا گیا اور فکری اداروں کو اخلاق اور اعلیٰ مقاصد سے الگ کر دیا گیا۔ یورپی اقوام کی شخصیت اپنی آزاد کردہ فوٹوں کے باعث مصیبت میں پڑ گئی اور اپنی ہی ذہانت اور عقربیت کے سحر کی اسیر ہو گئی، لیکن یہ شخصیت خود ساحر کی قائم مقام بن گئی جیسا کہ مالک بن نبی نے کہا ہے:

”اس نے ایسے آلات ایجاد کیے جن پر اُسے کنٹرول نہ رہا اور پھر وہ اس بات

کا عادی ہو گیا کہ یہی آلات، میکانیکی انداز میں خود اسے چلائیں۔ اس کے نتیجے میں زندگی محض اعداد و شمار بن گئی اور خوشحالی کا اندازہ صرف اس بات سے

لگایا جانے لگا کہ کسی کے پاس حراروں اور ہارمون کی کتنی اکائیاں ہیں اور یہ دور کمیت کا دور بن گیا جس میں ضمیر ”شماریات“ کے رجحان کا

غلام بن گیا۔ یہی حال اخلاقیات کا ہوا کہ یہ دور ”اضافی اخلاق“ کا دور قرار پایا اور ”فضیلت مطلقہ“ کا تصور مٹ گیا۔ اس حیثیت سے کہ انصاف کا مفہوم مردہ

ہو گیا۔ شرافت و کرامت کے معنی بھی مسخ ہو گئے جیسا کہ ایک یورپی نے کہا: ”وہ ظالم حکومت جو مساوات کی ضمانت دے، عادلانہ نظام سے بہتر ہے“ اور اقتصاد

زندگی کا چین یہ ہو گیا کہ آج ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو بڑے دھڑلے سے یہ بات کہتے ہیں کہ تجارت، سرقہ و حلال ہے“

اس کائنات کے خالق اور چارہ ساز، اور ہر چھوٹی بڑی چیز اور دلوں کے امرار سے واقف، اللہ سے تعلق رکھنے والے ضمیر انسان کے سرچشموں پر وار و مدار کی بدولت، اسلامی ثقافت کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اس قسم کے نتائج کی اجازت دے یا ان کی حوصلہ افزائی کرے اور اس میں یہ لازمی ہے کہ اخلاق مطلقہ اور اعلیٰ مثالیہ، ہی حرکت و عمل اور کامیابی کا پیمانہ ہوں۔ یہ صورت حال جو ہم نے بیان کی اور حضرت عمر بن الخطابؓ کی اپنے کسی سردارِ حبش کو نصیحت

بہت مشابہ ہیں۔ آپ نے فرمایا:

”اپنے لشکروں کو معصیت سے دور رکھو، کیونکہ لشکر کے گناہ، ان کے دشمن سے زیادہ ہیں تاکہ ہیں۔ اگر ہم دشمن پر اپنے حسن اخلاق سے فتح نہ پاسکے تو اسے اپنی طاقت سے مغلوب نہیں کر سکیں گے۔“

اسلامی ثقافت کا مطلوب و مقصود انسانیت ہے اور اس کا مطمح نظر اور پیغام ساری دنیا کے لیے ہے۔ یہ تمام انسانوں کو ایک ہی پیمانے سے ناپتی ہے جس میں قومیت، نسل پرستی، جنس یا رنگ میں سے کوئی چیز فتور پیدا نہیں کرتی۔ ظاہر ہے کہ یہ رجحان قرآن کریم کا پیدا کردہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ سب لوگ۔ مرد و عورت۔ نفس واحدہ سے پیدا کیے گئے۔ اسلامی ثقافت میں سب نوع انسان دین کے رشتے سے باہم مربوط ہیں اسی سے انسان عزت پاتا یا ذلیل ہوتا ہے۔

”اس معنی میں وطن ایک ایسا گھر ہے جسے خدا کا عطا کردہ دین اور دستور عمل اور شریعت منظم کرنے ہیں، اور نسل پرستی، دین یا زندگی کا دستور نہیں بن سکتی، کیونکہ خاندان، قوم، نسل، رنگ اور سر زمین کی عصبیت، بہت حقیر عصبیت ہے جو پیمانہ زندگی کی علامت ہے۔ یہ جاہلیت کی وہ عصبیت ہے جس سے انسانیت اپنے روحانی انحطاط کے دور میں شناسا نہتی۔“

اپنی ذات، اہل و عیال، قوم، خاندان، شہر، وطن، امت، انسانیت، انسانی اور قومی ہیرو محض اس لیے اعلیٰ قدر قیمت کے حامل اور بلند یا یہ مقصد بنتے کے اہل نہیں کہ صدیوں تک اور نسل ہا نسل لوگ ان کے نام پر جمع ہوتے رہیں یا انسان ہمیشہ انہی کی طرف رجوع کرے اور نہ یہ اعلیٰ نصب العین ہیں کہ انسانیت مسلسل ان کا قصد کرتی رہے۔۔۔۔۔ اسلامی ثقافت کے نزدیک صرف اللہ تعالیٰ ہی غایت و صومئ، دائمی قدر اور اعلیٰ ہدف ہے جس کی پہنائیوں میں انسانیت کو ایسے افراد اور جماعتیں مل سکتی ہیں جن سے خیر، حتیٰ عدل اور قوت حاصل ہوتی رہے۔

انسل پرستانہ اور تعصب پر مبنی ثقافتوں کے بارے میں، ان کے ایک بڑے مفکر کی بات سننے کے لائق ہے۔ (فرانسیسی مفکر) رینان کہتا ہے:

”ایک ہی نسل ایسی ہے جو لیڈر اور ہیرو پیدا کرتی ہے اور وہ پوری نسل ہے۔ اگر اس نسل کو ایسے ماحول اور منافات میں کام کرنا پڑے جن میں جیشی یا چینی کام کرتے ہیں تو یہ بغاوت کر دے گی اور ہمارے ملک میں ہر انقلابی ایسا ہیرو ہے جسے وہ سازگار مواقع میسر نہ آسکے جن کے لیے وہ پیدا ہوا۔ وہ ایسا انسان جس کی تقدیر میں ہیرو بننا لکھا تھا، لیکن ایسے ایسے کام کرنا پڑے جو اس کی نسلی خصوصیات کے مطابق نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ طرز زندگی جس کے خلاف ہمارے کارکن بغاوت کرتے ہیں، چینی یا کسان یا ایسا شخص جو ہمارے رنگ ڈھنگ سے مختلف ہے، اسے اپنالیتا ہے اور خوشحال زندگی گزار سکتا ہے“

انسانی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھنے کی وجہ سے تمام قوموں کے ذہین اور قابل انسان اسلامی ثقافت کے حلقہ بگوش ہو گئے اور اب اسلامی ثقافت اس پر ناز کر سکتی ہے کہ اس کے دامن میں ہر قوم کے ذہین افراد ہیں جنہوں نے اس کی سر بفلک عمارت تعمیر کی ہے۔ اسلامی ثقافت کا طرہ امتیاز، اس کی جامعیت اور توازن ہے۔ جامعیت، فطرت اور انسانیت کے تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھتی ہے اور ان میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح یہ نسل انسانی کے تمام احوال اور ان احوال کے متوازن رہنے کو بھی ملحوظ رکھتی ہے۔ اسلامی ثقافت کی اس جامعیت کی اساس، اسلام پر اعتماد و انحصار ہے اور اسلام اسلوب زندگی ہے۔

”انسان کی حقیقی زندگی کے تمام عناصر سمیت ایک اسلوب جو اس دینی تصور پر محیط ہے جس میں کائنات کی فطرت کی تفسیر موجود ہے اور جس طرح وہ انسانی ہستی کی غرض و غایت متعین کرتا ہے، اسی طرح کائنات میں انسان کے مرتبہ و مقام کی بھی نشاندہی کرتا ہے اور یہ اسلوب زندگی ان تمام حقیقی نظاموں پر محیط ہے جو اسلام کے دینی تصور سے بھونٹتے ہیں اور اسی سے بقایا تے ہیں اور انسانی زندگی میں پوری مثالی شکل میں نظر آتے ہیں، مثلاً اس کی شاخیں اخلاقی نظام اور وہ بنیادیں جن پر یہ قائم ہے اور وہ قوت نافذہ جو اس کی

مدد و معاون ہے اور سیاسی نظام اور اس کی مختلف صورتیں اور خصوصیات اور اجتماعی نظام اور اس کی اساس اور بنیادی اصول اور اقتصادی نظام اور اس کا فلسفہ اور اس کی تنظیمیں اور صورتیں بین الاقوامی نظام اور اس کے تعلقات و روابط۔<sup>۱۱</sup>

سب اس میں شامل ہیں۔  
اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اسلامی ثقافت کی ہمہ گیری اس کی اہم خصوصیت ہے جس نے اُسے تمام دیگر افکار کے مقابل جاندار، قوت مزاحمت عطا کی ہے اسلامی ثقافت، اپنے ابتدائی دور اور ظہور کے وقت ایک غالب قوت تھی، مگر کئی صدیاں گزرنے کے بعد بھی یہ ٹھوس اور مضبوط طاقت رہی۔ اس مضبوط طاقت اور غالب قوت ہوتے کا سبب یقیناً وہی ہے جو العقائد نے بیان کیا ہے کہ:

”اس میں قوتِ مدافعت تھی جس کی وجہ سے اپنے دفاع پر قادر تھی حالانکہ وقت مبارزت اس کے پاس غالب آنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ اسلامی طاقت کی بوقت ضعف بھی، مقابلے میں ویسی ہی تو اٹائی اور ثابت قدمی جیسی طاقت ور ہونے کی حالت میں کامرانی عجیب سی بات ہے۔ بالخصوص یہ بات

کہ دس صدیاں گزرنے پر بھی برقرار تھی۔ اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال میں اس عقیدے کی ہمہ گیری، اسلامی ثقافت کی خاص صفت ہے اور یہی صفت انسان کو باور کراتی ہے کہ وہ ایک جامع کُل ہے جس سے وہ عقائد کے اس فساد و نزاع سے محفوظ ہو جاتا ہے جو دل و دماغ کو دو نیم کر دیتا ہے۔

اسلامی ثقافت کی صفات میں سے ایک ممتاز صفت یہ ہے کہ وہ انسانی دائرہ کار کی حد تک، انسان کے لیے کائنات اور زندگی کے باہمی ربط میں مثبت روش چاہتی ہے اور یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ اسلام کے بنیادی اصول محض بند و قیود اور ایسے ضابطوں پر مشتمل نہیں جو پابندیاں عائد کرتے ہوں بلکہ بنیادی طور پر یہ ایک تعمیری قوت اور مسلسل پیش قدمی پر اگسنے والی تحریک ہے۔ اس کے علاوہ یہ اس قوت محرکہ کو پوری طرح بڑے کا لانے اور اس حرکت کے ذریعے اپنی تحصیل ذات کا ذریعہ ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ پاکیزہ طریقے

سے طے پاتا ہے، کیونکہ اسلامی ثقافت میں عمل اور مثبت رویہ اخلاقی صورتیں۔ ان کے بے عملی اور منفی رویہ غیر اخلاقی صورتیں ہیں کیونکہ وہ انسانی زندگی کے اس مقصد کی نفی کرتی ہیں جسے اسلام نے پیش کیا ہے۔ یعنی یہ کہ انسان خدا کی زمین میں اس کا خلیق ہے اور اس کا فرض ہے کہ زمین میں پائی جانے والی تمام قوتوں اور طاقتوں کو، جنہیں خدا نے انسان کے لیے مسخر کیا ہے تعمیر و ترقی میں استعمال کرے۔<sup>۳۶</sup>

چونکہ اسلامی ثقافت عقل پر قائم ہے اور اس کی مخالفت نہیں کرتی، اس لیے یہ عقل کے لیے نئے اور وسیع افق مہیا کرتی ہے۔ اور رنگارنگ مگر میان تلاش کرتی رہتی ہے۔ سموات وارض کا مالک بننے کے لیے قرآن نے عقل کو مخاطب کیا ہے اور کائنات کی لامتناہی وسعتوں میں غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ یعنی اس کے لیے شمار ستارے و قمر اور نجوم و افلاک کی طرف بلایا ہے:

”نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو جا بکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور

سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں“ (یس: ۴۰)

اور اس کے بادلوں اور بارش کی طرف توجہ دلائی ہے:

”کیا تجھے یہ علم نہیں کہ اللہ بادل کو چلاتا رہتا ہے، پھر اس کو باہم ملا دیتا ہے۔ پھر اس

کو تہہ در تہہ کر دیتا ہے۔ پھر تو دیکھتا ہے بارش کو کہ وہ اس سے بیج سے نکل کر

آتی ہے.....“ (النور: ۴۳)

اور اس کے پانیوں اور چشموں اور رنگارنگ کھیتوں اور ان کے نشور و نما کے مراحل کا ذکر کیا ہے

”یہ تو نے اس پر نظر نہیں کی کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر اسے زمین کے

سوتوں میں داخل کر دیا، پھر وہ اس کے ذریعے سے کھیتیاں پیدا کرتا ہے جس کی

مختلف قسمیں ہیں۔ پھر وہ کھیتی خشک ہو جاتی ہے۔ سو تو اس کو زرد دیکھتا ہے پھر

وہ اس کو چورا چورا کر دیتا ہے.....“ (الزمر: ۲۱)

اس کے سمندروں جو گردار ہیں، اور اس کے اندر مچھلیوں وغیرہ اور سمندروں کی وسعت اور

حرکت کی طرف متوجہ کیا۔

”اور وہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ اور



تاکہ تم اس میں سے زیور نکالو جسے تم پہنتے ہو، اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ اس میں  
پانی چیرتی ہوئی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اللہ کے فضل سے تلاش کرتے رہو اور تاکہ تم  
اس کا شکر ادا کرتے رہو۔“ (النمل: ۱۴)

اور دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے پہاڑوں پر اور دریاؤں پر اور راہوں پر غور کرنے  
کو فرمایا :

”اور اس نے زمین پر پہاڑ رکھ دیئے ہیں تاکہ وہ تم کو لے کر لوگھانے لگے اور دریا  
اور راستے (بشاریئے) تاکہ تم راہ پاتے رہو۔“ (النمل: ۱۵)

## حواشی

- ۱- سید قطب: خصائص التصور الاسلامی، ص: ۸۶
- ۲- سید قطب: معالم فی الطريق، ص: ۱۲۳
- ۳- ابو الحسن ندوی: "ماد آخر العالم یا تحطاط المسلمین" ص: ۶۸
- ۴- محمد المبارک، نظام الاسلام، ص ۴۳
- ۵- محمد المبارک: "نظام الاسلام" (بحث "اللہ") اور عباس محمود عقاد: "الفلسفۃ القرآنیہ" (بحث "اللا")
- ۶- "المحقق"، ص ۳۳-۳۴
- ۷- "اللہ"، ص ۱۸۸ اور سید قطب: "خصائص التصور الاسلامی" ص ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳
- ۸- وہ مسلمان فلسفی جو حقائق تک دلائل سے نہیں، بلکہ تکریر نفس کے ذریعے پہنچتے ہیں (ترجمہ)
- ۹- قاضی عبدالجبار اہمذانی: "تبئیت دلائل النبوة" تحقیق ڈاکٹر عبدالکریم عثمان: مقدمہ ص: ۱
- ۱۰- عباس محمود العقاد: "الفلسفۃ القرآنیہ" ص: ۱۰۱
- ۱۱- سید قطب: "خصائص تصور الاسلامی" ص ۳۳، ۳۴ اور ترجمہ "اسلامی نظریے کی خصوصیات و اصول" از سید شبیر احمد ص ۲۸۹-۲۹۰۔ اس کے علاوہ، دیکھئے آیات قرآنی: الاعراف، ۵۴، آل عمران: ۲۶-۲۷، الانعام: ۱۸، الرعد: ۸-۱۳، الانعام: ۱۷، الشوری: ۵۳-۵۴، الزمر: ۳۳، المجادلہ: ۷۔
- ۱۲- احمد امین: "مخیر الاسلام" ص ۷۲
- ۱۳- مقدمہ کتاب العلم بدعوہ لا ایمان: ترجمہ الاستاذ الفلکی، اور پیش کش الاستاذ الباقوری
- ۱۴- مقدمہ کتاب العلم بدعوہ لا ایمان۔
- ۱۵- مبارکی الاسلام، ص ۲۲

۱۶۔ عباس محمود العقاد: التفکیر فریضۃ اسلامیۃ۔

۱۷۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات میں سے جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے، واقعہ معراج ہے۔ شقِ قمر سے جو آسمانی ذرہ ہے جسے بے شمار لوگوں نے دیکھا۔ لشکرِ اعداء پر فتحِ کامل ہے حالانکہ اس وقت آپ کے پیروکار کم تھے میں کم تھے۔ کفارِ مکہ کے مقابلے میں دستگیریِ حالانکہ حضورؐ کے مادی وسائل بے حد محدود تھے۔ فارس و روم کی سلطنتوں کا خاتمہ ہے اور لوگوں سے حضورؐ کی حفاظت اور حمایت کا وعدہ ہے۔

۱۸۔ محمد ابو زہرہ: "المجمع الاسلامی فی ظلال الاسلام" ص ۲۲

۱۹۔ سید سلیمان ندوی: الرسالة المحمدیہ، اور سید ابوالاعلیٰ مودودی: مبادی الاسلام۔

۲۰۔ حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضا داری

آنچه خوباں ہمہ دارند تو تنها داری

۲۱۔ قاموس محیط میں ہے: "حق" اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات میں سے ہے اور قرآن،

ضد باطل، امر واقع اور اسلام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

۲۲۔ باطل دوئی پسند ہے، حق لا شریک ہے

شریکت میا نہ حق و باطل نہ کر قبول (اقبال)

۲۳۔ حریت اور مذہبی رواداری کی مثالوں میں سے ایک مثال یہ ہے کہ نجران کے عیسائیوں

کا ایک وفد نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضورؐ نے انہیں مسجد میں بٹھرایا اور وہیں اپنی

عبادت کی اجازت دے دی۔ چنانچہ انہوں نے مسجد کے ایک کونے میں اور رسول اللہؐ اور

مسلمانوں نے دوسرے کونے میں نماز ادا کی۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ مصر کی

ایک عیسائی عورت نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ عمرو بن العاصؓ نے اس کا گھر مسجد

میں شامل کر لیا ہے۔ جب عمرو بن العاصؓ سے جواب طلبی ہوئی تو انہوں نے خلیفہ کو لکھا کہ

اس گھر کے بدلے میں اس عورت کو کئی گنا معاوضہ پیش کیا گیا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا

تو یہ رقم بیت المال میں رکھوا دی گئی اور گھر کو گرانے کا حکم دے دیا۔ لیکن خلیفہ عادل حضرت

عمرؓ نے اسے پسند نہ فرمایا اور حکم دیا کہ مسجد میں کیے گئے ارضانے کو گرا دیا جائے۔

۲۴۔ دوسرے مذاہب سے اسلام کا موقف مختلف ہونے کی تاہم یہ بات پیش کرنے میں

کہ ابتدائی دور کے مسلمانوں نے خلفاء کے عہد میں نصاریٰ اور یہود کے اہل علم کے احترام میں کوئی کمی نہ کی، بلکہ ان میں کئی اعلیٰ مراتب تک پہنچے اور حکومت کے اہم مناصب حاصل کیے یہاں تک کہ ہارون الرشید نے تمام مدارس ایک عیسائی خانین ماسوریہ کی نگرانی میں دے دیئے۔

۲۵۔ انجیل: پولس کا خط اہل افسس کے نام: ”اے غلامو! جو جسم کی رو سے تمہارے مالک ہیں۔ اپنی صاف دلی سے ڈرتے اور کانپتے ہوئے ان کے ایسے فرمانبردار رہو جیسے مسیح کے اور آدمیوں کے خوش کرنے والوں کی طرح دکھاوے کے لیے خدمت نہ کرو بلکہ مسیح کے بندے کی طرح دل سے خدا کی مرضی پوری کرو اور اس خدمت کو آدمیوں کی نہیں بلکہ خداوند کی جان کر جی سے کرو۔ کیونکہ تم جانتے ہو جو کوئی جیسا اچھا کام کرے گا خواہ غلام ہو خواہ آزاد خداوند سے ویسا ہی پائے گا۔“ (نیا عہد نامہ، اردو، ۱۹۷۵ء)

عہد نامہ قدیم کتاب استثناء، باب ۲۰: ”جب تو کسی شہر سے جنگ کرنے کو اس کے نزدیک پہنچے اُسے صلح کا پیغام دینا اور اگر وہ تجھ کو صلح کا جواب دے اور اپنے پھانک تیرے لیے کھول دے تو وہاں کے سب باشندے تیرے باجگزار (غلام) بن کر تیری خدمت کریں، اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے لڑتا چاہے تو تو اس کا محاصرہ کرنا اور جب خداوند تیرا خدا اُسے تیرے قبضے میں کر دے تو وہاں کے ہر مرد کو تلوار سے قتل کر ڈالنا لیکن عورتوں اور بال بچوں اور چوپائیوں اور اس شہر کے سب مال اور لوٹ کو اپنے لیے رکھ لینا اور تو اپنے دشمنوں کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھ کو دی ہو کھانا۔ ان سب شہروں کا بھی حال کرنا جو تجھ سے بہت دور ہیں اور ان قوموں کے شہر نہیں ہیں پھر ان قوموں کے شہروں میں جن کو خداوند تیرا خدا امیراٹ کے طور پر تجھ کو دیتا ہے۔ کسی ذی نفس کو جیتا نہ بچا رکھتا بلکہ تو ان کو..... جیسا خداوند تیرے خدا نے تجھ کو حکم دیا ہے بالکل بیست و ناپوکر دینا.....“ (اردو ایڈیشن ۱۹۸۱ء)

عہد نامہ قدیم: کتاب استثناء، باب ۱۳۔ ”..... تو تو اس شہر کے باشندوں

کو تلوار سے ضرور قتل کر ڈالنا اور وہاں کا سب کچھ اور جو پائے وغیرہ تلوار ہی سے  
نیست و نابود کر دینا اور یہاں کی ساری لوٹ کو تنکا تنکا خداوند اپنے خدا  
کے حضور آگ سے جلا دینا اور وہ ہمیشہ کو ایک ڈھیر سا پڑا رہے اور پھر کبھی نہ  
بنایا جائے.....“ (اردو ایڈیشن ۱۹۸۱ء)

۲۶۔ اس موضوع سے کئی معاصر مسلم مفکرین نے بحث کی ہے۔ اس کے مکمل احاطے کے لیے  
دیکھیے :

الاستناذ عباس محمود العقاد : حقائق الاسلام  
الاکتوز علی عبد الواحد : حقوق الانسان فی الاسلام  
الاستناذ محمد قطب : شبهات حول الاسلام

۲۷۔ سید قطب : ”العدالة الاجتماعية فی الاسلام“

۲۸۔ بعض کتب سیر میں آیا ہے کہ نبی کریمؐ ولید بن مغیرہ سے مصروف گفتگو تھے کہ ابن ام  
کتوم خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے انہیں چند منٹ انتظار کرنے کو کہا تاکہ ولید  
سے بات مکمل کر لیں (اور یہ صورت حال ہر شخص کو پیش آسکتی ہے) لیکن اللہ تعالیٰ کو  
رسولؐ کی یہ ”بے رنجی“ بھی پسند نہ آئی۔ اسے حضورؐ کے ”ضعف بشری“ یا ”توجہ ہٹا کر  
دوسری طرف کرنے“ یا ”امیر و عزیز کے مابین امتیاز“ کی بنیاد دینا نا داستان طرازی  
ہے۔ (متزجم)

۲۹۔ ایس بن سلیم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں: ”حضرت عمرؓ بن الخطاب بازار  
سے گزرے اور ہاتھ میں کوڑا تھا آپؓ نے مجھے اس سے مارا جو میرے لباس کے  
کنارے سے لگا۔ آپؓ نے مجھ سے کہا: ”راستے سے ہرٹ جاؤ“ جب اگلا برس  
آیا تو آپؓ مجھ سے ملے اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور مجھے سو درہم عنایت  
کیے اور کہا: ”انہیں حج کے لیے کام میں لاؤ اور یہ جان لو کہ یہ اس ضرب کے  
بدلے میں ہے جو میں نے تمہیں رسید کی تھی۔“ میں نے کہا: ”اے امیر المؤمنینؓ!  
مجھے تو وہ یاد بھی نہیں۔ کہا: اور میں نے اسے بھلایا نہیں!“

۳۰۔ سید قطب : المستقبل لهذا الدین۔

- ۳۱۔ مالک بن نبی: وجهة العالم الاسلامی  
 ۳۲۔ سید قطب: معالم فی الطریق  
 ۳۳۔ مالک بن نبی: وجهة العالم الاسلامی  
 ۳۴۔ سید قطب: المستقبل لهذا الدین  
 ۳۵۔ عباس محمود العقاد: الاسلام فی القرن العشرين  
 ۳۶۔ سید قطب: المستقبل لهذا الدین۔

## اسلام اور عصر حاضر کے تیسلیں

ماضی و حال میں اسلامی ثقافت کو بے شمار چیلنج درپیش رہے ہیں۔ ان میں سے بعض چیلنج ایسے ہیں جن پر ایک رواں نظر ڈالنے سے شاید ان کی حقیقت بھی واضح ہو جائے اور اس طریق کار کا اندازہ بھی ہو جائے جو اسلامی ثقافت کے اصل ماخذ اور مستقل کردار کو برقرار رکھتے ہوئے مفکرین اسلام نے ان کا مقابلہ کرتے کے لیے اختیار کیا۔

اموی دور کے اواخر، اور عباسی دور کے اوائل میں، جب فتوحات اسلامیہ کے نتیجے میں اور حکومت کے مستحکم ہونے اور امن و سکون کی راہ پر گامزن ہونے کے باعث مسلمان دنیا کی دوسری قوموں سے گھلے ملے تو الحاد و زندقہ اور تشکیک نے فکر اسلامی کی صفت خاص یعنی عقیدہ توحید پر حملے شروع کر دیئے ان حملوں کی کئی صورتیں تھیں لیکن عموماً ان معاملات پر بحث کی جاتی تھی جن میں عقل انسانی محدود ہونے کے باعث اور مناسب فکری ذرائع مہیا نہ ہونے کے سبب کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھی۔ ان کا ہدف یہ تھا کہ پہلے شک و شبہ پیدا کیا جائے اور پھر فکر اسلامی کی عمارت کو تباہ کر دیا جائے۔

اس طرح لوگ ان بحثوں میں پڑ گئے جنہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور قدیم مسلمان قابل اعتناء نہ سمجھتے تھے اب لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات و افعال پر غور و خوض کرتے لگے۔ احکام شریعت اور ان کی حقیقت اور اسباب و نتائج کی بحث میں پڑ گئے اور قضا و قدر، جنت و دوزخ اور صراطِ مستقیم وغیرہ پر اپنے اپنے عقلی دلائل پیش کرنے لگے اور اس کے باوجود مخالفین کی زور سے قاصر رہے۔

اس کے نتیجے میں ایک مستقل علم وجود میں آیا جو علم الکلام (یا بعض کے نزدیک، علم التوحید) کہلایا، اور اس علم میں کئی ایسے مباحث شامل ہو گئے جو اسلام اور اس کے عقائد کے دفاع کے لیے اہم تھے۔ سنگین۔ اس کے علاوہ عقائد کے لحاظ سے متعدد فرقے پیدا ہو گئے اور مباحثہ و مناظرہ اس فن کے مالکوں پر حاوی ہو گیا۔ چنانچہ بحث و مباحثہ بجائے خود مقصد و ہدف بن گیا۔ حالات تک یہ بیان حتیٰ اور دفاع حتیٰ کا ایک طریقہ تھا۔ اس کے علاوہ علم کلام کی تاسیس خود اپنی ذات میں کوئی ایسا اہم کام نہ تھا، کیونکہ ظہور اسلام کے ساتھ ہی ایسے کئی علوم وجود میں آچکے تھے جو اس کے مزاج کے مطابق تھے اور پھر یہ کہ اس علم کے بیشتر حاملین نے اس بنیادی مقصد سے انحراف کیا جس کے لیے یہ علم وجود میں آیا تھا۔ اور اس کی وجہ سے کئی مفکرین اسلام (جن میں حدیث و فقہ کے بلند پایہ آئمہ، مثلاً امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ، امام ابن حنبلؒ، امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ وغیرہ شامل تھے) اس میں اس حد تک غور و خوض سے متنع کرتے تھے جس گہرائی تک منکلبین جا پہنچے تھے، اور اسلامی ثقافت کے صاف سنہرے سرچشمے کی طرف لوٹنے اور قرآن و حدیث میں وارد عقاید پر اکتفا کرنے اور ان معاملات میں صحابہ کرامؓ کے موقف پر انحصار کرنے کا مشورہ اور دعوت دیتے رہے۔ اس بارے میں تقریبی کا قول بہت عمدہ ہے:

”جو شخص حدیث نبویؐ کے مجموعوں اور سلف کے حالات کا دقت نظر سے مطالعہ کرے گا تو اسے یہ بات بخوبی نظر آجائے گی کہ کسی صحیح یا غیر صحیح طریقہ روایت سے بھی یہ مردی نہیں کہ صحابہ کرامؓ باوجود بیکہ ان کے طبقات مختلف اور تعداد کثیر تھی نے کبھی رسول کریمؐ سے ان باتوں کے مفہوم کے بارے میں سوال کیا ہو جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یا اپنے نبیؐ کی زبان سے، اپنی ذات پاک کے متعلق بیان کی ہیں، بلکہ وہ اس کا مفہوم سمجھتے اور صفات الہی کے بارے میں بات کرنے سے گریز کرتے تھے۔ یقیناً ان میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہ تھا کہ فلاں صفت ذاتی ہے اور فلاں صفت فعلی، بلکہ انہوں نے تسلیم کیا کہ علم، قدرت، حیات، ارادہ، سمع و بصر، کلام، جلال، اکرام، جود و انعام اور عزت و عظمت اللہ تعالیٰ کی صفات ازلی ہیں اور اسی طرح قابل تسلیم ہیں جس طرح وارد ہوئی ہیں۔ ان کے پاس کتاب اللہ کے سوا کوئی اور چیز نہ تھی جس سے اللہ تعالیٰ



کی وحدانیت اور نبوتِ محمدی کے اثبات پر اسندلال لاتے اور نہ ان میں سے کوئی علم کلام کے اسالیب یا فلسفیانہ مسائل سے آگاہ تھا۔

پچ تو یہ ہے کہ اس وقت جب مفکرین نے فکر کی صحیح راہ سے انحراف اختیار کر لیا تھا اور متکلمین مختلف راستوں پر چل کر راہِ حق سے بھٹک گئے تھے اور اصل سرچشمے اور اپنے بے مثال افکار سے دور ہو گئے تھے، ابن حنبلؒ، غزالیؒ اور ابن تیمیہؒ جیسے ائمہ کا معاملات کو اصل حالت کی طرف لوٹانے میں بڑا ہاتھ تھا۔ اگرچہ ان کا طریقہ کار الگ الگ تھا۔ امام ابن حنبلؒ نے حکومت کی سختی، ظلم اور جبر برداشت کیا۔ امام غزالیؒ نے خود اہل کلام کے عقلی اور منطقی اسلوبوں کو علم کلام کے موجدوں کے مقاصد پر سے کرنے سے قاصر رہنے اور حقائق کی وضاحت سے عاجز رہنے کی تشریح کی خاطر استعمال کیا اور امام ابن تیمیہؒ نے قرآنِ کریم اور حدیثِ نبویؐ سے حجت کو خود ہدف تک پہنچنے کی بنیاد بنایا۔ اسلامی ثقافت کے لیے ایک اور چیلنج، یونانی افکار کا حملہ تھا۔ جب مسلمانوں نے یونانی فلسفیوں کے پیش کردہ نظریات کے بیشتر حصے کا ترجمہ کیا بالخصوص ان کے مشہور فلسفیوں، افلاطون، ارسطو، افلوپین وغیرہ کے افکار، جن کی کتابیں مسلمانوں میں مروج ہو گئیں اور بہت سوں نے انہیں پسند کیا اور اس سے گہرا اثر لیا اور اس موضوع پر کتابیں تصنیف کیں۔ عباسی دور میں یونانی فلسفے کی تعلیم ہم عصر تہذیب کا ایک جزو بن گئی اور سنی ایسے لوگ فارغ التحصیل ہو گئے جو اس فلسفے میں ڈوبے ہوئے تھے اور فکرِ صحیح کی جگہ اسے لانے کی دعوت دیتے تھے۔ ان میں الفارابی، ابن سینا، ابن رشد، ابن طفیل وغیرہ شامل ہیں۔ اس نودار فلسفے کی وبا کی لہر اتنی شدید تھی کہ فکرِ اسلامی کے ایسے بڑے بڑے لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے جو یونانی فلسفے کے نقائص، اسلامی مثالیہ اقدار اور صحیح اسلامی فکر کے اسلوب سے اس کے اختلافات بیان کرنے میں پیش پیش تھے۔ اسلامی ثقافت کی آغوش تو پوری دنیا کے لیے کشادہ تھی، اور کہیں سے بھی ملے حکمت و دانش سے استفادہ کرتی تھی، مگر صحیح ثقافت ہونے کے باعث یہ ہر حاصل کی جانے والی یا قابل استفادہ چیز کو اپنے بنیادی اصولوں یا مثنایوں کی کسوٹی پر پرکھتی تھی اور کسی ایسی روش کو برداشت کرنے پر آمادہ نہ تھی جو اس کی بنیادوں کو منہدم کر دے یا اس کے تشخص کو مسخ کر دے۔ اس میں کوئی شک کہ یونانی ثقافت، زندگی، کائنات اور وجود کے معاملات میں اسلامی ثقافت کے

نظریات سے مختلف تھی، کیونکہ یہ مجرور فلسفیانہ ثقافت تھی اور ایمان باللہ اور وحی کو علم کی بنیاد قرار نہیں دیتی تھی۔ ان میں سے جو فلسفی "الہیئن" کہلائے وہ بھی اللہ پر ایمان نہیں رکھتے تھے جس طرح مسلمان ایسے رب خالق پر ایمان رکھتا ہے جو تمام امور دنیا کا مدبّر بھی ہے۔ ان کی اکثریت یہ اعتقاد رکھتی تھی کہ اللہ مثالوں میں سے ایک مثالیہ ہے۔ اگرچہ ان سے بلند مرتبہ ہے۔ بعینہ جس طرح وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ کائنات اُس سے اُسی طرح ظہور پذیر ہوئی جس طرح سورج سے حرارت یا چاند سے روشنی اور ان کی رائے میں وہ خالق، پاکائت کے امور کا مدبّر نہیں کیونکہ اس نے بس اتنا کیا کہ کائنات کو چلا کر چھوڑ دیا۔ اس کے نتیجے میں یہ لوگ حساب کتاب، ثواب و عذاب پر بھی ایمان نہیں رکھتے بلکہ تاسخ ارواح یا اوگون سے ملتا جلتا عقیدہ رکھتے ہیں جس کی مثال مشرق کے مذاہب میں پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یونانی فلسفہ اشیاء کے بارے میں حسی اور مادی نظریہ رکھتا ہے اور ان میں سے بیشتر کے نزدیک "سعادت" اس زندگی ہی میں ممکن ہے، اس کے بعد نہیں۔

اسی باعث اس فلسفے کا فکر اسلامی میں نمایاں مقام حاصل کرنا، نہ صرف بہت بڑا واقعہ تھا بلکہ تمام مسائل و احکام کی تعبیر کے لیے وہ مثالی ذریعہ قرار پایا گیا۔ کئی لوگ جو اپنے آپ کو "فلاسفہ اسلام" کہتے تھے، لیکن یونانی فلسفے سے متاثر تھے۔ ان کی غفلت کا یہ عالم تھا وہ یونانی فلسفے کو من و عن نقل کرتے تھے اور اس کی جو صورت یونان میں معروف تھی وہی پھر بنا ڈالی اور فکر جدید کے مطابق کوئی تبدیلی نہ کی یہاں تک کہ ان کی تصنیفات اُسی کا چہرہ اور نقل نظر آتے لگیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ حقیقی اسلامی ثقافت کے حانی اس نئے محاذ پر ڈٹ گئے تاکہ فکر اسلامی کو اس کی پاکیزگی لوٹائی جاسکے۔

امام عزالی، امام ابن تیمیہ نے صحیح اسلامی ثقافت کے دفاع میں بہت بڑا جہاد کیا۔ امام عزالی نے اپنی مشہور کتاب "تہافت الفلاسفہ میں یونانی فلسفے کے بیشتر نظریات اور ان کے اصولوں کو نظر انداز کر دیا اور اس کی بے وقعتی اور گمراہی واضح کی اور اسے حقیقی اسلامی ثقافت کے خلاف ثابت کیا۔ اسلامی مشترکہ ممالک میں اس کتاب کو یونانی فلسفے کے لیے کمر شکن تسلیم کیا جاتا ہے کیونکہ اس کی جگہ لینے والی اس سے بہتر کتاب کوئی اور نہیں اور اس میں کوئی تعجب نہیں کیونکہ امام عزالی نے یونانی فلسفے کے اہم مصادر کا مطالعہ کیا اور اس بارے

میں ایک اور کتاب لکھی جس کا نام "مقاصد الفلاسفہ" ہے۔ یونانی فلسفے کے مختلف مکاتب فکر کے بیان میں یہ کتاب بے مثال ہے اور اس میں خود یونانی فلسفیوں کا بھی احوال ہے۔ جہاں تک امام ابن تیمیہ کا تعلق ہے تو ان کے رسائل، مقالات اور لیکچروں میں یونانی فلسفے اور فلسفیوں سے کامیاب مناظرے ہیں، لیکن ان کی سب تحریریں ایک طرف اور ان کی کتاب "الرد علی المنطقتین" یا "نقض المنطق" دوسری طرف، جس کا جواب نہیں۔ یوں سمجھیے کہ جہاں "تہافت الفلاسفہ" نے فلسفہ یونان کی کمر توڑ دی، اس کتاب نے یونانی نظریات کے اسلوب اور تعلیم، بحث و تنقید اور مناظرے میں اس کی منطق کے اصولوں کو پارہ پارہ کر دیا۔ ان کی بدولت فکر اسلامی اپنی اصلی حالت اور انفرادیت کی طرف لوٹ آیا۔

لیکن چیلنج تو مسلسل ہیں اور آڈینزیشن جاری ہے۔ سوائے اس کے کہ مقابلے کے حالات بدلتے رہتے ہیں، اور وہ طریقے جو اسلامی ثقافت اپنے مخالفوں کا مقابلہ کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے وہ بھی تبدیل ہونے رہتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت اسلامی ثقافت کو مغربی تہذیب اور اس سے جنم لینے والی دوسری ثقافتوں اور فکری و مذہبی میلانات کے چیلنج کا سامنا ہے۔ یہ بھی نظر آتا ہے کہ اسلامی ثقافت اپنے طریق کار میں، اور ان معاملات میں، جن میں وہ اچھی ہوئی ہے تبدیلی پیدا کرنے پر مجبور ہو جائے گی، تاکہ اپنی الگ حیثیت اور دنیا پر اپنے دائمی اثرات برقرار رکھ سکے۔ اب اس موضوع کا تذکرہ جو لوگوں کے ذہنوں سے نکل چکا ہے اور ان کی زندگیوں پر اثر انداز نہیں، کسی طرح درست نہیں۔ اسی طرح اس طریق کار کا ذکر بھی مناسب نہیں جو پسندیدہ اور دلچسپ نہیں رہا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس بات کی تائید میں ہندوستان میں فکر اسلامی کے چوٹی کے دو علماء کی رائے پیش کریں جن کے اسمائے گرامی شیخ محمد علی مونگیری، اور علامہ شبلی نعمانی ہیں۔

محمد علی مونگیری اسلامی ثقافت کو درپیش چیلنج کے بارے میں کہتے ہیں:

"وہ اعتراضات جہنوں نے ماضی میں لوگوں کے ذہنوں اور حلقہ ہائے درس کو مصروف رکھا، اب اپنی اہمیت اور قدر و قیمت کھو چکے ہیں اور وہ فرقے بھی مٹ گئے جو یہ اعتراضات اٹھاتے تھے اور ان پر اصرار کرتے تھے۔ ان موضوعات پر غور و فکر اور ان کی تدریس، ضعیف وقت اور سعی لا حاصل ثابت ہوئی۔ اب نئی دنیا

ہے، جس کی ضرورتیں بھی نہیں ہیں اور اب اسلام کے دشمنوں اور مخالفوں نے اس دور میں ایسے نئے مسائل اٹھائے ہیں جو بالکل اچھوتے ہیں اور جو جدید فلسفے کی روشنی میں پیدا ہوئے ہیں۔ یہ خیال خام ہے کہ ان مسائل کی شکل ترمیم اور تسلی بخش جواب صرف قدیم فلسفے پر اعتماد کرتے ہوئے ممکن ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کے لیے شکوک رفع کرنا اور مخالفت کو شکست دینا اس وقت ممکن ہے جب وہ اسباب و محرکات معلوم ہوں جن کی بنا پر اعتراض اٹھایا گیا۔ علامہ شبلی نعمانی نے فکر اسلامی اور پرانی تہذیبوں کے اسالیب میں تبدیلی کا مشورہ دیا ہے جن سے اس دور میں صرف نظر ممکن ہے کیونکہ ان کی ضرورت ختم ہو چکی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

”یہ یونانی علوم ہمارے دینی علوم نہیں اور ان پر ہمارے دین کا فہم و شعور موقوف نہیں۔ امام غزالی نے اپنے دور میں اس تدریسی مواد کو تعلیمی نصاب میں اس لیے ضم کر دیا کہ علماء یونانی مناظرے اور مباحثے کے اس طریق کار سے واقف ہو جائیں جس کو عام کرتے ہیں اس عہد کے باطنی فرقوں نے بڑی سرگرمی دکھائی اور اس دور میں بے دینی کی جو روجیل پڑی تھی اس کو ان علوم سے بڑی تقویت ملی۔ لیکن اب ان مکتبوں کا کوئی وجود نہیں رہا اور نہ وہ یونانی علوم باقی ہیں اور نہ روشن خیال لوگ، یا دانشور کہلانے والے، اس کی بڑتری اور صحت پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کا اثر ختم ہو چکا ہے اور اسلام کو اب ان سے کوئی خطرہ نہیں۔ ان کی جگہ نئے علوم، نئے مسائل، نئے افکار اور نئی بحثوں نے لے لی ہے، اور اب ضروری ہو گیا ہے کہ ہمارے علماء نئے مباحث اور عصری اور مفید علوم سے واقف ہوں تاکہ نئے مسائل کا حل پیش کر سکیں اور شکوک و شبہات کا ایسا علمی جواب دے سکیں جو علم اور تحقیق پر مبنی ہو۔“

### مغربی تہذیب و تمدن کے چیلنج

اب ہم اس اہم ترین چیلنج کی طرف آتے ہیں جس کا سامنا اسلامی ثقافت کو بالخصوص اور اسلامی اداروں کو بالعموم کرنا پڑا ہے۔ یعنی مغرب کی جانب سے تمام ذرائع سمیت، مغربی تہذیب

کا حملہ، جس کا خطرہ انیسویں صدی عیسوی سے مسلمانوں کے لیے بڑھ گیا ہے اور اب تک برقرار ہے۔ اس حملے کی دو صورتیں ہیں:

”پہلی مسلح جنگ، جو مغربی استعمار کے نتیجے میں اسلامی دنیا کے بڑے حصے میں وقوع پذیر ہوئی اور دوسری اسلامی اداروں کے خلاف نظر بانی اور ثقافتی جنگ جو اعلیٰ تہذیب کی ہم رکاب راہی ہے۔ ابتدا میں نظر بانی جنگ سے اسلامی ثقافت کو حقیقہ اور درپردہ خطرہ تھا جو اسلامی ثقافت کے اہم اصولوں سے اختلاف میں پوشیدہ تھا اور مغربی تہذیب کے مزاج میں شامل میں تھا۔ استعماری طاقتیں اپنی ثقافت کو مدارس اور پریسیکٹوز سے کے تمام دیگر ذرائع مثلاً کتب و رسائل اور نشریات سے پھیلانے میں ہمہ تن مصروف تھیں جو مسلمان اس تہذیب سے ”فیض باب“ ہوتے ان کے لیے سب درواتے کھل جاتے اور جو اپنی روایات اور شخص کی حفاظت کرتے ان پر تمام راستے مسدود کر دیے جاتے۔ مغربی ثقافت کی نشر و اشاعت، فکر اسلامی کے خلاف زبردست جنگ تھی۔ کیونکہ موجودہ مغربی تہذیب ان کے اہل دین اور اہل علم کے درمیان مسلح آویزش کی پیداوار تھی۔ سب جانتے ہیں کہ ”تحریک اجیاء“ سے پہلے یورپ میں تھیوکرسی (بابا پائیت) تھی جس میں اختیار اس طبقے کے ہاتھ میں تھا جنہوں نے مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اور لوگوں کو امانت اور طرح طرح کے عذاب میں ڈال رکھا تھا۔ یہ طبقہ آزادی، عزت، علم اور تمام انسانی جذبات کی راہ میں رکاوٹ تھا، اور کئی صدیاں تک جب مسلمان اس دوران میں فنون و معارف کے وسیع افق تلاش کر رہے تھے۔ اس طبقے نے مغربی دنیا کو روشنی سے محروم رکھا۔ یورپ کے آزادی پسند لوگوں کو احساس ہوا کہ ان کی نجات صرف اس طبقے، اور ان کے قائم کردہ خوفناک نظام حکومت کے خاتمے ہی سے ممکن ہے مغربی تہذیب اس طرح سے اکھری اور یہ سب اہل کلیسا اور اس کے نتیجے میں دین کے خلاف رد عمل کا نتیجہ تھا، کیونکہ اس تہذیب نے اپنی معاشرتی اور سیاسی زندگی میں دین و حکومت کے مابین جدائی کو اپنایا تھا اور اس طرح مفکرین کے انداز فکر، علم و ادب اور فلسفے میں الحاد اور مذہبی قیود سے آزادی کی روح سرایت کر گئی۔ مغربی ثقافت کا فلسفہ زندگی خالص مادی فلسفہ ہے اور کوئی محقق چاہے تو ان کے مثالیہر، مثلاً ”ہیگل، ڈارون، مارکس، ہیکلے وغیرہ کے مطالعے سے معلوم کر سکتا ہے اس بنا پر فلسفہ وجودیت اجیاء جس کے سائے میں اقتدار کی تباہی دین میں انتشار، آخرت سے انکار اور منفعت، لذت، تعصب قومی و نسلی کے اصولوں کی بڑتی خوب

پھلی پھولی اور اس تہذیب میں ہر چیز عارضی اور اضانی بن گئی اور رومی نوع انسان میں موجود، مطلق معیار مٹ گیا۔

اس ثقافت اور اس کے اداروں کا مسلم مفکر محمد اسد (سابق لیوپولڈ وائس) نے کیا خوب نقشہ کھینچا ہے:

”قدیم یونانی اور رومی تہذیبوں اور جدید مغربی تہذیب کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ ان کے مقاصد اور نصب العین پر مادیت کا غلبہ تھا اور اسی باعث فساد اور جنگیں اور جھگڑے پیدا ہوئے۔ یورپ کا عام آدمی، خواہ وہ جمہوریت پسند ہو یا فسطائی سرمایہ دار ہو یا اشرافیہ کی مزدور ہو یا دانشور، صرف ایک مذہب کا پیروکار ہے یعنی مادی ترقی کی پرستش، اور اس کا عقیدہ ہے کہ اس کی زندگی کا حاصل یہ ہے کہ انسان قسرت کی عائد کردہ تمام بندشوں سے آزاد ہو۔ اس مذہب کی عبادت گاہیں، بڑی بڑی فیکٹریاں، سینما ہال، کیمیاوی لیبارٹریاں، رقص گاہیں اور بجلی گھر ہیں۔ اس کے ”پرہت“ بنکوں کے صدر، انجینئر، اداکارا ہیں، فلمی ستارے، تجارت و صنعت کے مالک، ہوا باز اور کھلاڑی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ طاقت کی ہوس اور لذت کی خواہش ہے اور اس سے وہ مختلف گروہ ظہور میں آتے ہیں جو ایک دوسرے کے مخالف، اسلحہ اور دوسرے سامان حرب سے پوری طرح لیس اور خواہشات اور مصلحتوں کے تصادم کے وقت ایک دوسرے کو صفحہ ہستی سے مٹانے پر کمر باندھے ہوئے ہیں۔ ان کی تہذیب نے انسان کا ایک ایسا نمونہ پیدا کیا ہے جو اپنے مٹانے کے نتائج کو زیادہ قابل اعتماد سمجھتا ہے اور اس کے نزدیک مکمل مثالیے اور خیر و شر میں وجہ امتیاز سوائے مادی کامرانی کے اور کوئی چیز نہیں۔ اس تہذیب، اور اس کے فکری نظام میں درحقیقت خدا کے لیے کوئی گنجائش نہیں، اسے اس میں کوئی فائدہ نظر آتا ہے نہ اس کی ضرورت کا احساس ہے۔“

مغربی تہذیب کا دوسرا خطرہ اس کے تعلیمی اور ثقافتی اداروں میں پوشیدہ ہے جسے اس کی ثقافت پھیلا رہی ہے اور اس وقت اسلام کو ایسے رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے جو وہ فی الحقیقت نہیں ہے اور اس کی امتیازی اور صحیح خصوصیات کو مٹانے اور اس کے مثالی اصولوں کو مسخ

کرتے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس ہم میں وہ لوگ شریک ہیں جنہیں عام طور پر "مستشرقین" کہا جاتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس مناسبت سے ایک اہم معاملے کی طرف اشارہ کریں۔ وہ یہ کہ یورپ کو اسلام سے نفرت، کسی بے نیازی یا ناواقفیت وغیرہ کی وجہ سے نہیں، جیسا کہ ان کا دوسرے مذاہب اور غیر اسلامی ثقافتوں سے معاملہ ہے بلکہ اس نفرت کی جڑیں خاصی گہری ہیں اور اس کی بڑی وجہ شدید تعصب ہے۔ یہ نفرت صرف ذہن و عقل ہی کی نہیں بلکہ گہرے جذباتی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یورپ نے بدھ مت یا ہندو مت کا فلسفہ اور تعلیمات قبول نہیں کیں لیکن ان دونوں مذاہبوں کے بارے میں اس کا موقف عقلی، متوازن اور غور و فکر پر مبنی ہے، مگر جب وہ اسلام کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو توازن بگڑ جاتا ہے اور اس میں جذباتی میدان بھی چوری چھپے گھس جاتا ہے حتیٰ کہ نامور یورپی مستشرقین بھی اسلام کے بارے میں اپنی تصنیفات میں غیر علمی جاہل گیری کا شکار ہو گئے، اور یہ تعصب ان کی بیشتر تحقیقات میں صاف جھلکتا ہے۔ گویا اسلام سے بحث علمی انداز میں ہو ہی نہیں سکتی، بلکہ یہ ایسا "نصودار" ہے جو اپنے سزا دینے والوں کے حضور پیش ہے۔ بعض مستشرقین تو وکیل استغاثہ کا مثالی کردار ادا کرتے ہیں جو جرم ثابت کرنے پر تیار ہو، اور بعض ایسے ہیں جو وکیل صفائی بن جاتے ہیں جو اپنے موکل کے مجرم ہونے کا ذاتی طور پر یقین رکھتے ہوئے، ناگزیر حالات کے پیش نظر اس کی ہزا میں صرف کمی کے خواست گار ہوتے ہیں۔

اپنی تحریروں میں مستشرقین کا ہدف ایک طرف تو اسلامی مثالوں اور اس کی اعلیٰ اقدار کو زک پہنچانا اور دوسری طرف مغربی مثالوں اور ان کی عظمت کی فوقیت ثابت کرنا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ اظہار بھی ہوتا ہے کہ اسلام پر قائم رہنے کی دعوت رجعت پسندی اور پسماندگی کا منظر ہے۔ حالانکہ یہ لوگ ما قبل اسلام کی تہذیبوں، مثلاً "مصر میں فرعون کا عہد اور اس کی زبان عراق میں آشوری تہذیب اور اس کی زبان، شمالی افریقہ میں بُریرہ تہذیب اور فلسطین، شام اور لبنان میں فینیقی تہذیب کے احیاء کے لیے مصروف عمل رہتے ہیں۔

وہ مسائل جن سے مستشرقین دل چسپی رکھتے ہیں اور جن کا مسلمانوں پر بالعموم اور عربوں پر بالخصوص اثر ہے، اور جس کے پروپیگنڈے اور ترویج میں انہوں نے سرگرمی ظاہر کی، یہ ہیں :

(۱) قرآن کے انسانی کلام ہونے کا نظریہ، اور یہ اعتقاد کہ..... یہ رسول کریم کی ذات پر

عرب ماحول کی چھاپ کا نتیجہ ہے۔ اعتدال پسند مستشرقین بھی، مثلاً پروفیسر گب اپنی کتاب "محمد بن ازم" میں اس رد میں بہہ گئے اور اس کام کے لیے، صدانسوس کہ انہوں نے عالم اسلام میں کئی سعادت مند شاگرد مستشرقین چھوڑے۔ مثلاً اگر آپ ڈاکٹر طہ حسین کی کتاب "الشعر الجاہلی" کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ قرآن عرب پرستی مسیحیت اور عرب یہودیت کا رد پیش کرتا ہے اور یہ کہ قرآن کے افکار ایک مخصوص عرب ماحول اور معاشرے کو متاثر کرنے کے لیے ہیں۔ اگر ہم پروفیسر گب کی کتاب کا ڈاکٹر طہ حسین کی تصنیف سے مقابلہ کریں تو ہمیں ان کے طرز فکر اور اسلوب میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ اسی طرح آپ کو بعض عرب فرقوں کے سرخیل ایسے ملیں گے جن کے نظریات کا حاصل یہ ہے کہ وہ قرآن کی صفت وحی کے منکر ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ محض محمد کی ذہانت و عبقریت کا نتیجہ ہے۔

(۲) پھر وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن اس زندگی کا عکاس ہے جو رسول کریم کے عہد میں پائی جاتی تھی اور کسی اور زمانے کے لیے موزوں نہیں۔ اس نظریے کی بھی بڑی ذمہ داری ہمارے ملک میں ڈاکٹر طہ حسین پر عائد ہوتی ہے جس کے نزدیک قرآن جاہلی دور کا سب سے سچا آئینہ ہے۔ وہ کہتا ہے:

"اس بانچھ اور بے برگ و بار شاعری کے مقابلے میں، جسے جعلی شاعری کہا جاتا ہے قرآن میں جاہلیت کے دور کی عرب زندگی کا نقشہ زیادہ عمدہ اور زیادہ نقیصہ طریقے سے کھینچا گیا ہے۔ اس قسم کا انداز بیان جاہلی شعراء کے اس انداز سے یکسر مختلف ہے، جس سے ہم آشنا ہیں۔"

(۳) پھر کہا جاتا ہے کہ قرآن کی فصیح زبان اس زمانے کی ضروریات کے ساتھ نہیں چل سکتی اس لیے ضروری ہے کہ عابیانہ زبان کو رائج کیا جائے کہ وہ کتب و رسائل کی زبان بن جائے، اس کام میں (عرب ممالک پر) قابض حکومتموں نے مستشرقین کی مدد کی اور ان کا حوصلہ بڑھایا اس تحریک کے بعد یہ شو شا چھوڑا گیا کہ عربی زبان کو رومن حروف میں لکھا جائے یہاں تک کہ ۱۹۴۳ء میں اسے مصر کے "مجمع علمی" (اکادمی آف لٹریچر) کے سامنے عبدالعزیز تھی پاننانے، جو مصر کے مشاہیر میں سے تھے، پیش کیا۔



(۴) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلام سے نسبت رکھنے والا، اسلامی معاشرہ، ایک مختصر دور کے سوا، جو صدر اول کہا جاتا ہے، کبھی بھی مضبوط اور پائیدار نہ رہا، یعنی اسلامی معاشرے کے ابتدائی دور میں، اس دور کی زندگی اور اسلامی تعلیمات میں کچھ نسبت رہی، لیکن جب بھی معاشرے کے احوال میں تبدیلی آئی، صلح بڑھتی چلی گئی کیونکہ اسلام تغیر احوال و ارتقاء کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

(۵) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کا نفاذ سے قاصر رہتا، زندگی کے تجربہ پذیر حالات کے دباؤ کے تحت، معاشرتی ضرورتوں کے باعث، تقابلاً جنہیں اسلام اپنی تعلیمات میں سمونہ

سکا۔ گویا ان کے نزدیک، اسلام پس ماندگی اور رجعت پسندی کا دوسرا نام ہے۔  
(۶) پھر یہ کہا جاتا ہے کہ تغیر احوال کو، جو زندگی کا ایسا قانون ہے جس کے سامنے تسلیم خم کرنے سے مقرر نہیں۔ مسلمانوں کے لیے اپنے دین میں پیش نظر رکھنا ضروری ہے اور یہ اس طرح ممکن ہے کہ مغربی مثالیوں کے ہمراہ چلا جائے اور انہیں قبول کیا جائے تاکہ زندگی تجربے اور سائنسی اسلوب کے ذریعے بسر کی جاسکے اس لیے ضروری ہے کہ دین اسلام کی اصلاح کی جائے یا کم از کم اسلامی قانون میں تبدیلی کی جائے تاکہ وہ زمانے کے ساتھ چل سکتے۔ یہ ایسی دعوت ہے جو ظاہری طور پر صحیح، مگر باطنی طور پر گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔

(۷) مستشرقین کے "کاروائے نمایاں" میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ان مسئلوں پر بحث کرنے ہیں جنہیں وہ کمزور مقامات خیال کرتے ہیں اور انہیں دینی یا سیاسی مقاصد کے لیے نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں، لیکن بات صرف یہ نہیں، بلکہ وہ ان "خامیوں" کو محدب تینٹے سے دیکھتے ہیں اور قارئین کو بھی اسی انداز میں دکھاتے ہیں کہ ذرہ پاڑ اور قطرہ سمندر نظر آئے! اس کی مثال وہ داعی ادبیتش ہے جو اباحت طلاق، تعدد ازدواج اور نبی کریم ﷺ کا کئی بیویوں سے نکاح جیسے مخصوص موضوعات سے بحث سے ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ علم کلام کے مباحث کو بھی بڑا کر کے دکھاتے ہیں۔

(۸) مستشرقین جو کرتے رہے ہیں اور اب تک کرتے چلے آ رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ فکر اسلامی کو اس کے منبع سے جدا کر دیا جائے، کیونکہ ان کے خیال میں فکر اسلامی کا ہر موضوع یونانی فارسی یا ہندوستانی وغیرہ ہے۔

مستشرقین اپنے طے شدہ کئی ہدف حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے عالم اسلام میں، اسلام، رسول اسلام اور اسلام کے سرچشموں کے بارے میں کئی شبہات پیدا کر دیئے ہیں اس کے علاوہ مسلمانوں کے دلوں میں مستقبل سے مایوسی، حال سے نفرت اور ماضی کے بارے میں سوئے ظن پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

ہمارا مطلب یہ نہیں کہ سبھی مستشرقین اس میں ملوث تھے، کیونکہ ہمیں ان میں سے بعض کی فضیلت کا اعتراف ہے جو کسی ذاتی غرض سے پاک تھے، کیونکہ ان لوگوں نے اسلامی ترکے کے خزانوں کو عام کرنے میں مدد دی، لیکن ان کا بڑا اعلان کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ بیشتر مستشرقین کی اسلام سے دل چسپی کا سبب ان دو باتوں میں سے ایک تھا: یا تو وہ مشنری اداروں کے نمائندے ہوتے تھے اور عیسائیت کی تبلیغ سے وابستہ ہو کر کام کرتے، یا پھر وہ سیاسی اداروں کے لیے کام کر رہے ہوتے تاکہ کوئی استعماری غرض حاصل کی جاسکے یا کسی ایک حکومت کے نفوذ کی پشت پناہی میں سرگرم ہوتے۔ یہ لوگ مغربی طاقتوں کا ہر اول دستہ تھے جو مشرقی ممالک میں جا کر حالات و مسائل کا مطالعہ کرتے تاکہ بڑی طاقتوں کو وہاں گھسنے اور تسلط جمانے میں آسانی ہو۔

مستشرقین اور ان کے ہمناؤں کے اپنے مقاصد میں کامیابی کے مددگار یہ تھے۔

(۱) ایسے کسی مسلمانوں کی موجودگی جو ان کے نقش قدم پر چلے۔ یہ لوگ اسلامی ثقافت کو گدلا کرنے کے زیادہ اہل اور ذمے دار تھے اور یہ لوگ "اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے" کے مصداق تھے۔

(۲) اسلامی علوم کی پس ماندگی اور فکر اسلامی کا جمود، تعلیمی نصاب کا لکیر کا فقیر بنے رہنے پر اصرار اور اسلامی فقہ کے دائرے میں توسیع اور پھیلاؤ کا فقدان۔

(۳) مسلمانوں کو لاحق ہونے والا سیاسی ضعف، اور اپنے آپ پر اور اپنی متاع علم و دانش پر عدم اعتماد۔

(۴) اسلام کے دشمن، ہر اس غلطی کو جو مسلمانوں سے سرزد ہوتی ہے۔ اسلام کے نام منظر دیتے ہیں۔ حالانکہ اس کا سبب ترک اسلام اور اس سے کنارہ کشی ہوتا ہے۔

(۵) ایک آخری اور اہم بات یہ ہے کہ اسلامی معاشروں نے مغرب کے تعلیمی نظام کو پورے کا پورا اختیار کر لیا، حالانکہ تعلیم و تربیت کی روح، اس کے وضع کرنے والوں کے علم،

تصور کائنات اور نظریہ حیات کے بارے میں عقائد، ذہنیت اور مقاصد کا عکس اور ان کے اخلاق کا منظر ہوتی ہے، اور یہی چیز کسی نظام تعلیم کو باندھنا، روح اور ضمیر عطا کرتی ہے۔ اس لیے اگر کسی قوم کا اپنا مخصوص عقیدہ تو ہو، مگر وہ نظام تعلیم کسی اور کا اپنا لے تو عقلی اور جذباتی آویزش لازماً پیدا پیدا ہوتی ہے اور بالآخر وہ قوم رفتہ رفتہ نئی اقدار کو قبول کر لیتی ہے اور سابقہ اقدار ترک کر دیتی ہے اسی سلسلے میں ہم یہ ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ امام غزالیؒ جو عقل و فہم کی تیزی اور علم کی وسعت میں فقید المثال شخصیت تھے، جب فلسفہ یونان کے مطالعے میں مصروف ہوئے تو اس کی تنقید میں بہت کچھ لکھنے کے باوجود اس سے متاثر ہوئے، اور ابو بکر بن العربی کو کہنا پڑا:

”ہمارے شیخ ابو حامد (الغزالی) نے فلسفیوں کو لنگ لیا پھر انہیں اگلتا چاہا مگر کامیاب نہ ہوئے۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی ثقافت اور مغربی تمدن دونوں زندگی کے بارے میں بالکل متضاد نظریے پیش کرتے ہیں جن میں کوئی سمجھوتہ ممکن نہیں، اور جب صورت حال یہ ہو تو ہم کس طرح یہ توقع کر سکتے ہیں کہ مسلمان نوجوانوں کی تربیت مغربی اصولوں کے زیر سایہ ہو سکتی ہے۔ ایسی تربیت جو پوری کی پوری یورپی ثقافت کے تجربات اور اس کے تقاضوں پر مبنی ہو اور جو اسلام کے دشمنوں کے اثر و نفوذ کے شائبے سے پاک ہو، ہماری اس توقع کے پورا ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی اور ہم، جیسا کہ استاذ محمد اسد نے کہا ہے، اگر ان چند شاذ و نادر واقعات کو مستثنیٰ قرار دیں جہاں کوئی روشن دماغ، نصاب تعلیم پر غالب آجاتا ہے۔ یہ دیکھتے ہیں کہ مغربی تعلیم و تربیت، مسلمان نوجوانوں کے ارادے، عقائد اور دروں مبنی کو قطعی طور پر متزلزل کر دیتی ہے حالانکہ وہ اس مخصوص خداوندی تہذیب کے علمبردار ہیں جسے اسلام نے پیش کیا ہے، اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہمارے دینی عقیدے کو تیزی سے مائل بہ زوال کرنے میں ان لوگوں کا ہاتھ ہے جو اپنے آپ کو ”روشن خیال“ کہتے ہیں اور جو مغربی بنیادوں پر تربیت حاصل کیے ہوئے ہیں۔

## مغربی ثقافت کے چیلنج کے مقابلے میں اسلامی ثقافت کا موقف

اب جب کہ یہ واضح ہو چکا کہ مغربی ثقافت کی جنگ (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی اور مشنری) مسلسل جاری ہے اور فکر اسلامی کے مخالفوں نے اس پر تازہ ترین حملے کیے ہیں، وہ اسی ضمن میں

ہیں، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی ممالک کے مفکروں کا اس جنگ کے بارے میں کیا موقف ہے؟  
ہم اس بات کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لے سکتے ہیں۔

(۱) ایک موقف تو منفی ہے کہ مغربی ثقافت، اور اس سے جنم لینے والے تمام تہذیبی اور ثقافتی

اداروں اور اس تہذیب کے ساز و سامان کو مسترد کر دیا جائے۔

(۲) دوسرا موقف مغرب پرستی کا ہے کہ مغرب کی تہذیب کو، ہر جگہ سے پھلے سمیت اختیار کر

لیا جائے خواہ اس کا تعلق سائنس و صنعت سے ہو یا ثقافت، روحانی زندگی، عقلیت اور

زبان کے اسلوب سے۔

(۳) تیسرا موقف دونوں تہذیبوں میں موافقت پیدا کرنا چاہتا ہے اور وہ اسلام کے اصولوں

کو مغربی تہذیب کے مثالیوں کے قریب لانے کی دعوت دیتا ہے، مگر اس کا میلان مغربی

ثقافت کو اپنانے کی طرف ہے۔ وہ اسلام کو نئے حالات سے ہم آہنگ کرنے کا خواہشمند

ہے اور اس موضوع پر، جہاں تک ممکن ہو، مفکرین اسلام کے اقوال سے دلائل پیش کر

کے بحث کرتا ہے۔

(۴) آخری موقف وہ ہے جو مسلمانوں کو فرائض و سنت کے مطابق اپنے دین پر ثابت قدمی کی

دعوت دیتا ہے۔ مسلمانوں کو باہمی اتحاد کی طرف بلاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مغربی تمدن

اور مغربی علوم کی پیش کردہ بہترین باتوں سے استفادہ بھی کرتا چاہتا ہے، لیکن مغربی

ثقافت کو اختیار کرنا نہیں چاہتا سوائے اس کے جو اہمیت مسلمہ کے تشخص اور ثقافت

سے متعارض نہ ہو۔

جہاں تک پہلے نقطہ نظر یعنی منفی رویے کا تعلق ہے تو ہم اسے زیادہ قابل اعتناء نہیں

سمجھتے، کیونکہ اس دین کی بھونڈی تفسیر ہے جو کائنات پر غور و فکر کرنے پر اکساتا ہے، ٹیک اور اچھی

باتوں سے استفادہ کرنے کو کہتا ہے اور طاقتور بننے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ موقف

عملی طور پر محال ہے کیونکہ موجودات کا مزاج اس کو قبول نہیں کر سکتا۔ ان لوگوں کی مثال ایسی

ہے جیسے کوئی اپنے آپ پر دروازے اور کھڑکیاں بند کر لے۔ جس طرح شتر مرغ ریت میں سر چھپا

کر اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے، اس نقطہ نظر کے حامی، خواہ وہ منہجیت بخش باتوں سے استفادہ

کریں یا نہ کریں اور تغیر و تجدید کو قبول کریں یا نہ کریں، تاریخ کا دھارا انہیں پیچھے چھوڑ جائے گا۔

اور ایک دن وہ اس پاس نظر ڈالیں تو کوئی حامی و مددگار نہیں پائیں گے۔

جہاں تک دوسرے نقطہ نظر کا تعلق ہے تو یہ مغربی تہذیب کے سامنے تسلیم خم کرنے والوں اور اس کے مقلدوں کا ہے جو اس کی تمام اقدار اور اصولوں پر ایمان لائے ہیں اور اس کی ہر اس بات کو اس کے بنیادی عقائد، فکری نظریات، مادی فلسفے اور اقتصادی اور سیاسی نظاموں سمیت قبول کرنے ہیں۔ اس نقطہ نظر کے حامی اور مؤید اسلام کے ہر گوشے میں ملتے ہیں۔

اسلامی مملکتوں میں ترکی پہلا ملک تھا جس کے ارباب حل و عقد نے اپنے ملک کے دور ابتلا میں اپنے اسلامی ماضی کو اس کی ثقافت، افکار، روایات اور اسالیب زندگی سمیت ترک کر دیا، حالانکہ ترکوں کی اپنی خود مختاری اور وسیع علاقے پر حکومت تھی، مگر ان کے بیشتر تہذیب یافتہ افراد کو اپنے آپ پر اعتماد قطعی اٹھ گیا اور اپنی ان فوری روایات پر ایمان و یقین ختم ہو گیا جو زندگی کی اساس تھیں، اور وہ اس مغربی ثقافت کی بہم ضریوں کی تاب نہ لاسکے کیونکہ یہ تہذیب نئے جذبے، عظیم قوتوں اور صنعتی، سائنسی اور فکری انقلاب سے کامران تھی۔ اور قدامت پسند علماء کے طبقے کو، جنہیں جدید تقاضوں اور نئی تبدیلیوں کا کچھ علم و احساس نہ تھا، اس نئی نسل کا سامنا کرنے کی توفیق نہ ہوئی جس نے یورپ کے دار الحکومتوں یا ترکی ہی واقع معاصر تعلیمی اداروں میں تعلیم و تربیت پائی تھی۔ یہ نسل مذہب سے بیزاری، اپنے مستقبل سے مایوسی اور اپنے ہم وطنوں سے نفرت کے سائے میں پل میں جو ان ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ مغرب اور مافیہا کو قابل احترام سمجھتی تھی۔ اس فکری رجحان کی مثالی شکل وہ سرکاری ادارے تھے جو پہلی عالمی جنگ کے بعد وجود میں آئے تھے ان پر بھی اس فکر کی چھاپ گئی جس کا حامی اور مبلغ ممتاز ترک دانشور ضیا گوک الپ تھا۔ یہ ادارے مغربی تہذیب پر دل و جان سے ایمان رکھنے تھے اور ان کا نصب العین ضاف اور واضح تھا کہ جدید مغربی کے حکومتوں کے طرز پر حکومت قائم کی جائے۔ وہ جانتے تھے کہ خلافت عثمانیہ اسلام کی اساس پر قائم تھی اور یہ کہ اسلام اپنی فطرت میں عربی ہے اور اس کے قانون و قواعد عربی ہیں اور یہ انسانی زندگی کو مدد سے لحد تک اس طرح کنٹرول کرتا، اور اسے ایسے مخصوص انداز میں ڈھالتا ہے جس سے تمام خواہشات اندر ہی اندر گھٹ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لیے جیت تک اسلام ثقافت کا منبع اور ملک کا دین رہے گا، ملک خطرے میں رہے گا۔ اسی لیے اس نے اسلام اور اس کی ہر شاخ کو نشانہ بنانے میں چوٹی سے ایڑی تک کا زور لگا دیا۔ ان اداروں نے صرف

دیجی کو دنیا سے جدا کرنے اور سیکولر ازم کی بنیاد پر ترک کی معاشرہ قائم کرنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ ہر اس چیز کو جو اسلام کی یاد دلاتی تھی یا اس کی طرف اشارہ تک کرتی تھی، جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کے لباس میں مداخلت کی گئی اور انہیں فرنیگی لباس وغیرہ پہننے پر مجبور کیا گیا۔ اسی طرح خواتین کو بے پردہ باہر نکلنے کا حکم دیا گیا۔ اس کے بعد عربی رسم الخط ان کا نشانہ بنا جسے لاطینی حروف سے بدل دیا گیا۔ پھر ترکی کی تاریخ پر توجہ دی گئی اور اس کو اس بڑی طرح مسخ کر دیا گیا، کہ اس کا اسلام سے کوئی تعلق باقی نہ رہے اور صرف تورانی قومیت کی اساس پر مبنی ہو۔ یہ ادا لے لوگوں کی مرضی اور اختیار سے وجود میں نہیں آئے تھے، بلکہ اس کے لیے جبر و تشدد کے انتہائی وسائل بروئے کار لائے گئے۔ کیونکہ ترک قوم، اسلام میں مخلص اور تاریخ و ثقافت اسلامی اصرار اسلامی روایات پر ایمان رکھتی تھی۔ ان کا ایک مورخ عرفان اور غا (جو آنا ترک کے حامیوں میں سے ہے) لکھتا ہے:

”..... اتنی شوہش اور اتنے شدید فسادات ہوئے کہ ترکی کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی اور حکومت کو ترک کی بحریہ کو حکم دینا پڑا کہ وہ بحیرہ اسود میں مقیم رہے، ہر قریے اور ہر مقام اور ملک کے مختلف حصوں میں، عدالتیں قائم کی گئیں۔ وہ علمائے دین، جنہوں نے لوگوں کے دلوں میں مزاحمت کی روح بھونکی اور دین کے لیے سینہ سپر ہو گئے، پھانسی پر چڑھا دیئے گئے یا اتنے مجبور کر دیئے گئے کہ لوگوں کی نظروں سے چھپ کر غائب ہو گئے۔ اس معاملے میں کوئی نرمی یا رو رعایت نہ برتی گئی۔ مصطفیٰ کمال نے اپنے احکام کا نفاذ اور تکمیل شروع کر دی اور اس سلسلے میں اس نے ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کیا اور ایسے کئی افراد کو پکڑ پکڑ کر پھانسی پر چڑھا دیا جن کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ ان احکام کا مضحکہ اڑا رہے تھے اور بے گناہ اور قصور وار کو یکساں نشانہ بنا دیا گیا۔“

ایک مدت سے ترکی میں یہی طریقہ حکومت چلا آرہا ہے۔ لیکن کیا ترکی کو اس سے کوئی فائدہ ہوا؟ اس کا ماضی قریب گم ہو گیا، اور وہ اس بھر پور علمی ورثے سے کٹ گیا، جس کی تعمیر میں کئی نسلوں اور بڑے بڑے دانشوروں نے حصہ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کی قیادت بھی اس سے چھین گئی اور اہل اقتدار اور مضبوط مسلم قوم کے درمیان خلیج بڑھ گئی۔ اس سب کے صلے میں ترکی کو

کیا لاکھ؟ ترکی نے مغربی تہذیب اور اس کے بعض سطحی مظاہر کا طوق پہن لیا اور بعض ایسی اصلاحات کیں جو قوموں کی زندگی میں بے معنی ہوتی ہیں اور یہ عہد، جس میں ترکی نے مغربی تہذیب سے اقتباس کیا، محض تقلیدی عہد بن گیا جو کسی حدت اور اچھ سے عاری تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ "فوائد" اس نقصان کے مقابل کوئی حقیقت نہیں رکھتے جو ترکی کو اٹھانا پڑا۔ آخر کار ترکی میں ایسی معقول تخریکیں شروع ہوئیں جو اسلام، اسلامی ثقافت اور اسلامی روایات پر دوبارہ اعتماد کرنے کی دعوت دیتی تھیں اور دوسرے اسلامی ممالک سے مضبوط روابط استوار کرنے پر زور دیتی تھیں۔ جن کے درمیان کو اہم مقام حاصل ہو چکا ہے کیونکہ ترکی وہ ملک ہے جس نے اسلام کی تبلیغ اور اس کی مدافعت پانچ صدیوں تک کی تھی۔

ہندوستان میں مغرب پسندی کی ترغیب مرسید احمد خاں اور ان کے قائم کردہ فکری مدرسے نے کی۔ مرسید احمد خاں کی روش بھی وہی تھی، جو اس سے پہلے ترکی میں، ہینا گوگ الپ اور انا ترک نے اختیار کی۔ یعنی انہوں نے مغربی تہذیب، اس کی مادی اساس اور معاصر علوم کو پورے کا پورا، اپنے نقائص اور خامیوں کے باوجود قبول کرنے کی دعوت دی اور اسلام اور قرآن کی ایسی تفسیر کی جو انیسویں صدی عیسوی کے اختتام پر نئی تہذیب سے مطابقت رکھتی تھی۔ مرسید احمد کی رائے میں حکام کی تقلید اور ان کا سارہن سہن اور زندگی اور عادتوں میں ان سے ہم آہنگی کے نتیجے میں مسلمانوں کے دل سے ان کا خوف زائل ہو جائے گا اور ان کے احساس بکتری کا مداوا ہو گا۔ اس کے علاوہ اس سے حکام اور ارباب حکومت کی نظر میں ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو گا اور انہیں معاشرے میں اپنے ہم پیشوں اور امور زندگی کے شریکوں کے برابر مقام حاصل ہو جائے گا۔ مرسید احمد خاں نے "بتیان الکلام" کے نام سے قرآن کی تفسیر بھی لکھی جس میں اپنی پسند اور مغرب کی اُرد اور خواہشات کے مطابق قرآن کی تفسیر کی۔ "دبیر یوں" سے اتفاق کرنے ہوئے، انہوں نے ہر اس بات سے انکار کیا، جسے جو اس، تجربہ اور سائنس ثابت نہیں کرتی جس میں عیب کے خالق اور مابعد الطبیعیاتی معاملات شامل ہیں۔ مرسید احمد خاں نے انگریزوں کی مالی مدد سے علی گڑھ یونیورسٹی قائم کی تاکہ وہ مغربی ثقافت کے تمام پہلوؤں کی نمائندگی کر سکے، لیکن اس یونیورسٹی کی قسمت میں ہندوستان کا ایک اسلامی مرکز بننا لکھا تھا۔

مصر میں مغرب پسندی کا رجحان زیادہ شدید اور پرچوش تھا۔ درحقیقت مصر میں اس

تخریب کے لیے، اور مستشرقین کی تمام تحریکوں کے لیے موزوں ماحول تھا، عجیب بات یہ ہے کہ اسی  
 جب کبھی مغربی مستشرق کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ کوئی نظریہ یا کوئی تحقیق ایسی نہیں جو  
 کی حمایت میں مصر میں ایسا ادیب یا مصنف نہ مل جائے جو اس نظریے وغیرہ کو پورے اخلاص سے  
 اپنالیتا ہے، اس کی عجیب و غریب تشریح و وضاحت کرتا ہے اور بڑی ہوشیاری اور عیاری سے اس  
 کا علمبردار بن جاتا ہے، مثلاً قرآن کو اسلامی کلام کہتا، دین کو سیاست سے الگ کرتا اور یہ کہ اسلام  
 مذہب ہے، حکومت نہیں، سیکولر ازم کی حمایت، عربی کے اولین مصادر میں شک و شبہ پیدا کرنا  
 حدیث کی علمی قدر و قیمت میں شبہ پیدا کرنا، اسلام میں سنت کے مقام اور حجت سے انکار، عورت  
 کی نام نہاد آزادی، مردوں سے برابری اور بے پردگی کی دعوت، فقہ اسلامی کا رومن لاء سے ماخوذ ہونا  
 اسلام کے مقابلے میں گزشتہ تہذیبوں کا احیاء، فرعون کے دور کی بڑائی ظاہر کرنا، عامیانه زبان کی  
 تحریک اور اس میں اشاعت و تصنیف، رومن رسم الخط کی حمایت، عربی دیوانی قوانین کو مغرب کے  
 سول لاء کے مطابق ڈھالنا، اور نسل پرستی، اثنتر اکیٹ اور کمپونرزم وغیرہ کی طرف دعوت، یہ

وقت کی قلت کے سبب ہم اس نقطہ نظر کے حامی افراد اور ان کے خیالات کے بارے میں  
 تفصیل سے بات نہیں کر سکتے، لیکن ان میں سے ایک اہم فرد ڈاکٹر طہ حسین کے اقوال کو پیش کرنا کافی  
 سمجھتے ہیں جو انہوں نے اپنی کتاب "مستقبل اٹلانٹ فی مصر" میں درج کیے ہیں۔

اس کتاب کا موضوع مصنف کے اس عقیدے کی تائید کے گرد گھومتا ہے کہ مصریوں کا تعلق  
 مشرق کی نسبت مغرب سے زیادہ ہے اور یہ کہ مصری ثقافت یورپی ثقافت کا ایک حصہ ہے اور اسلامی  
 حکومت کے دور میں اس میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی کیونکہ مصر کی ثقافت زمانہ قدیم سے مغربی ہے اور  
 اسی طرز کی رہے گی خواہ کتنے ہی زمانے کیوں نہ بدل جائیں اور ڈاکٹر طہ حسین کی رائے میں مصری ذہن  
 "ابتداء ہی سے ایسا ذہن ہے جو صرف بحیرہ روم سے متاثر ہوتا ہے اور اختلافات کے باوجود اس  
 کا اور بحیرہ روم کی اقوام کا نفع و نقصان مشترک ہے۔"

سب سے زیادہ بے معنی بات، جس کی کوئی انتہا نہیں، ڈاکٹر طہ حسین نے یہ کی کہ:  
 "مصر مشرق کا حصہ ہے اور مصری ذہن اسی طرح مشرقی ہے جس طرح ہندوستانی یا  
 چینی ذہن۔"

اور دوسری طرف مصریوں کی مادی زندگی، ان کی رائے میں، یورپی زندگی ہے:



”ہمارے ترقی پسند طبقوں میں ہماری مادی زندگی خالص یورپی طرز کی ہے، جبکہ دیگر طبقوں میں افراد اور جماعتوں کے اختیار اور ثروت میں ان کے حصے اور کشادہ دستی کے لحاظ سے یورپی طرز زندگی سے کہیں قریب ہے اور کہیں دور، اس کا مطلب یہ ہے کہ مصریوں کی مادی زندگی کے بلند تر نصب العین وہی ہیں جو یورپیوں کی مادی زندگی کے ہیں۔“

ڈاکٹر طرہ حسین کی نظر میں، مصریوں کی عقلی اور روحانی زندگی بھی اس سے مختلف نہیں۔ ”منظاہر اور شکل و رنگت کے اختلاف کے باوجود ہماری عقلی اور روحانی زندگی بھی خالصتاً یورپی ہے اسی طرح ہمارا نظام حکومت بھی خالص یورپی ہے جسے ہم نے کسی تذبذب یا ناقصی کے بغیر یورپیوں سے اخذ کیا ہے اور ہمارا نظام تعلیم، ہم نے اسے کسی بھی طرح تشکیل دیا ہو اور کوئی سا بھی نصاب تیار کیا ہو، کسی شک اور بحث کے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ یہ بھی خالص یورپی طرز کا ہے اور ہم اپنے ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ مدارس میں اپنے بچوں کو بلا شک و شبہ، یورپی بنا رہے ہیں۔“

مصنف کی رائے میں، سب ”اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس نئے دور میں ہمیں یورپ سے ایسے قریبی رابطے کی ضرورت ہے جو روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جائے، یہاں تک کہ ہم لفظی معنوی حقیقی طور پر اور شکلاً اس کا ایک حصہ بن جائیں۔“ اس صورت میں بقول ڈاکٹر طرہ حسین ہمارا فرض ہے کہ ”ہم یورپی اقوام کا رنگ ڈھنگ اپنائیں اور ان کے راستے پر چلیں تاکہ ہم ان کے ہم سفر بن جائیں اور ان کی تہذیب کے بڑے بھلے، خوشگوار اور تلخ، پسندیدہ اور ناپسندیدہ اور عموماً اور معیوب میں برابر کے شریک ہوں۔“

اسی طرح ہمارا فرض ہے کہ ہم یورپی اقوام کو یہ یقین دلا دیں کہ ہم بھی چیزوں کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس طرح وہ، اور ہمارے معیار اور پست و ناپسند بھی وہی ہے جو ان کی ہے اور سب باتوں کے متعلق ہمارا فیصلہ بھی وہی ہے جو ان کا ہے۔“

مصنف کی نظر میں یہ سب اس لیے ضروری ہے کہ ”مصری یورپی ذہن کا مالک ہے جو فارسیوں، رومیوں، عربیوں یا اسلام کے باوجود تبدیل نہ ہوا۔“ مصر کی بیداری ان کی نظر میں فرعونی دور کی توسیع کا نام ہے، اور وہ کہتے ہیں:

”اسی وجہ سے میرا ایمان ہے کہ جدید مصر میں جو جدت و اختراع ہے، اس کی بنیاد، اور باعوث مصر کی قدیم اور پائیدار تہذیب ہے اور اسی لیے میں مصر میں ثقافت کے مستقبل پر صرف اس کے زمانہ ماضی بعید یعنی فرعونی دور اور زمانہ حال کی روشنی میں غور و فکر کرنا پسند کرتا ہوں۔“

ان اقوال کو ہم خلاصہ کلام اور مصنف کی اس غرض و غایت کو بیان کر کے ختم کرتے ہیں جسے وہ مصریوں کے دماغوں میں ٹھونٹنا چاہتے ہیں:

”اب ہم اپنی تاریخ سے واقف ہو چکے ہیں، اپنے آپ کو پہچان گئے ہیں۔ قوت و شرف سے آگاہ ہو چکے ہیں اور یقین کر چکے ہیں کہ ہم ہیں اور یورپیوں میں سرموزق نہیں، نہ ہماری طباع اور مزاج الگ ہیں اس لیے مجھے مصریوں کے بارے میں کوئی حدیث نہیں اگر وہ یورپی اقوام میں ضم ہو جائیں۔“

گویا مصری ذہنیت مغربی ہے، مصریوں کے رسم و رواج یورپی ہیں اور مصر کی وابستگی، عالم عرب عالم اسلام کی نسبت یورپ سے زیادہ ہے۔ اسی طرح اس کی ثقافت پر اسلامی ثقافت کی بجائے یونانی اور یورپی رنگ غالب ہے اور مصریوں کے اعلیٰ مثالیے، یورپی مثالیے ہیں۔ ان کی مادری اور روحانی زندگی بھی خالص یورپی ہے، مصنف چاہتا ہے کہ مصری یورپ میں ”غرق“ ہو جائیں اور لفظی، معنوی، حقیقی اور مجازی طور پر اسی کا جزو بن جائیں۔ اس قول کے بعد مغرب پرستی کی دعوت دینے کے لیے کسی اور داعی کی ضرورت نہیں رہتی۔

تیسرا نقطہ نظر، بارحجان، یہ ہے کہ اسلام میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں جو اسے مغربی ثقافت سے ہم آہنگ کر سکیں، کیونکہ اس کے نزدیک اسلامی ثقافت اور اسلامی معاشروں کی بھلائی اسی تبدیلی میں ہے تاکہ اسلام عہد معاصر میں حقیقت حال کا سامنا کر سکے۔ اس رجحان کی بنیاد یہ احسان تھا کہ احکام شریعت کا استنباط اس انداز سے کیا جائے کہ وہ موجودہ دور کے مسائل و تنازعات کا حل پیش کر سکے۔ اس رجحان کا نتیجہ یہ نکلا کہ تقلید پر شدید حملے ہونے لگے اور یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ پورے اسلامی قوانین پر کسی حد و قید کے بغیر نظر ثانی کی جائے۔ اس طرح دروازے کے دونوں پل اہل و غیر اہل اور اہل و رع داہل ہو س کے لیے یکساں کھول دیئے گئے۔ اور ایسی آراء کا اظہار ہونے لگا جس نے اسلام کو کسی ایک یا دوسرے سیاسی اور معاشرتی مکتب فکر سے منسلک کر دیا۔ یہ انداز بحث

جدید مغربی تہذیب کی بدعت ہے۔ اس کے نتیجے میں تبدیلی اور اجہتاہ کی دعوت نے آخر کار یہ مشکل اختیار کی کہ پوری شریعت اسلامی ہی کو تبدیل کرنے کا تقاضا ہونے لگا تاکہ وہ اسلامی ثقافت کی اہم بنیادوں سے ہٹ جائے اور اسلامی قانون و ثقافت، مغربی تہذیب کے اس حد تک مطابق ہو جائے (یا کم از کم اس کے اتنے قریب پہنچ جائے) جو نص و اصول میں تاویل کی آخری حد ہو۔

ڈاکٹر محمد حسین کی رائے میں اسلام، اسلامی معاشرے اور اسلامی ثقافت کے لیے یہ رجحان درود سے خطرناک ہے:

”ایک رُخ یہ کہ اجنبی نو وارد نظریات کو ثابت کرتے ہوئے اور ان پر زور دیتے ہوئے، صحیح میں غلط کو داخل کر دیا گیا، جس سے اسلام میں ایسی خرابی پیدا ہوئی کہ اس کی اقدار درہم برہم ہو گئیں اور اس کا حقیقی مفہوم بگڑ گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ زندگی کے مصائب حل کر چھلتے رہے اور یہ جانتے تھے کہ وہ اس معاملے میں بے بس بنا دیئے گئے ہیں۔ مگر ان کا یہ حال ہو گیا کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہی اسلام ہے اور اسی کے بعد کسی نے انہیں صحیح اسلام کی طرف لوٹانا بھی چاہا تو وہ اس بات کو ناپسند کرتے، اس پر جمود کی نہمت عائد کرتے اور اُسے مطعون کرتے کی وہ نص کی روح کی بجائے اس کے ظاہر سے چمٹا ہوا ہے۔“

تبدیلی کے نقصان کا دوسرا رُخ وہ ہے جو اسلام کے دشمن چاہتے ہیں، اور جو ان کی ثقافت اور تہذیب کا تقاضا ہے، وہ یہ کہ مسلمان ان تبدیلیوں سے ایسے پارہ پارہ ہو جائیں کہ اس کے بعد ان میں کبھی اتحاد پیدا نہ ہو سکے۔ کیونکہ اس کے بعد ان کا ہر گروہ اور ہر جماعت ایسا الگ الگ مسلک اختیار کر لے گی جو دوسروں سے مختلف ہو۔ مردِ اہم سے پھر ہمیں اسلامی، ترکی، ہندی، ایرانی اور عرب ثقافتیں ملیں گی۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ شیخ محمد عبده اپنی تمام ترقی و ترقی و ترقی اور اسلامی ثقافت کے لیے جلیل القدر خدمات کے باوجود اس موقف کی اور اس کے حامیوں کی حمایت پر آمادہ ہو گئے! اس موقع پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شیخ محمد عبده کی زندگی دو ادوار میں منقسم ہے: پہلا دور وہ جس میں وہ اپنے استاد جمال الدین افغانی کے پوری طرح ہمنوا تھے اور ان کی بیشتر آراء و افکار کا چرچا کرتے پھرتے تھے دوسرا دور جمال الدین افغانی کی وفات کے بعد کا ہے جس میں مفتی محمد عبده نے اپنا الگ موقف اختیار کیا اور

سیاسی اصلاح کے اس راستے سے ہٹ گئے جس پر ان کے استاد، معاشرتی اور ثقافتی اطلاع کی غرض سے کامزن تھے اور اس نئے راستے پر چل کر وطن پرستی کی طرف لے جانے میں مساہمت کرتے ہوئے اپنا وہ نیا طریقہ ایجاد کیا جس کے ذریعے وہ باصرار، اسلام کی تشریح اور اسلامی ثقافت کی مدافعت یہ کہہ کر کرتے کہ "اسلام تبدیلی اور تجدید کا مذہب ہے اور جدید تہذیب و تمدن سے کسی طرح بھی متعارض نہیں"۔ اسی بنا پر مفتی محمد عبیدہ نے تقلید پر حملے کرنے شروع کر دیئے اور اسلام میں اجتہاد اور تبدیلی لانے کی تلقین کرنے لگے۔ انہوں نے معاشرے میں عورتوں کی حیثیت پر نظر ثانی کی اور کئی مسائل مثلاً پردہ، تعدد ازدواج پر بدشس، طلاق کی آزادی پر پابندی، وطن اور قوم پرستی کی تبلیغ، ماقبل اسلام کی تاریخ پر اعتناء اور مغرب کا سیاسی نظام اختیار کرنے کی مساعی پر اظہار خیال کیا۔

اسلام میں تبدیلی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے موقف کے داعیوں میں سے ایک قاسم امین ہیں، جن کے نزدیک عورت کی حیثیت، اوضح قطع اور معاشرتی روابط میں بالعموم ایسی تبدیلی ضروری ہے کہ وہ مغرب سے ہم آہنگ ہو جائے۔ ان کے علاوہ علی عبدالرزاق اور سعد زغلول ہیں جنہوں نے وطن پرستی، قوم پرستی اور فرعونی دور کی تاریخ پر توجہ کو اپنی دعوت کی بنیاد بنایا اور مغرب کے سیاسی نظام کو اپنانے کی اس سبب سے تلقین کی کہ اسلام دین ہے، حکومت نہیں۔

مفتی محمد عبیدہ کے اس موقف کا، اس نقطہ نظر کے حامیوں نے سخت ناجائز استعمال کیا۔ ان کی پشت پر یورپی تھے، مثلاً لارڈ کرمر، جنہوں نے مفتی محمد عبیدہ کو سرسید احمد خاں سے تشبیہ دی۔ اور یہ جتایا کہ ان کی سیاسی زندگی اس بنا پر ہے کہ وہ مغرب اور مسلمانوں کے درمیان حائل نطیج کو پائنے کے حامی ہیں اور وہ (اور ان کے شاگرد) اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی ہر طرح سے مدد اور حوصلہ افزائی کی جائے کیونکہ یہ لوگ مزاج کے اعتبار سے یورپی مصلحین کے جانشین ہیں!

مفتی محمد عبیدہ، سعد زغلول، طہ حسین وغیرہ کی جو مثالیں ہم نے نقل کی ہیں، ہو سکتا ہے قاری انہیں ناقابل یقین سمجھے کیونکہ ہم نے اپنے ذہنوں میں ان کی جو تصویر بنا رکھی ہے، یہ باتیں مکمل ضد ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انسانوں کا قد و قامت متعین کرنے پر ہمیں دوبارہ غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ بیشتر ایسے افراد جنہیں ہم موجودہ بیداری کی تحریک کے قائد سمجھتے ہیں، لوگوں کے خیال میں ویسے ثابت نہ ہوئے، اور اس کا سبب، بقول ڈاکٹر محمد حسین، وہ غرض پرستانہ پروپیگنڈا ہے جو انہوں نے (یورپیوں)

تے اراداً اس مقصد کے حصول کے لیے کیا کہ ان کو یہ مقام و مرتبہ دے کر اپنے مسابک فکر اور اپنے خیالات کو راسخ اور متمکن کریں کیونکہ وہ اہم ذرائع ابلاغ جن پر استعماری طاقتوں اور عالمی صہیوت کا قبضہ ہے، ایک خاص قسم کے مصنفوں اور مفکروں کی تشہیر کرتے رہتے جبکہ وہ ان مصنفوں اور مفکروں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن کے نظریات ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔

مغربی ثقافت کے چیلنج سے عمدہ برآمد ہونے کے لیے وہ آخری موقف جو مسلمانوں نے اختیار کیا، وہ ہے جو بڑی خود اعتمادی سے مغربی تہذیب کا مقابلہ کر رہا ہے اور جسے اپنے وسائل اور قوتوں پر بھروسہ ہے کیونکہ یہ اپنی ثقافت کو دوسری ثقافت کے مقابل وہی امتیازی حیثیت دیتا ہے جو مذہب، فکر اور روح کو حاصل ہے کیونکہ اسی سے کوئی قوم، تہذیب، ثقافت اور تمدن کے معاملات میں دوسروں سے ممتاز ہوتی ہے۔ اس موقف کے حامی ایسا مضبوط جذبہ پیدا کرنے کی دعوت دیتے ہیں جو بڑی جرأت اور قوت ایمانی سے مغربی تہذیب کا مقابلہ کر سکے۔ وہ تقلید کو ناپسند کرتے ہیں اور مظاہر کے سامنے سر نہیں جھکاتے۔ وہ اس اچھوتے رشتے کو اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں جو اس ایمان کو جس کا سر حنیفہ انبیاء و رسل پر اعتقاد ہے اور اس علم کو جو کسی ایک قوم یا ملک کی ملکیت نہیں بلکہ ساری انسانیت کے لیے ہے، یکجا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک دین سے اچھے محرکات اور مغرب سے آلات اور فنی وسائل حاصل کرنے چاہئیں اور یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ یہ لوگ مغربی تہذیب کو ایسا خام مواد سمجھتے ہیں جسے چاہیں تو مفید کام میں استعمال کریں اور چاہیں تو بُرے کام میں۔

یہ رجحان مغرب و مشرق کی خوبیوں اور روح و مادے کی طاقت کو یکجا کرنا چاہتا ہے اور ایک ایسا نیا راستہ ایجاد کرنا چاہتا ہے جس پر چلنا خود مغرب کے لیے سود مند ہے، کیونکہ وہ جسم و جان، روح و مادے اور فرد و معاشرے کی تمام ضروریات میں توازن پیدا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی یہ کوشش بھی ہے کہ مسلمان کا یہ شعور ہمیشہ تازہ رہے کہ وہ زندگی میں ایک خاص عقیدے، پیغام، ثقافت اور اسلوب کا مالک ہے اور اس عقیدے اور پیغام کے ثمرات صرف اسی صورت میں حاصل ہوں گے جب اس کے حامل اس کا مفہوم خود بھی اچھی طرح سمجھ لیں اور دوسروں تک بھی پہنچائیں۔

یہ رجحان کئی مسلمان ملکوں میں نظر آتا ہے!

ہندوستان میں ندوۃ العلماء نے واضح طور پر اپنے مقاصد کا اعلان کیا ہے۔  
 ”ایسی نئی سوچ کی تخلیق کی جائے جو قدیم و جدید کے محاسن کو یک جا کرے۔ یعنی  
 وہ قدم جو صالح ہے اور وہ جدید جو مفید ہے۔ اصول و مقاصد پر شدت اختیار کی  
 جائے، لیکن فروغ و ذرائع میں وسعت اور لچک پیدا کی جائے۔“  
 پاکستان میں جماعت اسلامی نے اپنے مقاصد یوں بیان کیے ہیں:

(۱) ہمارا پیغام تمام انسانوں کے لیے ہے بالعموم، اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص ہے کہ وہ  
 خدائے واحد کی عبادت کریں، کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں اور نہ اس کے سوا کسی کو اللہ اور  
 رب مانیں۔

(۲) ہماری دعوت ان سب کے لیے ہے جو اسلام کو بطور دین قبول کرنے پر رضامند ہیں کہ وہ  
 دین میں اللہ کے مخلص بندے بن جائیں اور اپنے آپ کو لفاق کے تمام شائبوں سے پاک  
 اور اپنے اعمال کو تضاد و تناقض سے بچائیں۔

(۳) ہماری دعوت روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے لیے ہے کہ وہ موجود نظام و  
 اصول حکومت میں عمومی اصلاح کی ابتداء کریں جس نے ایسے طاغوتوں اور فاجروں کو دکھڑا  
 بنا دیا ہے جنہوں نے زمین میں ہر طرف فساد برپا کر رکھا ہے اور ان لوگوں سے فکر و عمل  
 کی قیادت چھین لیں تاکہ اللہ، رسول اور یوم آخر پر ایمان رکھنے والے لوگ اس کے  
 مالک بن جائیں جو دین حق پر کار بند ہوں اور زمین میں اپنے ذاتی اقتدار و غلبے کی خواہش  
 نہ رکھتے ہوں اور فساد کا باعث نہ بنیں۔

اس تحریک کے سربراہ سید مودودی (موجود) کے نزدیک ان مقاصد کا حصول صرف ان  
 افراد کے ذریعے ممکن ہے جو اسلامی اخلاق پر ایمان رکھتے اور اس پر عمل کرتے ہوں۔ تمام نئی نوع  
 انسان کے لیے مادی حقوق پر یقین رکھتے ہوں اور انسانی فطرت کے بنیادی جذباتی گوشوں کو  
 ان مقاصد کے حصول کے لیے ناجائز طریقے سے استعمال نہ کریں۔

سعودی میں اسلام کی اصلاحی تحریک شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت سے شروع ہوئی جو  
 مجتہد کبیر، ابن تیمیہ اور ان کی دعوت اصلاح سے سزا سزا متاثر تھے۔ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت کا  
 خلاصہ یہ ہے کہ دین صحیح کی طرف لوٹا جائے اور بدعات و خرافات کو، اور ہر اس بات کو جو اسلام اص

اسلامی میں نووارد ہے، ترک کر دیا جائے اور اسلام کے پاک و صاف سرچشمے یعنی قرآن، سنت، اور سلف صالح کے علم سے سیراب ہوا جائے۔ ان کی یہ تحریک عالم اسلام میں بیداری کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی جو اسلام کے صحیح اصولوں کی رہنمائی میں عمل، فساد کی بیخ کنی اور ایسی اسلامی مملکت اور نیک حکومت کے قیام کی طرف دعوت دیتی تھی جو اسلام کے اصولوں کے مطابق چلے۔ اس کے احکام کی پیروی کرے اور اس کے قوانین و حدود کو قائم کرے۔

ان تحریکوں میں، جنہوں نے اسلام، اس کی ثقافت اور امت مسلمہ کے مستقل اور ممتاز تشخص کی دعوت کو اپنا شعار قرار دیا، ایبیا کی سنوسی تحریک بھی شامل ہے۔ یہ تحریک محمد بن عبدالوہاب کے خیالات سے متاثر تھی، لیکن اس نے صوفی مسلک اختیار کیا۔ گو اس میں صوفیوں کے گمراہ فرقوں کی کج روی شامل نہ تھی۔ اس طرح موجودہ اسلامی معاشرے میں سنوسیوں نے ایک انوکھی تحریک کی ابتداء کی اور انہوں نے ایمان و عمل اور فکر و سلوک کو ایسے خانقاہی نظام کے ذریعے یکجا کر دیا جہاں مومن جماعتیں تیار ہوتی تھیں، مگر فرقہ یہ تھا کہ ان خانقاہوں میں فرد ہاتھ پاؤں پر توڑ کر بے عمل نہیں رہتا۔ بلکہ کسی نہ کسی کارآمد اجتماعی مشغلے، مثلاً "زراعت یا تجارت میں مصروف ہوتا ہے، خانقاہ خود کفیل ہوتی تھی۔ سنوسیوں نے اپنے مثبت رویے اور نادر نظام کے ذریعے مسلمانوں کا ان کی ثقافت اور روایات وغیرہ پر، صرف دوبارہ اعتماد ہی بحال نہیں کیا تھا، بلکہ انہوں نے اطالویوں کے جبر و استبداد کا اس ثابت قدمی سے مقابلہ کیا کہ اس کی مثال مزاحمت اور آزادی کی تحریکوں میں مشکل سے ملتی ہے۔ "الجزائر میں" جمعیت العلماء الجزائر" نے (جن کے قائد عبدالحمید بن بادیس اور ان کے بعد شیخ الابرار بھی تھے)، اور ان کے قائم کردہ مختلف اداروں نے (جن میں سے اہم قرآن کریم کے مدارس تھے) اس موقف کو اختیار کرنے میں سبقت کی۔ اس "جمعیت" نے مدارس کے ذریعے الجزائر قوم کی اصل ثقافت اور ان کے اسلام اور عربیت سے ربط و ضبط کی حفاظت و ترویج کی۔

انڈونیشیا میں اس موقف کی حامی سب سے مشہور جماعت "دارالاسلام" ہے۔ اسی طرح ترکی میں ہمیں "تحریک نور" نظر آتی ہے جسے شیخ سعید النورسی نے قائم کیا تھا۔ انہی تحریکوں میں سے ایک "انخوان المسلمین" کی جماعت ہے جو بلا استثناء تمام بلاد عرب پر محیط ہے اور جو اس دور کی سب سے زیادہ جامع اور وسیع اسلامی تحریک ہے جس سے عصر حاضر کے مسلمان واقف ہیں۔ اس تحریک نے بڑی جرأت اور پامردی سے مغربی تہذیب و ثقافت پر تنقید کی اور اس

کامنڈر منہ سامنا کیا اور بطور ”حملہ آور“ مبلغ کے، مغرب کا مقابلہ کیا۔ یہ موقف ایسے گہرے مطالعے اور ایسی انتھک جدوجہد کا تقاضا کرتا تھا جو بہت ہی مربوط اور نچتہ ہوں۔ اس کے علاوہ مغربی تہذیب کی فطرت اور ساخت سے بھی گہری واقفیت کی ضرورت تھی اس کے ساتھ ساتھ، اسلام، اس کے نظاموں، اسلوبوں اور ثقافتِ اسلامی کے لیے بڑا جرأت مندانہ اقدام درکار تھا اس کا تقاضا یہ بھی تھا کہ وہ موقف اختیار کیا جائے جو مشہور سیاسی لیڈر جمال الدین افغانی کے موقف سے، اور اسلامی ثقافت کے ”ویل دفاع محمد عبدہ کے موقف سے مختلف ہو، جنہوں نے اسلامی اور مغربی ثقافت میں ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ مغربی تہذیب کا تجزیہ غرصہ دراز سے شروع ہے۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے اس موضوع پر فلم اٹھایا ان میں امیر شکیب ارسلان ہیں، جنہوں نے اپنی کتاب ”سماذا حنا“ **خَرَّ الْمُسْلِمُونَ وَتَقَدَّمَ عَلَيْهِمْ** (مسلمانوں کی پسماندگی اور غیروں کی سبقت کے اسباب) میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ تبصرہ کیا کہ:

”ہر پرانی چیز قابل ترک اور ہر نئی چیز قابل قبول نہیں، بلکہ ہوتا یہ چاہیے کہ علم میں اور عمل میں بہترین چیز کو اختیار کیا جائے اور اس سے صرف نظر کیا جائے کہ فلاں چیز جدید ہے اور فلاں قدیم“

ان کی رائے میں مغرب سے استفادہ کرنے کی تحریک اپنی ذات میں کوئی خطرناک بات نہیں لیکن مغربی ثقافت کو اس کی پرائیوں سمیت اختیار کرنا نقصان دہ ہے۔ امیر ارسلان کہتے ہیں:

”مغرب نے مشرق پر سرداری کی اور اس کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ مشرق کے لوگوں نے خود محسوس کیا کہ وہ گھر گئے ہیں اور مغرب سے آنے والوں کے سامنے بے بس ہو گئے ہیں۔ اس لیے وہ مغرب سے نجات پانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اعلان کیا: ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس (مغرب) کا مقابلہ انہی ہتھیاروں سے کریں جو اس کی کامیابی کا باعث تھے اور چونکہ مغربی ثقافت ہی یورپ کا وہ ہتھیار تھا جس کی بنیاد زیادہ تر سائنسی علوم تھے جن کی بدولت مغرب پانی اور بجلی کی تسخیر پر قادر ہوا، اس لیے انہوں نے (مشرقیوں) کہا کہ ہمارے لیے اس ثقافت کو اپنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں“



اس کے بعد امیر ارسلان کہتے ہیں:

”یہ بھی خطرے کی بات نہ تھی، لیکن خطرہ اس میں ہے کہ ہم اس (مغربی) ثقافت کو پورا سے کا پورا اختیار کر لیں اور اس کی جملہ برائیوں سمیت اُسے لے لیں اور اس کے تمام ماری و روحانی نظریات بلا استثناء اپنالیں۔“

آخر میں امیر شکیب ارسلان کہتے ہیں کہ علم سے استفادہ الگ چیز ہے اور شخصیت سے محرومی الگ چیز۔ یورپی علوم حاصل کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنی اصل نسل کو بھلا دیں اور اس کی وجہ سے اپنی قومیت سے انکار کر دیں۔ ان علوم کو حاصل کرنا، اور اپنے اسلام اور عربیت پر قائم رہنا بیک وقت ممکن ہے۔ اس سلسلے میں وہ جاپانیوں کی مثال دیتے ہیں جو تمام علوم اپنے وطن لے گئے اور ان میں ان کے ”موجدوں“ سے بھی برے گئے مگر جاپانی ہونے سے انکار نہ کیا۔ خود فرنگیوں کا یہی حال ہے انہوں نے مشرق سے تمام علوم اپنے ہاں منتقل کیے مگر مشرقی بننے سے ابا کرتے ہے۔ مغربی تہذیب و ثقافت پر تنقید کرنے والوں میں مشہور مسلم مفکر اقبال بھی شامل ہیں۔ انہوں نے اپنی تنقید میں کہا کہ مغربی تہذیب سے مہوت ہونے اور جذبہ بھیا جانے کے باعث اس کی طرف مائل ہونے کی ترغیب پیدا ہوئی، لیکن بعد میں جب یہ مروجہ بیت ختم ہوئی اور بے شمار مسلمان یورپ میں تعلیم حاصل کرنے گئے تو ان پر مغرب کی زندگی کے اسرار منکشف ہوئے اور ان میں بے شمار لوگ اس تہذیب کے مستقبل سے مایوس ہو کر، اور اس کے نکتہ چیں بن کر لوٹے۔

اقبال نے اپنی کتاب ”اسلام میں فکر و نبی کی تجدید“ میں تہذیب مغرب پر نکتہ چینی میں وہ معنی آفرینی کی ہے کہ وہ اسلام کے سب مفکرین اور فلسفیوں سے اس معاملے میں سبقت لے گئے۔ اقبال کی رائے میں جملہ سیاسی، فکری اور اقتصادی نظریات، جنہوں نے تہذیب مغرب سے جنم لیا، خواہ وہ ”سرمایہ دارانہ ہوں یا اشتراکی، سب کے سب گمراہی، ہوسناکی، بے اطمینانی اور اضطراب کا شکار اور خدا سے غفلت اور انسانیت سے فریب کے مزینکب ہیں، اشتراکیت، علم، دین اور اقدار کی دشمن ہے اور سرمایہ داری زندوں کے جسموں سے روح کھینچ لیتی ہے اور مزدوروں اور غریبوں کے منہ کا لوالہ چھین لیتی ہے۔ گو یا دونوں نظام ہی ماوسے میں غرق ہیں۔ ان کے جسم تو تانا اور چمکدار ہیں لیکن دل تاریک اور گنہگار ہیں۔ پھرہ روشن، اندرون جنگیز سے تاریک تر!“

اقبال کی رائے میں یورپ جس علم و حکمت کی طرف دعوت دیتا ہے، وہ محض کھوکھلا ڈھانچہ ہے

جس کے پیچھے ان کے مشتبہ عزائم پوشیدہ ہیں۔ انہوں نے کہا:

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبیر، یہ حکومت  
پہنتے ہیں لو، دیتے ہیں تعلیم مساوات  
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس  
کیا کم ہیں فرنگی مدنیّت کے فتوحات

اسی لیے علامہ اقبال اس دور کے مسلمانوں کو ہم عصر مغربی افراد کی طرح نہیں دیکھنا چاہتے، کیونکہ مغرب کا انسان اپنے تمام تشیدی فلسفوں اور سائنسی تحقیق کے باوصف، ورطہ حیرت میں ہے۔ اس کے فطری مذہب نے اُسے فطرت کی طاقتوں پر حکمرانی تو عطا کر دی لیکن اس دور میں اس کا ایمان یقین جاتا رہا۔ آخر میں اقبال نئے دور کی نوید دیتے ہیں، جس میں پرانی بنیادیں ختم ہو جائیں گی اور یہ مادی زندگی اور سوداگری دم توڑ دے گی:

”زمانہ نئے دور کو جنم دے گا۔ وہ پیمانہ دور جسے مغرب کے باسیلوں نے قمار خانہ بنا

دیا اور جس میں امن عالم اور قوموں کا وقار داؤ پر لگا دیا، اب نزع کے عالم میں ہے۔“

بے شمار مسلم مفکرین جو اس موقف کے حامی ہیں، مغربی ثقافت پر تنقید اور اسلامی ثقافت پر

دوبارہ اعتماد اور اس کے اصل سرچشموں کی طرف رجوع پر متفق ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم تفصیل سے

ان کے خیالات پیش نہیں کر سکتے، لیکن اگر کوئی قاری اس موضوع سے دلچسپی رکھتا ہو تو اسے ان تصنیفات

کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے:

سید قطب شہید: خصائص التصور الاسلامی و مقوماته۔ المستقبل لهذا الدين -

العدالة الاجتماعية في الاسلام۔ معالم في الطريق۔

مجموعہ خطوط۔

حسن النباشہید

: تجدید احيائے دین مسلمانوں کی سیاسی کشمکش۔ اسلام اور مغربی تہذیب۔

مولانا سید مودودی

: وجهة العالم الاسلامی۔ مشكلة الثقافة۔ فكرة كومنولث

مالک بن نبی

الاسلامی۔ آفاق جزائریة۔ المعركة المفاهيمية في البلدان

المستعمرة۔

: مناہج البحت عند مفكری الاسلام۔ نشأة الفكر الفلسفی

علی سامی الفشار

فی الاسلام

: لما و اقاخر المسلمون و نقدتم غیرهم

امیر شکیب ارسلان

مولانا ابوالحسن ندوی : ما فاخرس العالم بالخطاط المسلمين - الصراع بين الفكرة  
الاسلامية والغربية -

ڈاکٹر محمد الہی : الفکر الاسلامی الحدیث وصلنتہ بالاستعمار الغربی

ڈاکٹر محمد محمد حسین : الاتجاهات الوطنية فی الادب المعاصر -

مصطفیٰ اعادق الرافعی : المعركة بين القديم والحديث -

محمد الحضر حسین : نقص کتاب فی الشعر الجاهلی

ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی : من روائع حضارتنا -

ان گوششوں کا اثر ہوا اور ان کی بدولت اپنی ذات پر بھرپور اعتماد کا رجحان پیدا ہوا جبکہ ان سے پہلے مسلمانوں کا احساس کمتری اور اپنی شخصیت کے اظہار کا فقدان، شرمناک حدوں کو چھو رہا تھا یہاں تک کہ ڈاکٹر طاہر حسین کو زبان وادب پر اپنا خطاب "الحمد للہ" اور نبی کریم پر درود و سلام سے شروع کرنے پر یہ کہہ کر معذرت کرنا پڑی:

"میرے حاضرین میں سے کچھ افراد اس خطاب کو خدا کی حمد اور نبی پر صلوات سے شروع کرنے پر شاید مضحکہ خیز سمجھیں کیونکہ یہ زمانے کے معمول اور روش کے خلاف ہے۔"

یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد ہم عرب اور اسلامی ممالک میں موجودہ اسلامی تحریک کی طرف آتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ وہ درج ذیل مقاصد حاصل کرنے کے قابل ہو گئی:

- (۱) مسلمانوں کا اپنے پیغام، ثقافت، تاریخ اور مستقبل پر دوبارہ اعتماد۔
- (۲) اسلامی اقدار پر دوبارہ بھروسہ اور ان کے گرد بننے ہوئے شکوک و شبہات کے جالوں کی صفائی۔
- (۳) اسلامی ثقافت کی اس خواب غفلت سے بیداری، جو مسلمانوں کی زندگی پر اس دوزخ طاری تھی۔ اب مسلمان اپنے گزشتہ کل اور آج کے درمیان تذبذب کا شکار نہیں۔
- (۴) ایسے افکار کی تشکیل جو غور و فکر اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہیں اور صرف ایک قدر، یعنی اسلام کی قدر پر یقین رکھتے ہیں۔

(۵) اسلام کو بنیادیت خود طاقت اور خود مقصدیت کی حیثیت سے سامنے لانا، اور اسی طرح اسے زندگی میں بھی توانائی کا منبع سمجھنا۔

(۶) اسلامی ممالک میں اس مضبوط رجحان کی تعمیر، جس کے ذریعے مسلمانوں کے اسلامی تشخص، امتیازی شان اور آزادی کی ضمانت حاصل ہو سکے۔

## حواشی

- ۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: الاستاذ ابو الحسن ندوی: الصراع بين الفكرة الاسلامية والغربية۔
- ۲۔ ایضاً
- ۳۔ سرسید احمد خاں اور علی گڑھ کے بارے میں مصنف کے خیالات قطعی نہیں کہے جا سکتے اور شاید کسی غلط فہمی یا سطی معاملے کا نتیجہ ہیں۔ سرسید کے افکار اور تحریک نیک نیتی پر مبنی تھی اگر نتائج غلط نکلے تو سرسید کا تصور نہیں۔ اس کے علاوہ مالی امداد بھی عامۃ المسلمین نے زیادہ کی لیکن انگریزوں سے معاونت کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ (مترجم)
- ۴۔ ڈاکٹر محمد حسین: الاتجاهات الوطنية في الادب العربي المعاصر۔
- ۵۔ ڈاکٹر طہ حسین نے بعد میں چند کتابیں اور مضامین ایسے تحریر کیے جن سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ آخر میں اس نقطہ نظر سے "تائب" ہو گئے۔
- ۶۔ ڈاکٹر محمد محمد حسین: الاسلام والحضارة العربية۔

## اسلام کی آفاقیت اور انسان دوستی

اسلام اس لیے آیا کہ مختلف معاشروں، حالات اور مراحلِ زمانی میں آسمان کا رابطہ زمین سے ہو جائے اس لیے یہ تمام انسانوں کے لیے دعوتِ عام ہے اور کسی ایک امت، زمانے یا معاشرے سے مختص نہیں، نہ اللہ کی راہ میں اس کی دعوت کسی خاص قوم کے لیے ہے۔ اسلام کی دعوت عربوں کے علاوہ دوسروں پر بند نہیں، بلکہ یہ تو ساری نوعِ بشر کے لیے ہے۔ اس بات کی وضاحت رسول کریمؐ سے قرآن کے خطاب سے، اور قرآن کے بارے میں آپؐ کے قولِ مبارک سے ہوتی ہے۔ کیونکہ قرآن ہی اسلام کا پیغام ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وما اوسلناک ..... بشیر و فذیراً (سبا: ۲۸)

واوسلناک ..... شهیداً۔ (النساء: ۱۰۵)

یہ آیات اس بات پر واضح دلالت کرتی ہیں کہ رسولؐ کو پوری انسانیت کی طرف مبعوث کیا گیا جس جس قرآن سب لوگوں کے لیے ہدایت ہے:

ہذا بیان ..... للمتقین (آل عمران: ۱۲۸)

انا انزلنا الیک ..... بما اوداک اللہ (النساء: ۷۹)

وقرآنا ..... تفتیلاً (الاسراء: ۱۰۶)

ان آیات کی روشنی میں کسی قوم کے لیے مناسب نہیں کہ وہ باقی سب اقوام کو چھوڑ کر قرآن کو اپنے لیے مخصوص کر لے، کیونکہ اللہ نے اسے سب انسانوں کے لیے ”بیان“ اور ”میزانِ حکم“ قرار دیا ہے کہ اپنے

امور معاملات میں اسی سے رجوع کریں۔

یہ آفاتیت سارے ابتدائے دعوت کی صفت رہی ہے اور حضورؐ سے پہلے بھی ایسا کسی ایک اُمت ہی سے مخاطب نہ تھے، نہ ان کا پیغام کسی ایک اُمت ہی سے مخصوص تھا، اگرچہ بعض اوقات کسی ایک اُمت میں کئی رسول بیک وقت مبعوث ہوئے۔ قرآن نے فرمایا:

وانزل التوراة..... الناس (آل عمران: ۳-۴)

اس کا سبب شاید یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک سب ہی نوع انسان ایک ہی وحدت تشکیل دیتے ہیں اور ان کے مختلف گروہوں، فرقوں یا افراد میں ان کی اصیبت، فطرت یا انجام کے لحاظ سے کوئی وجہ امتیاز نہیں کیونکہ سب انسان ایک ہی اصل سے پھولے ہیں۔

یا ایہا الناس..... نفس واحدة (النساء: ۱)

یہی "نفس واحدہ" تحقیق و تجربے کے بعد مذکورہ نوشت کا منبع ہے۔

یا ایہا الناس..... ذکر (المجرات: ۱۳)

اور پھر ان کا منبع ایک "باپ" سے جو مٹی سے پیدا ہوا

جیسا کہ رسول کریمؐ نے فرمایا:

"لوگو! تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے، تم سب آدم سے ہو اور آدم مٹی سے ہیں۔ تم سب میں زیادہ پرہیزگار رہی سب سے معزز ہے، کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی سرخ کو گورے پر اور گورے کو کالے پر تقویٰ کے سوا کوئی فضیلت حاصل نہیں" (منتقى علیہ)

انسان کی فطرت ایک ہے، جس میں کوئی فرق نہیں۔ اللہ نے ارادہ کیا کہ انسان کو مٹی سے تخلیق کرے اور اس میں اپنی روح چھونکے:

واذ قال..... فقعوا لله ساجدين (ص: ۴۲-۴۱)

انسان کی یہ فطرت ایک ہے، خواہ اس کا تعلق زمین کے کسی خطے سے ہو اور اس کی زیب و زینت، مال و متاع اور خواہشات کیسی ہی کیوں نہ ہوں:

تدین الناس..... الحیاة الدنیا (آل عمران: ۱۴)

نہیروثر، صلح و فساد وغیرہ کی استعداد کے لحاظ سے بھی یہ فطرت ایک ہے:

ونفس وما سواها..... من وساها (الشمس: ۱۰-۷)  
نعمتوں سے کفران و انکار اور شکر سے نفور کے لحاظ سے بھی ایک ہے:

ولکن..... لايشكرون (البقرہ: ۲۴۳)

وان كثيرا..... لنا (المائدہ: ۴۹)

ولکن اکثر..... لا يؤمنون (الرعد: ۱)

پھر ان کی خلعت اور انجام بھی ایک ہے۔ ہر نفس کو جان دینی ہے اور ساری انسانیت کو فنا ہوتا ہے، اس کے بعد حشر نثر اور حساب کتاب ہو گا جس کے نتیجے میں دائمی جنت یا دوزخ کی آگ ملے گی۔

كل نفس..... يوم القيامة (أل عمران: ۱۸۵)

وآل قوا يوماً..... نفس شيئاً (البقرہ: ۲۸)

ان آیات کے علاوہ، اس وحدت کی یکساں ابتداء اور انجام پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول کتنا بلیغ ہے:

وخلقكم..... كنفس واحدة (لقمان: ۲۸)

چونکہ انسانیت اپنی اصل، فطرت اور انجام کے لحاظ سے جو اسے پہنچ کر رہے گا، ایک ہے اس لیے لازماً اس کے لیے ایک ہی ”پیغام“ ہونا چاہیے تھا۔ اس کے فرائض بھی یکساں ہونے چاہئیں۔ اور اس سے خدائے واحد کی عبادت ہی کا تقاضا ہونا چاہیے، تاکہ اس کائنات اور دنیاوی زندگی سے لوگ یکساں لطف اٹھائیں، اس کی نشانیوں میں غور کریں اور آخرت اور دائمی زندگی کا راستہ اختیار کرنے پر سوچ بچار کریں۔

اس باعث قرآن نے کائنات اور دنیاوی زندگی کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے تمام انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دی:

ان في خلق..... لايات (أل عمران: ۱۹۰)

در اسی وجہ سے اس نے تمام انسانوں کو اس کائنات کے خالق اور کارساز ہی کی عبادت کا حکم دیا۔

يا ايها الناس..... من قبلكم (البقرہ: ۲۱)

در اسی سبب سے اس کی دعوت سب کے لیے تھی کہ جو کچھ اللہ نے ان کے لیے پیدا کیا ہے اس سے حذر اٹھائیں۔

يا ايها الناس..... حلالاً طيباً (البقرہ: ۱۶۸)

سب لوگ ان تمام معاملات میں ایک امت ہیں اور اس کی تاکید قرآن کریم کر رہا ہے:

كان الناس امة واحدة (البقرہ : ۲۱۳)

وما كان ..... فاختلقوا (یونس : ۱۹)

وہ واحد میدان جس میں لوگ ایک دوسرے پر سبقت لے جاسکتے ہیں رسالت اور اس کے قبول کرنے، اس سے نسبت اور اس کے عمل کرنے سے ہے۔

كنتم خيرة ..... تو منون بالله (آل عمران : ۱۱۰)

وكذلك جعلنا ..... شهيدا (البقرہ : ۱۴۳)

اس طرح اسلام ان تمام اسباب کی، جو لوگوں کو اسلام کا پیغام قبول کرنے سے مانع ہوں، یا ان میں کسی معقول بنیاد کے بغیر امتیاز و فوقیت کا باعث ہوں، لہٰذا کہتا ہے۔ امتیاز و فوقیت کا وہ اہم سبب، جس کو اسلام پسند نہیں کرتا، رنگ و نسل، جنس و قوم کا تعصب ہے اور ہم تعصبات کی تمام اقسام کے بارے میں رسالت محمدیہ کا موقف مختصر طور پر پیش کرتے ہیں۔

## رنگ کا تعصب

رنگ کی وجہ سے امتیاز کی، اسلام جیسے عقیدے میں، جو انسانیت کی وحدت پر ایمان رکھتا ہو، کوئی جگہ نہیں۔ اس میں ”تیلے“ یا زیادہ ”پاک“ خون کو فوقیت دینے کی کوئی گنجائش نہیں، جس نے لوگوں کو مختلف گروہوں اور طبقات میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس میں اس جنس کے لیے بھی ”تخلقت طبیعی“ ہونے سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش نہیں جو سفید فام ہونے کی دعویٰ ہے اور جس میں انسان و دیگر کو حقیر سمجھتا ہو۔

”وہ تہذیب جس میں کوئی رنگ یا نسل دوسروں پر فوقیت نہ رکھتی ہو، ہر عقلمند اور نیک

انسان کے نزدیک باعث سعادت ہے، اور اسی میں خوش اطوار اور پاکیزہ اخلاق

انسانیت کی بھلائی ہے۔ وہ تہذیب جس میں کسی سفید فام کو عزت اور سیاہ فام کو ذلت

تعصیب ہو، یا سفید رنگت والے کا مہاب اور ان سے سواد دوسرے ناکام ہوں جاہلانہ

تہذیب ہے جسے انسان ہزاروں برس پیچھے چھوڑ آیا ہے کہ یہ گور نظری، تکبر، بہالت

اور حماقت کی علامت ہے“



انحضرت کا یہ قول کتنا عمدہ ہے جو اس قسم کے عقائد سے متعلق ہے،

”تم ایسے انسان ہو جس میں جاہلیت (کے آثار) ہیں۔“

یہ بات حضورؐ نے ایک جلیل القدر صحابی کو دوسرے مسلمان کو ”یا ابن القفر“ (اسے جلالت کے بیٹے) کہہ کر عار دلانے پر فرمائی۔ آپؐ کا یہی قول علم اور جہالت، تہذیب انسانی اور تہذیب جاہلی میں حد فاصل ہے۔ اسلام کا اس بارے میں نظریہ، محض نظریہ یا صرف دعوت ہی نہیں جسے عمل سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اس نظریے کو بے شمار موقعوں اور مقاموں پر نافذ کیا گیا اور اس پر اب بھی عمل کیا جا رہا ہے، مثلاً مسجد میں سفید فام اور سیاہ فام دونوں ایک ہی خاک پر اللہ عزوجل کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں اور اس کے آگے گزر گرانے ہیں۔ اسی طرح حج کے موقع پر ساری انسانیت سے رنگا رنگ عناصر ایک ہی مقام پر جمع ہوتے ہیں، ایک ہی لباس میں ہوتے ہیں جس میں گورے یا کالے میں کوئی امتیاز نہیں، ہوتا، نہ گورے کو کالے پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ نظریہ انسانیت اس وقت انتہا کو پہنچ گیا جب رسول اللہؐ نے فتح مکہ کے دن، بلال حبشیؓ کو کعبہ میں اذان دینے کا حکم دیا کہ وہ لوگوں میں کلمہ حق کا اعلان کریں۔ کعبہ تو عربوں کے نزدیک جاہلیت میں بھی سب سے معزز گھر تھا اور اسلام نے اسے مومنوں کا قبلہ قرار دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلالؓ کو، جن کی رنگت سیاہ تھی، جملہ مسلمانوں میں سے کعبہ شریف پر چڑھ کر اذان دینے کے لیے منتخب فرمایا، حالانکہ ان میں قریش کے مشرف اور سردار بھی موجود تھے آپؐ کا یہ عمل اس بات کا اعلان تھا کہ انسان کو مشرف اس کے علم اور اخلاق کی وجہ سے ہو سکتا ہے، پھرے کی ساخت یا رنگت سے نہیں۔

تاریخ اسلام میں اسلامی تہذیب کی انسان لازمی اور مختلف جنسوں، عناصر اور رنگوں میں مساوات کی بہت شمار مثالیں موجود ہیں۔ ان میں بڑے بڑے سپہ سالار، علما و کبار اور حاکم گزرے ہیں جن کے آگے لوگ تسلیم خم کرتے تھے اور بڑے بڑے قاضی وغیرہ تھے جن کی مثال ہمارے زمانے کی کسی تہذیب میں، جیسا کہ مثلاً امریکی تہذیب ہے، مشکل سے ملے گی۔ اور ہماری تہذیب نے یہ کارنامہ چودہ سو برس قبل سرانجام دیا تھا۔

ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی مرحوم نے اپنی گرانقدر کتاب ”من روالح حضارتنا“ (ہماری تہذیب کے شاندار کارنامے) میں لکھا ہے: ”بلکہ جب مسلمان مصر میں فاتح بن کر داخل ہوئے اور باہلیون کی فصیل کے باہر آٹھرے تو مقوقس نے مسلمانوں سے مذاکرات کی خواہش کی۔ اس نے ان کے پاس اپنا وفد یہ جانتے کے

بھیجا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور انہیں بھی اپنا وفد اپنے پاس بھیجنے کو کہا۔ عمرو بن العاص نے دس افراد کا ایک وفد روانہ کیا جس میں عبادة بن الصامت بھی تھے، عبادة نے سیاہ فام اور اونچے لمبے تھے اور کہا جاتا تھا کہ ان کا قد دس بالشت ہے۔ عمرو بن العاص نے انہی کو گفت و شنید کرنے کا اختیار دیا جب مسلمانوں کا وفد مقوقس کے دربار میں پہنچا تو عبادة آگے آگے تھے۔ مقوقس ان کی سیاہ رنگت سے حیرت زدہ ہو گیا اور کہا: اس حبشی کو ہٹاؤ اور کسی اور کو مجھ سے بات چیت کے لیے آگے کرو۔ وفد کے سب ارکان نے یک زبان ہو کر کہا: یہ حبشی اپنی رائے اور علم کے لحاظ سے ہم سب سے افضل ہے وہ ہم سے بہتر ہے اور ہمارا فائدہ ہے اور ہم سب اس کی رائے اور قول کے پابند ہیں۔ ہمارے امیر نے ہم سے قطع نظر اس کو حکم دیا ہے اور ہمیں حکم دیا ہے کہ اس کی رائے اور قول کی مخالفت نہ کریں۔ مقوقس نے کہا: تم لوگ اس سیاہ فام کو اپنا سردار ماننے پر کس طرح راضی ہو گئے؟ یہ تو تم سے کمتر حیثیت کا ہونا چاہیے۔ وفد نے کہا: ہرگز نہیں، اگرچہ یہ تمہاری نظر میں سیاہ فام ہے مگر اپنے مرتبے کے لحاظ سے ہم سے افضل ہے اور پیش قدمی، عقل اور رائے کے لحاظ سے بھی ہم سے بہتر ہے، ہم میں رنگت کی سیاہی باعث عار نہیں۔ مقوقس نے عبادة سے کہا: اے سیاہ فام آگے بڑھو اور مجھ سے آرام سے بات کر کیونکہ تمہاری سیاہ رنگت سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ اگر تم نے سخت کلامی کی تو تمہاری دہشت میں اضافہ ہو گا۔ عبادة نے سیاہ رنگت سے مقوقس کے خوف کو دیکھتے ہوئے کہا: ہمارے لشکر میں ایک ہزار سیاہ فام ہیں جو مجھ سے بھی زیادہ کالے ہیں!

یہ تو دور کی بات ہے، اس پچیسویں صدی کے "ہند" افراد بھی، رنگت کی سیاہی کو نقص تصور کرتے ہیں اور سیاہ فاموں کو ان مناصب کا اہل نہیں سمجھتے جس پر گور سے فائز ہیں۔ ہماری تہذیب ان تمام مفہومات کو پارہ پارہ کرتی اور ان خیالات کو باطل قرار دیتی ہے اور برتری کی ان تمام اقسام کی نفی کرتی ہے جو چہرے کی رنگت یا خون کے اختلاف پر زور دیتی ہیں اور بانگِ دہل اعلان کرتی ہے کہ سیاہ فام کو زیادہ عالم، زیادہ صاحبِ رائے اور زیادہ جرئی ہونے کی وجہ سے سفید فام پر سلیقت حاصل ہے۔ گور سے اور کالے میں کی ہماری تہذیب تائید کرتی ہے نہ اس کو تسلیم کرتی ہے۔ تاریخِ اسلامی میں کہیں کسی ایسے اسلامی معاشرے کا ذکر نہیں ملتا جو صرف فاموں پر محدود ہو اور سیاہ فام اس کے رکن نہ ہوں، نہ کسی ایسے واقعے کا تذکرہ ملتا ہے جس میں انسان پر رنگت کی وجہ سے ظلم ہوا ہو، کیونکہ ہماری تہذیب میں سیاہی اور سفیدی کا تعلق اعمال سے ہے، رنگت سے نہیں۔

تہذیب جدید کو ماضی کی تمام معروف تہذیبوں سے زیادہ شہرت ملی ہے کیونکہ اس نے لوگوں میں  
 اخوت اور مساوات کے اصول قائم کیے ہیں اور اقوام متحدہ نے بھی "میتاق حقوق انسانی" کا اعلان کر کے  
 نظری طور پر جملہ اختلافات رنگت و نسل کو ختم کر دیا ہے اور سب انسانوں کو یکساں حقوق دیئے ہیں، مگر  
 دنیا میں اب بھی رنگت کی وجہ سے بنیادی امتیازات بدترین شکل و صورت میں موجود ہیں۔

امریکہ میں، جو حریت اور علم کی مملکت کہلاتی ہے اور انسان کو چاند پر پہنچانے کی دعوہ بنا رہے، اب  
 بھی تاریخ انسانی کی بہت بڑی لعنت موجود ہے، یعنی حبشیوں پر ظلم و تشدد، اور سیاہ فاموں پر ان تمام  
 عہدوں اور مراتب کے حاصل کرنے پر پابندی، جو صرف سفید فاموں کے لیے مخصوص ہیں۔ باوجودیکہ سیاہ  
 فاموں کو اس ملک کا شہری سمجھتا ہے جو تہذیب جدید کی علمبردار ہے، مگر عملی طور پر انہیں شہریوں کے  
 وہ حقوق حاصل نہیں جو سفید فاموں کو ہیں۔ کسی سفید فام سیاستدان نے اس کے بارے میں کہا تھا:

"کسی بھی سیاہ فام کے لیے، خواہ اس کا دل سیاسی مساوات سے لبریز ہو، جنوبی  
 ریاستوں میں کوئی مقام نہیں کیونکہ یہ علاقے سفید فاموں کی ملکیت ہیں اور یونہی رہیں گے۔"

سیاہ فاموں پر ظلم و ستم کے مظاہرے امریکہ میں ہر میدان میں نظر آئیں گے، مثلاً مدارس میں  
 اور بالخصوص جنوبی ریاستوں کے مدارس میں، گوروں اور کالوں میں مکمل الفصل ہے اور سیاہ فاموں کے  
 بچوں کو سفید فام بچوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں۔ ہر فرقے کے لیے الگ سکول اور  
 الگ کتب ہیں۔ بعض مدارس میں امریکی حکومت کے احکام کو چیلنج کیا اور سپریم کورٹ کے ان احکام  
 کو کہ گورے اور کالے ایک ساتھ تعلیم حاصل کریں، ماننے سے انکار کر دیا۔ امریکی حکومت سیاہ  
 فاموں کی بچوں کی حفاظت کے لیے فوج بھیجنے پر مجبور ہو گئی تاکہ سپریم کورٹ کا حکم نافذ کیا جاسکے۔  
 سفید فاموں کا نعرہ تھا: سیاہ فاموں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کا بائیکاٹ!

اس پوریل گاڑیوں، ہوائی جہازوں اور ہسپتالوں کو قیاس میں کیا جاسکتا ہے جہاں سیاہ  
 فاموں سے امتیازی سلوک ہوتا ہے۔ بعض ریاستوں کے قوانین کی رو سے سیاہ فام کارکنوں کے لیے  
 سفید فام مزدوروں کے ساتھ کارخانوں میں کام کرنا منع ہے، بلکہ وہ ان دروازوں کو بھی استعمال  
 نہیں کر سکتے جو سفید فاموں کے لیے مخصوص ہیں۔ کئی ریاستوں میں گوری عورتوں کو سیاہ فام مردوں  
 سے یا اس کے برعکس شادی کر کے کی اجازت نہیں، اور اگر ہو جائے تو اسے منسوخ کر دیا جاتا ہے۔  
 سیاہ فاموں اور سفید فاموں کی عبادت گاہیں بھی الگ الگ ہیں۔ ایک مرتبہ کوئی سیاہ فام جس کا تعلق

جمہوریہ پاناما سے تھا اور اسٹنگٹن کے کیتھولک چرچ میں عبادت کے لیے گیا وہاں کے ایک پادری سے یہ برداشت نہ ہو اور اس نے عبادت میں مشغول سیاہ فام کے بند ہاتھوں میں کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھما دیا جس پر سیاہ فاموں کے لیے مخصوص گرجے کا پتہ درج تھا۔ پادری نے کہا کہ جب ان لوگوں کے لیے گرجے مخصوص ہیں تو انہیں دوسروں کی عبادت میں خلل نہیں ڈالنا چاہیے۔

افریقہ میں اس کی دردناک مثالیں ملتی ہیں اور وہاں نسلی امتیاز اتنا شدید ہے کہ روکنے ٹھکڑے ہو جاتے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں تو سفید فام اقلیت، سیاہ فام اکثریت کو غلام بنائے ہوئے ہے اور وہ ملک ہی کو نہیں وہاں کے عوام کو بھی اپنی جاگیر سمجھتی ہے اور لپسی ہوئی اکثریت کو انسانی اور ملکی حقوق سے محروم کر رکھا ہے۔ یہی صورت حال روڈیشیا، انگولا اور موزمبیق وغیرہ میں ہے۔

شاید آپ یہ کہیں کہ تو دنیا کے صرف مغربی علاقوں کا حال ہے۔ مشرقی ممالک میں صورت حال کیا ہے؟ مثلاً سوویت روس اور یورپ کے دوسرے اشتراکی ممالک کا طرز عمل کیا ہے؟ اشتراکی ممالک غیر اشتراکی پر امتیاز رنگ و نسل کے سبب لعن طعن تو بہت کرتے ہیں اور وہاں مساوات کی مذمت بھی کرتے ہیں جس کی بنا پر افریقہ کے نو آزاد ممالک کے بے شمار طلبہ روس اور اس کے حلیف ممالک کی درس گاہوں میں داخلہ لیتے ہیں تاکہ وہاں کی نام نہاد مساوات اور حریت کا چرچا ہو، لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ ان ممالک میں بھی بنیادی امتیازات کی دیوار کھڑی ہے جب افریقی طلبہ نے اس پر احتجاج کیا تو اشتراکی طلبہ بگڑ گئے اور کہتے لگے: بندر کے بچو! تم اپنے جینگل میں لوٹ جاؤ۔ ایک مصری صحافی نے اپنے سانفہ پیش آنے والا واقعہ بیان کیا ہے (اور اس واقعے سے پیشتر وہ کٹر اشتراکی تھا)۔ وہ کہتا ہے:

”۱۹۵۸ء میں، میں چیکو سلواکیہ میں مقیم تھا اور مہینے میں دو تین دن ہسپتالوں

میں خدمت سرانجام دینا تاکہ کچھ جیب خرچ لے سکوں۔ اس کام میں میرے

کپڑے خون آلود ہو جاتے اور میں انہیں سرکاری لانڈری کے حوالے کر آتا، جو

ارزاں تھی۔ اس لانڈری کی نگران ایک بوڑھی عورت تھی (ان کاموں میں جوانوں کو

نہیں لگایا جاتا) میرے اور اس کے درمیان علیک سلیک ہو گئی، جسے میں اپنے

لیے اعزاز سمجھتا، حالانکہ شکل و صورت کے لحاظ سے وہ خاصی قبیح تھی مگر اس کا

حسن سلوک اس کی بد صورتی کی پردہ پوشی کر دیتا۔ میں وہاں کی زبان روانی سے

بول لیتا تھا مگر چار ماہ بعد اس نے انکشاف کیا کہ میرے پیرے پیرے سے وہ مجھے انگریز سمجھتی رہی کیونکہ میں انگریزی بھی بول لیتا تھا اور امریکن سگریٹ بھی پیتا تھا (جن میں سے اکثر وہ اپنے بیٹے کے لیے لے جاتی)۔ میں نے ارادہ کیا کہ اس کی تصحیح کر دوں۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں انگریز نہیں مصری ہوں، اس پر اُس نے حیرت کا اظہار کیا لیکن میں نے اپنے مصری ہونے پر فخر کیا۔ وہ بڑھیا خاموش ہو گئی مگر اس نے میرے کپڑے دھونے سے انکار کر دیا کہ یہ خون آلود اور گندے ہیں۔ میں نے کہا: میں ایک صحافی ہوں اور اعلیٰ وزارتِ خارجہ جا کر اطلاع دیتا ہوں کہ چار ماہ بعد، یہ جان کر کہ میں انگریز نہیں، مصری ہوں۔ تم نے میرے کپڑے دھونے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ سن کر اُس نے کپڑے مجھ سے لے لیے، مگر اس کے بعد اس کا تمام حسن سلوک ختم ہو گیا اور مجھ سے بول چال بند کر دی۔

یہ تو محض چند مثالیں ہیں جن سے یہ ظاہر کرتا مقصود تھا کہ اب بھی دنیا کے مختلف خطوں میں رنگ کا امتیاز باقی ہے حالانکہ ہم بیسویں صدی میں رہ رہے ہیں۔ اور اس دور میں دیتا نے اتنی مادی ترقی کی ہے جو اور کسی دور میں نہیں تھی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایمان، مساوات اور دوسری اقدار میں کوئی قانون، کوئی نظام اور مادی ترقی کا کوئی منظر فائدہ نہیں پہنچاتا کیونکہ یہ دل سے تعلق رکھتی ہیں اور اسلام کو دلوں اور روحوں کو پاک کرنے میں سب پر فوقیت حاصل ہے۔ حالانکہ اسے چودہ سو برس گزر چکے ہیں لیکن اب بھی اس میدان میں وہ مقدم ہے۔

## طبقاتی تعصب

طبقات اور طبقاتی تعصب کے بارے میں اسلام کا موقف بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظر گزاراں معاشرتی طبقات، انہیں بنانے والے عناصر اور تاریخی حالات پر ڈال لی جائے۔

ہر معاشرے میں ایسی انجمنیں یا گروہ ہوتے ہیں جو خون کے رشتوں پر قائم ہوتے ہیں، مثلاً خاندان، باپیتوں کے لحاظ سے قائم شدہ ٹریڈ یونینیں ہوتی ہیں، یا سکونت کے لحاظ سے ہمسائیگی کے تعلقات ہونے ہیں جیسے محلہ یا شہر، لیکن ان کے علاوہ ایسے گروہ بھی ہیں جو ان روابط پر قائم نہیں بلکہ ان میں

مراتب اور مناصب کے لحاظ سے تعلق ہوتا ہے اور انہیں کو معاشرتی طبقات کہا جاتا ہے معاشرتی طبقات کی ماہیت سمجھ لینا ضروری ہے کیونکہ یہ ان افراد کا اجتماع ہے جو ایک دوسرے سے تو برابری رکھتے ہیں مگر کسی دوسرے طبقے سے اپنے سے اس کی برتری یا کمتری کی بنا پر الگ سمجھے ہیں۔ یہ دولتاری یا بورژوا ایسے ہی طبقے ہیں اور اسی طرح جاگیرداروں اور مزاروں کے طبقے یا عیسائیوں میں پادریوں کے طبقے ہیں۔

اس حقیقت کے جان لینے کے بعد، اب ہم ان پر دو رخوں سے نظر ڈالنے ہیں۔ ایک تو موضوعی رخ ہے، یعنی کوئی غیر اس طبقے کو کیسے دیکھتا ہے اور دوسرا ذاتی رخ یعنی کسی طبقے سے تعلق رکھنے والا اپنے آپ کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ پہلے یا موضوعی رخ کے لحاظ سے کوئی مخصوص طبقہ اپنے طور طریقوں، گفتگو، لباس، تعلیم اور معاشرتی طرز عمل سے پہچانا جاتا ہے اور ایک ہی طبقے کے لوگ بالعموم یکساں اطوار وغیرہ رکھتے ہیں ان اطوار، عادات کو اقدار کہا جاتا ہے جو معاشرے میں زندگی کے مختلف اسالیب کا نام ہے۔ ان اقدار میں طبقاتی اختلاف آج کی نسبت ماضی میں بہت زیادہ تھا لیکن آج بھی کسی خاص طبقے کے فرد کو اس کے طرز گفتگو یا طرز عمل سے پہچانا جاسکتا ہے کیونکہ یہ طور طریقے مخصوص ثقافت سے پھوٹتے ہیں اور ہر طبقے کے افراد کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنی اولاد کو یہی طور طریقے ورثے میں دیں اور اسی ثقافت کی تعلیم دیں۔ یوں انواع و اقسام کے اختلافات، اجتماعی درجہ بندیوں کو محفوظ کرنے کے بیک وقت وسیلہ بھی بن جاتے ہیں اور اس کا حاصل بھی۔ یونہی یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اور اولاد در اولاد طبقاتی امتیازات منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

ذاتی یا  
رُخ سے طبقہ عبارت ہے۔ احساسات یا وجدانی صلاحیتوں کے مجموعے سے۔ یہ احساسات تین قسم کے ہیں :

اول فرد میں اپنے طبقے کے دوسرے افراد کے ساتھ برابری کا احساس۔ یہ احساس اُسے اپنے طبقے کے افراد سے ہم آہنگ کرتا، اور ان کی آپس کی معاشرت کو دور کرتا ہے۔ اپنے ہی طبقے کے افراد کے درمیان کسی فرد کو اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔

دوم، کسی فرد کو، معاشرتی درجہ بندی میں اپنے سے برتر افراد کے مقابل احساس کمتری۔ اس سے فرد طبقہ اعلیٰ کے افراد سے میل جول میں جھجک محسوس کرتا ہے اور ان میں عدم توازن پیدا ہوتا ہے۔

سوم، کسی فرد کو، معاشرتی درجہ بندی میں اپنے سے کمتر افراد کے مقابلے میں احساس برتری۔  
 بد وہ احساسات ہیں جو کسی فرد کو اپنے مخصوص طبقے سے روابط کو نچتر کرتے ہیں اور ان کی وجہ  
 سے وہ اپنے طبقے کی حمایت اور حفاظت حاصل کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسے اپنے سے اونچے طبقے  
 میں پہنچنے کا شوق ہوتا ہے۔

کسی طبقے کی تشکیل میں مدد کون سے عوامل ہیں، اس کے بارے میں بیشتر رائیں ہیں اور محققین  
 کا کسی ایک پر اتفاق نہیں۔ اس لیے یہاں سب عوامل کا یکجا مختصر ذکر کیا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے  
 کہ وہ کس حد تک طبقات کی تشکیل میں مدد دیتے ہیں اور اس کا سبب ہیں۔

سب سے پہلا عامل اقتصادی، یا معیار زندگی کا ہے، یا وہ ثروت ہے جس کے افراد مالک ہیں  
 اغلب یہی ہے کہ اسی سے کوئی فرد اپنی پسندیدہ تعلیم حاصل کرنے، یا پیشہ اختیار کرنے پر قادر ہوتا ہے۔  
 مگر صرف ثروت ہی تشکیل طبقات کے لیے کافی نہیں کیونکہ امیری اور غریبی اپنی ذات میں معاشرے  
 کے رویے نہیں، لیکن ثروت کی بنیاد پر معاشرے کی تقسیم کئی طبقات میں ہو جاتی ہے، مثلاً فردوں  
 اور محنت کشوں کا طبقہ، جو دوسروں کے لیے کام کر کے معمولی اجرت پاتے ہیں، سرمایہ داروں کا طبقہ،  
 اپنے کاروبار میں پیسہ لگا کر فائدہ حاصل کرتے ہیں، خواہ ذاتی طور پر خواہ دوسروں کے ذریعے پھر  
 زمینداروں اور جاگیرداروں کا طبقہ ہے، جو اپنی غیر منقولہ جائیداد سے آمدنی حاصل کرتا ہے۔

دوسرا عامل، پیشہ ہے، یا وہ کام جسے کوئی فرد اختیار کرتا ہے۔ اس کی رو سے کاریگروں کا  
 طبقہ ہے، جو اپنے ہاتھوں سے چیزیں بنانا کرتے ہیں، مزارعوں کا طبقہ، جو زراعت سے آمدنی حاصل  
 کرتے ہیں، پھر ڈاکروں، انجینئروں، معلموں وغیرہ کے طبقات ہیں جو آزادانہ اور مستقل طور پر  
 اپنے اپنے پیشے سے کماتے ہیں۔ فی الواقع، طبقاتی فرق پیدا کرنے میں پیشے کا بہت بڑا اثر ہے۔  
 کاتب اور مزدور، امیر لوگ تو نہیں اور ان کی آمدنی بھی محدود ہے مگر دونوں میں بے حد فرق ہے۔  
 مگر یہاں یہ مد نظر رہے کہ طبقہ پیشے پر سبقت رکھتا ہے کیونکہ کوئی انسان پہلے کسی طبقے سے منسلک  
 ہوتا ہے اور پھر مزدور یا کاتب وغیرہ بنتا ہے۔ ایک ہی طبقے کے اندر، پیشے کے علاوہ کئی اور  
 مفادات بھی مشترک ہو سکتے ہیں۔

تیسرا عامل، زندگی کا عام اسلوب ہے۔ جس طرح کی زندگی کوئی فرد یا کوئی گروہ گزارتا ہے وہ  
 طبقاتی امتیاز پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ ایک طرف پر تعیش زندگی ہے اور دوسری طرف سادہ

زندگی، تاجر پیشہ افراد میں اسی فرق سے دو الگ طبقے پیدا ہو سکتے ہیں، مثلاً وہ تاجر جو درمیانی طور پر تجارتی معاملات میں ملتا ہے اور خرید و فروخت وغیرہ کے کاموں میں بدلتے ہوئے انداز نہیں ہوتا۔ بورژوا طبقے کا فرد کہلاتا ہے۔ اس کے مقابل وہ تاجر ہے جو اپنے امور خود سنبھالتا ہے اور اپنے کارندوں کی خود نگرانی کرتا ہے، کاروباری طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔

چوتھا عامل، ثقافت ہے، بعض لوگ ثقافت اور تعلیم کو "طبقہ ساز" عامل شمار کرتے ہیں، مگر صائب بات یہ ہے کہ ثقافت، طبقات میں امتیاز کا عنصر تو ہے، طبقات پیدا کرنے میں مدد نہیں۔ یعنی اس کی وجہ سے ہم مختلف طبقات کے افراد میں ان کے اسلوب فکر، درجہ تعلیم اور معیار ثقافت کے لحاظ سے فرق دیکھ سکتے ہیں۔

ان عوامل میں ایک اور عامل کا اضافہ کیا جا سکتا ہے، یعنی مذہب، جو طویل مدت سے طبقاتی اختلاف کا ایک سبب چلا آ رہا ہے۔

ان عوامل کے بیان کرنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ طبقات سازی میں کسی ایک عامل ہی پر انحصار ممکن نہیں کیونکہ یہ سب عوامل ایک دوسرے سے مربوط اور متعلق ہیں اور ایک عرصے سے طبقاتی امتیازات کے پیدا کرنے اور سچتہ کرنے میں اثر انداز چیلے آتے ہیں۔

اگر ہم تاریخ میں طبقاتی نظام کے انداز پر نظر ڈالیں تو ہمیں اسلام کے ظہور سے پہلے کئی معاشروں کے طبقات میں مکمل اختلاف نظر آئے گا اور ظہور اسلام کے بعد بھی کئی غیر اسلامی معاشروں میں طبقاتی فصل دیکھی جا سکتی ہے، اور یہی نظام کئی انسانی معاشروں میں اب تک رائج چلا آ رہا ہے۔ اسلام سے پہلے قریش کو خاص مقام، حقوق اور سرداری حاصل تھی جو عربوں میں سے اور کسی کو نصیب نہ تھی۔ وہ حج میں بھی مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے جبکہ دوسرے لوگ عرفات میں وقوف کرتے۔ ان امتیازات سے قریش کو مالی منفعت بھی حاصل ہوتی، جو وہ تمام عربوں سے وصول کرتے۔ ان کا حکم تھا کہ لوگ صرف اسی لباس میں طواف کریں جو قریش سے خریدا جائے۔ اگر یہ استطاعت نہ ہو تو بے لباس طواف کریں گے۔

"ایرانی معاشرہ نسب اور ہمز پر قائم تھا۔ اس کے مختلف طبقات میں بعد المشرقین تھا اور ربط و ضبط کی کوئی صورت نہ تھی حکومت کی طرف سے عوام الناس پر کسی امیر کبیر شخص سے جانید اور خیریت پر پابندی تھی۔ انسانی حکومت کا قانون تھا کہ ہر شخص اپنے ہی دائرے میں رہے جو اسے اپنے



نسب سے حاصل ہے اور اپنے سے بالاتر طبقے سے منسوب ہونے کی کوشش نہ کرے۔ ہر شخص صرف وہی پیشہ اختیار کر سکتا تھا جس کے لیے خدا نے اُسے پیدا کیا تھا۔ ایران کے شہنشاہ کسی بیچ ذات کو کوئی وظیفہ نہیں دیتے تھے۔ عوام میں بھی واضح امتیازات کے ساتھ کئی طبقے موجود تھے اور ہر ایک کا اس معاشرے میں، محدود دائرہ عمل تھا۔

اس طبقاتی تفاوت نے انسان کو ذلیل کر کے رکھ دیا تھا اور اس کا واضح مظاہرہ اس وقت ہوتا جب وہ اشراف و امراء کی مجالس میں حاضر ہوتے اور یوں گم صم کھڑے رہتے گویا انسان نہ ہو مٹی کے بُت ہوں۔

ہندوستان میں طبقاتی نظام اس سے بھی بدتر شکل میں موجود تھا اور طبقے طبقے میں شدید تفاوت تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی مثال دنیا بھر میں کہیں نہ تھی۔ اس نظام تلے انسانیت رسوا ہوئی اور اس کا شرف پامال ہوا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اہل ہند نے اس نظام کو اپنے مذہب اور معاشرے کا جزو بنا لیا اور ہزاروں برس سے اس پر عمل پیرا ہیں۔

حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے تین صدیاں پہلے ہندوستان میں برہمنی تہذیب ظاہر ہوئی۔ جس نے قانونِ مدنی و سیاسی کے ذریعے اپنے ہم وطنوں کو چار واضح فرقوں یا "دروں" میں تقسیم کر دیا۔ براہمن، جو مذہبی فرقہ تھا اور مذہب کا محافظ تھا، کھشتری، جو جنگ جو افراد پر مشتمل تھا، ویش، جو اہل زراعت و تجارت تھے اور شودر، جو باقی سب کی خدمت پر مامور تھے۔ طبقہ برہمن نے اپنے آپ کو وہ حقوق عطا کر رکھے تھے جو انہیں خدا بنا دینے تھے۔ اور وہ اپنے آپ کو خدا کے چیدہ، لوگوں کے حاکم، تمام مخلوقات سے افضل اور لوگوں کے سردار کہلاتے، ان کو سب گناہ معاف تھے اور اگر ان سے کوئی قتل بھی ہو جائے تو اس کی نذر صرف ہر منڈانا تھی۔ حکومت شدید ضرورت کے تحت بھی، ان سے کوئی مالی امداد طلب نہیں کر سکتی تھی۔ کھشتری فرقے کے افراد براہمنوں سے کمتر تھے مگر مافی دو طبقوں سے بالاتر تھے اور انہیں کئی مراعات حاصل تھیں۔ سب سے ذلیل طبقہ شودروں کا تھا۔ اس طبقے کو کوئی حقوق حاصل نہ تھے بلکہ قانون بھی انہیں جانوروں بلکہ کتوں سے بھی زیادہ ذلیل قرار دیتا تھا۔ انہیں امیر بننے یا دولت جمع کرنے کی قطعاً اجازت نہ تھی۔ انہیں براہمنوں کے قریب تک پھٹکنے کی اجازت نہ تھی۔ اگر ان کا ہاتھ بلکہ انگلی تک بھی کسی براہمن کو چھو جاتی تو ان کی زبانیں کاٹ دی جاتیں۔ ہندوستان تمام نر "روشنی خیالی" اور سیکولر ازم کے آج بھی اس

بتا کہ طبقاتی نظام میں گرفتار ہے اور اب بھی شور و دروں کو انسان نہیں سمجھا جاتا۔

ازمنہ وسطیٰ میں جبکہ دنیا میں اسلام کی انسان نوازی سے آگاہ ہو چکی تھی، یورپ کا یہ حال تھا کہ وہاں بھی لوگوں میں تین طبقے موجود تھے، جن میں واضح فرق تھا۔ پہلا طبقہ 'اشراف'، دوسرا 'رجال' دین اور تیسرے 'عوام'۔ ان تینوں طبقوں کے درمیان صریح اور نمایاں امتیاز موجود تھا اور کسی بھی شخص کے لیے ان کی الگ الگ شناخت، دشوار نہ تھی۔ اس نظام مراتب کو قانون کی حمایت حاصل تھی۔ طبقہ 'اشراف' کا شرف موروثی تھا اور جاگیر داری نظام کے تحت مطلق العنان بادشاہ کی اجازت سے، انہیں اپنی جاگیروں پر کام کرنے والے عوام پر ٹیکس لگانے اور سزا دینے کا اختیار حاصل تھا۔ درحقیقت یہ اشراف خود ہی مقنن، عدلیہ اور انتظامیہ تھے اور ان پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ رجال دین یا پادری اپنے مخصوص لباس سے پہچانے جاتے تھے۔ اسی عہد میں ان کو بھی وسیع اختیارات حاصل تھے اور یورپ کا اثر و نفوذ کسی طرح بھی بادشاہ، امراء اور اشراف سے کم نہ تھا۔ انہیں کی اجازت سے طبقہ 'اشراف' کو عوام کے ساتھ من مانی کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ پادری ممتاز طبقے سے تعلق رکھتے تھے کیونکہ گرجاؤں کی تحویل میں وسیع اوقاف، مذہبی ٹیکس لگانے کا اختیار اور اکثر اوقات میں لشکر بھی ہوتے تھے۔

جہاں تک عوام کا تعلق ہے، انہیں سب سے حقیر سمجھا جاتا تھا اور ان کے لیے صرف فرائض ہی فرائض تھے اور وہ حقوق سے بیکسر محروم تھے۔ ان کو نسل در نسل صرف ذلت، غریبی اور غلامی ہی نصیب تھی۔ یورپ میں امتدادِ زمانہ سے طبقات کے نام بدل گئے، مثلاً 'طبقہ' اشراف کی جگہ سرمایہ دار آگئے لیکن ان کے مزاج میں کوئی فرق نہ پڑا۔ اس طبقے کو دولت، اختیار اور طاقت اسی طرح حاصل رہی، جن کی بدولت حکم چلتا ہے، اور یورپ ابھی آزادی کے ان مظاہر سے روٹنا نہ ہوا تھا جو انتخابات وغیرہ کے ذریعے جمہوری حکومت کے قیام میں معاون بنتے تھے۔ اشراف کی ممالک میں ایک نیا طبقہ وجود میں آیا جو کہتے کو تو عوام کی حالت سدھارنا چاہتا تھا مگر اختیار، قیادت اور جملہ امور پر تصرف اسی کو حاصل تھا، جسے اس نے اس بے دردی سے استعمال کیا کہ اس کی مثال تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔

یہ بات واضح ہے کہ اسلام نے لوگوں میں جس مساوات کو عام کیا وہ محض نام کی نہ تھی۔ اسلام نے افراد اور جماعتوں کے درمیان جملہ امتیازات باطل قرار دیئے اور دنیا میں جتنے طبقات موجود

تھے ان سے بیزاری کا اظہار کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام، عام زندگی میں موجود تھا، خلقی اختلافات سے صرف نظر کرتا ہے، مگر وہ یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ کسی کو اس کے جائز حق سے محروم کر دیا جائے یا اسے اپنی استعداد اور اہلیت کے مطابق کام کرنے سے روک دیا جائے خواہ وہ اس معاشرے میں پیدا نہ ہوا ہو اور نسب و وراثت کے ذریعے بھی حق دار نہ ہو اور اسلام لوگوں کے درمیان اقدار کے تفاوت کو نظر انداز نہیں کرتا، خواہ وہ انبیاء اور مرسلین ہی کیوں نہ ہوں۔

ولقد... علی بعض... "قلک الرسل... بعضہم درجات" ﷺ اسلام علماء اور جہلاء کو برابر قرار نہیں دیتا۔ "قل هل یتنوی... لا یعلمون" ﷺ یہ بات اسلامی عدل کے منافی ہے کہ انسانوں کی جدوجہد میں تو فرق ہو مگر رزق ایک جیسا ملے: "نحن قنمنا... بعض درجات" ﷺ واللہ فضل... فی الرزق" ﷺ یاد رہے کہ علم اور رزق میں ایک دوسرے پر فضیلت کا تعلق نسب یا وراثت پر نہیں، نہ غضب و سطوت پر ہے بلکہ یہ فضیلت صرف عمل سے ہے۔ اسلام ایسے طبقات پیدا نہیں کرتا، جن میں کوئی ایک دوسرے پر جاری ہو۔ مراتب اور رزق میں تفاوت قدرتی امر ہے جسے دور کرنا ممکن نہیں، نہ کسی ترکیب سے اسے دور کیا جاسکتا ہے۔ ساری دنیا میں یہ تفاوت نظر آئے گا، حتیٰ کہ اشتراکی ممالک میں دوسرے ملکوں سے مختلف صورت حال نہیں۔ اگرچہ وہاں اصطلاحات اور نام بدل گئے ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہاں سب لوگوں کو ایک جیسی اجرت ملتی ہے یا رزق کی تقسیم میں بعض کو بعض پر فوقیت حاصل ہے؟ کیا سب لوگ وہاں افسر ہیں اور ماتحت کوئی نہیں؟ کیا وہاں سب کے سب جرنیل ہیں، عام سپاہی کوئی نہیں؟ حاصل امر یہ کہ اس تفاوت سے مفر نہیں اور ہر انسانی معاشرے میں یہ حقیقت واقع ہے ﷺ قرآن کریم نے آیات سابقہ میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

طبقاتی نظام میں فرائض مجیدہ میں صرف ایک صورت مذکور ہے اور وہ غلاموں کا وجود رہنے پہلے ذکر کیا ہے کہ غلامی کا نظام اسلام نے پیدا نہیں کیا بلکہ یہ حالات کامرہوں تھا۔ فوری طور پر اسلام کے لیے اسے ختم کرنا ممکن نہ تھا مگر اسلام نے رفتہ رفتہ ایسے احکامات صادر کیے جن سے اس نظام کا خاتمہ ممکن ہو گیا۔ غلامی اسلامی معاشرے کا اصل الاصل نہیں بلکہ محض عارضی ضرورت تھی جو احوال و اسباب کے ختم ہوتے ہی مٹ گئی۔ اہل کی جبکہ اسلام نے اخوت کو فروغ دیا جس سے معاشرے کے تمام افراد ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔

”انما المؤمنون اخوة“<sup>۱۰</sup>

اس اخوت نے ہر مسلمان فرد کے دل میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی جماعت سے وابستہ ہے اور اس کی بھلائی خود اپنی بھلائی ہے، اسی طرح جماعت کے دل میں بھی یہ احساس پیدا کیا کہ اُسے فرد کے مفاد اور بھلائی عزیز ہونا چاہیے۔ اس باہمی احساس سے روحانی اور مادی فوائد حاصل ہوئے اور اخوت مضبوط اور پائیدار بنی۔ اسی اخوت سے معاشرہ یکجان اور ہم آہنگ ہو گیا اسی وحدت کو نبی کریمؐ نے یوں بیان فرمایا:

”مومنوں کی آپس میں محبت، رحمدلی اور ہمدردی اس جسم کی مانند ہے کہ اس کا ایک عضو بیمار ہو تو سارا جسم بیمار میں مبتلا ہوتا ہے اور جاگتا رہتا ہے۔“<sup>۱۱</sup>

## تعصب قومی

قوم اور قومیت کے الفاظ اصطلاحی مفہوم میں تئے ہیں اور انیسویں صدی عیسوی کی پیداوار ہیں۔ ان کی اصل قدیم ہے۔ یعنی کسی گروہ یا جماعت میں، دوسروں کے مقابلے میں، زیادہ پائیدار اور قریبی رشتہ ہونا۔ ”وہ ہیئت جسے آج امت یا قومیت کہا جاتا ہے، آج ہی کی طرح بابل، مصر، فارس، روم اور یونان میں موجود تھی جس طرح آج فرانس، برطانیہ، امریکہ یا جاپان میں ہے۔“<sup>۱۲</sup> قومیت، کسی جماعت انسانی میں اس مضبوط اور جاندار شعور سے جنم لیتی ہے جو کسی گروہ یا نسل میں گہرے روابط کا نتیجہ ہوتا ہے یا ان میں زبان، تاریخ اور اقتصادی مفادات کا اشتراک ہوتا ہے۔ قومیت کی تشکیل کرنے والے عوامل کے مطالعے کے بعد، یہ واضح ہوتا ہے کہ ان میں سب سے اہم جنس اور نسل کی وحدت ہے اس کے علاوہ مولد و منشا کی وحدت، جیسے وطنیت کہا جاتا ہے اور وحدت زبان، وحدت خیالات اور ایک ہی تاریخ کا اشتراک بھی قومیت کو جنم دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اقتصادی مفادات کی وحدت بھی ایک رنگ پیدا کرتی ہے۔ یہ تمام یا ان میں سے کچھ عوامل مل کر لوگوں کی کسی جماعت میں مضبوط رشتے پیدا کرتے ہیں اور ان کے دماغوں اور خیالات پر اس قدر غلبہ پالیتے ہیں کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں یک جان ہو جاتے ہیں اور اسی قومیت کے باعث ایک دوسرے کے مددگار بن جاتے ہیں۔ اسی کی بنا پر اپنے دوستوں سے صلح اور دشمنوں سے جنگ کرتے ہیں اور اسی کی وجہ سے لوگ، افکار اور آراء زندہ و توانا ہوتے ہیں۔

اگر تمام عوامل کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصنوعی ہیں اور حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً وحدت نسل و جنس، فرضی احساس ہے کیونکہ کوئی جماعت یا قوم یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ صدیوں سے نسلی آمیزش سے پاک چلی آتی ہے کیونکہ تمام گروہ اور جماعتیں آپس میں خلط ملط ہو چکی ہیں۔ ان کا یہ اتصال کئی طرح کا ہے، مثلاً عمومی اتصال جو حالت امن میں واقع ہوتا ہے اس کے علاوہ اپنی مرضی یا جبر سے نقل مکانی، جنگ اور جنسی روابط بھی شعوب و قبائل میں اتصال پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اگر آریائی یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا خون "پاک" ہے یا سانی سمجھتا ہے کہ اس کی نسل میں کوئی ملاوٹ نہیں تو دونوں ہی اوہام خود فریبی کا تسکار ہیں۔ حرمتی میں ہٹلرنے اس نظریے کو شدت سے متوانے کی کوشش کی تھی مگر بڑی طرح ناکام رہا۔ کوئی بھی دعویٰ جو نسل پرستی پر قائم ہو، اس طرح تباہ ہوتا ہے۔

وطنیت یا وحدت مولد بھی فرضی بنیادوں پر قائم ہیں۔ اگرچہ ہمیں اعتراف ہے کہ انسان کسی وطن سے نسبت کو روحانی تعلق سمجھتا ہے اور اسے اہمیت دیتا ہے۔ لیکن اس بات میں کیا چیز مانع ہے کہ وہ اپنے وطن کی جغرافیائی سرحدوں کو اپنے ذہن میں اتنا پھیلا دے کہ ساری دنیا پر محیط ہو جائیں۔ کسی انسان کا وطن تو اس کرۂ ارض کا ہی حصہ ہے پھر وہ یہ باور کیوں نہیں کرتا کہ وہ اس زمین کا "کاشتکار" ہے اور زمین پر بسنے والے تمام افراد اس کے ہم وطن ہیں؟ دراصل وہ پیوند جو لوگوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتا ہے، عقیدہ ہے۔ اس لحاظ سے یہ بات عجیب نہیں کہ کوئی شخص عقیدے کی ایک رنگی کی بدولت دوسرے ملکوں کے رہنے والوں کو اپنا "ہم وطن" قرار دے اور یہ رشتہ زیادہ مضبوط اور زیادہ اہم بن جائے۔ شاید ہمارے ہمعصر معاشروں میں یہ منظر اہمیت حاصل کرے!

تحقیق کے ثبوت کیا ہے کہ "زبان" بھی مذکورہ بالا عوامل میں کچھ زیادہ قابل اعتماد نہیں۔ زبان اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگوں میں بات سمجھنے سمجھانے کا آلہ یا قدر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسانی گروہوں میں احساس مشترک ہو بیان کرنے میں زبان ہی کام آتی ہے۔ لیکن یہ قطعی طور پر وحدت فکر و رجحان کے لیے ضروری نہیں۔ ہمارے زمانے میں ایسی کئی قومیں اور جماعتیں ہیں جن میں وحدت زبان مفقود ہے، مثلاً بھارت، چین، سوئزر لینڈ وغیرہ۔ اس صورت میں زبان کو انسانوں میں تفرقے یا امتیازات پیدا کرنے یا انہیں قومیتوں کے لحاظ سے تقسیم کرنے کی بنیاد بنانا نامناسب نہیں ہے۔

بہمان تک اقتصادی مفادات کی وحدت کا تعلق ہے تو یہ افراد یا کسی انسانی گروہ میں وحدت کے

قیام کا سبب تو ہو سکتے ہیں، لیکن قومی شعور پیدا کرنے کے لیے پیمبر ہیں۔ پھر ایسا موقعہ آتا ہے کہ ہر قوم اقتصادی مفادات حاصل کرنے میں تیزی دکھاتی ہے، جس سے سب اقوام کی زندگی پریشان کن ہو جاتی ہے کیونکہ ہر قوم خود غرض ہوتی ہے اور اپنے فائدے کے لیے بے شمار اقسام والوایع کی اقتصادی بندشیں عائد کرتی ہے جس سے مطلوبہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

جہاں تک جذبات اور تاریخ کی وحدت کا تعلق ہے، تو اس سے قومیتیں اور امتیں بنتی ہیں، مگر یہ بھی حقیقت کا صرف ایک پہلو ہے اور ان سے بات صاف اور واضح نہیں ہوتی۔ احساسات اور جذبات کی وحدت، وحدت عقیدت پر منتج ہوتی ہے، اور مخصوص افکار، آرٹ، ادب، علم، جمل کر رہنے کے سبب کبھی پسندیدہ ہوتی ہیں، اور کبھی ناخوشگوار، کبھی خوش بخئی لاتی ہیں اور کبھی رنج فزا ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے اس عامل کو انسانی جماعتوں کے مابین پختہ رشتے قائم کرنے میں مدد کہا جاسکتا ہے۔

نسلی اور وطنی رجحان میں افراط، اور اس سے پیدا ہونے والی خود غرضی ہر قوم کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ تمام عزت و افتخار، طاقت و اختیار اپنے لیے سمیٹ لے اور دوسروں کے حقوق چھین لے۔ اس سے فساد، اسلحے کی فراوانی اور جنگ بندی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام سب بنی نوع انسان کے لیے اخوت و محبت قائم کرنے کے لیے آیا اور اس نے تمام ماویٰ خواہشوں، خود پسندی کی مصلحتوں اور انایت سے صرف نظر کیا۔

جناب سید قطب اپنی کتاب ”ہذا الدین“ میں لکھتے ہیں: ”اسلام آیا تو لوگ اس وقت حسب نسب کے رشتوں یا نسلی پیوندوں میں منسلک تھے یا ایک ہی قطعہ زمین پر رہنے بہنے سے ان میں تعلقات پیدا ہو گئے تھے، یا وہ قریبی مفادات اور منافع پر اکٹھے ہوتے تھے۔ ان تمام تعصبات کا انسانی جوہر سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ یہ تو محض وقتی اور عارضی ضرورتیں تھیں۔ اسلام نے اس اہم موضوع پر حتمی بات کر دی، جس سے انسان کا انسان سے رشتہ ہمیشہ کے لیے طے پا گیا، اسلام نے کہا: رنگ، نسل، حسب نسب، سکونت، مفادات و مصالح لوگوں کو باہم دگر کرتے ہیں نہ افتراق پیدا کرتے ہیں۔ یہ صرف عقیدہ ہے۔“ کسی بھی معاشرے کا مستقل رشتہ عقیدہ پر مبنی ہے کیونکہ عقیدہ روح انسانی کے پاکیزہ ترین خصائص میں سے ہے۔ جب یہ رشتہ قائم ہو جائے تو کوئی اور تعلق یا نسبت اہم نہیں رہتا۔ بنی نوع انسان کے لیے

ضروری ہے کہ وہ عمدہ ترین خاصیت پر اتفاق کرے، اور جانوروں کی طرح چارے یا  
چراگاہ پر متفق نہ ہو، نہ کوئی جنگ یا باڑہی انہیں ایک جگہ جمع کر سکے..... امت،  
انسانوں کے اُس مجموعے کا نام ہے، جنہیں عقیدے کے تعلق سے بانڈھ رکھا ہو، اور  
یہی اس کی نسل اور حسب نسب ہے، کیونکہ عقیدے کے سوا کوئی پیوند انہیں  
ہمیشہ مربوط نہیں رکھ سکتا۔ زمین، نسل، زبان، حسب نسب، دنیاوی و مادی فوائد  
انگ انگ یا باہم کسی امت یا قوم کی تشکیل نہیں کرتے۔ ان کا مستقل تعلق صرف  
عقیدے کی بنا پر ہوتا ہے۔“

انسانی تاریخ میں پہلی بار اسلام نے یہ اعلان کیا کہ قوم، سلطنت اور تمام انسانی انجمنیں صرف ایک  
اساس پر قائم ہو سکتی ہیں جو شرف انسانی کے لائق ہو اور جو خدا کی طرف سے انسان کو عطا کردہ مخدوم فکر  
کی قدرت کے ذریعے قابل فہم ہو۔ یہ اساس فقط عقیدہ ہے جو انسانوں کو انگ انگ بھی کرتا ہے اور  
متحد بھی۔ اس کے علاوہ جتنے عوامل ہیں اسلام ان کی تائید نہیں کرتا اور وہ اس قابل نہیں کہ لوگوں میں  
تفریق پیدا کر سکیں یا انہیں مجتمع کر سکیں۔

بنی نوع انسان فی الجملہ ایک ہی اصل سے چھوٹے ہیں:

”وخلقکم من نفس..... کثیرا و نساء“<sup>۱۱۷</sup>

تمام اقوام و قبائل کی اصل یہی ہے:

”یا ایہا الناس..... ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم“<sup>۱۱۸</sup>

اس لیے تمام اقوام و قبائل اور گروہوں میں جو اختلافات ہیں اور ایک دوسرے سے بغض اور نفرت کا  
باعث نہیں ہونے چاہئیں بلکہ انہیں تو ایک دوسرے سے تعارف اور تعاون کا وسیلہ بننا چاہیے  
جہاں تک زمین کا تعلق ہے تو یہ خدا کی ہے، جسے انسان نیکی حاصل کرنے کے لیے آباد کرتا ہے  
اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اس پر اپنا نائب مقرر کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بطور وراثت عطا کرتا  
ہے۔ انسان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ زمین کے کسی چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے میں محدود و مقید  
ہو کر رہ جائے اور اُسے اپنا معبود بتالے۔ اس بارے میں قرآن مجید کہتا ہے:

”الم قرآن اللہ سخرکم مافی الارض“<sup>۱۱۹</sup> اور

”الم فکن..... فتھا قبیھا“<sup>۱۲۰</sup>

اللہ کی زمین تو سب انسانوں کے لیے ہے اور مسلمانوں کی سر زمین سب مسلمانوں کے لیے جہاں کسی کے لیے کوئی روک ٹوک نہیں نہ ان کے درمیان حد بندیوں قائم ہوتی ہیں۔

اس مبداءِ کریم کے فیض سے اسلام نے زمین حسب نسب یا جاہلیت کی قبیلہ پرستی پر تفرقہ و تعصب کی تمام اقسام کو نابود کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”قل ان كان... القوم القاسقين“ ﷺ

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مطہی سے پیدا کیے گئے۔ تو چاہیے کہ وہ قوم جو اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرتی ہے اس سے باز آجائے، ورنہ اللہ کے نزدیک وہ گبریلا سے بھی کم وقعت رکھتی ہیں“ ﷺ

عربوں کے بعض قبائل اور گروہ نسلی برتری اور عالی نسبی پر فخر کرنے سے باز نہ آتے تھے۔ رسول کریم ﷺ نے معاملات کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

”اے قریش! اپنی جانوں کو بچا لو۔ میں تمہیں خدا سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔ اے بنو عبدمناف! میں خدا کے مقابلے میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ اے عباس بن عبدالمطلب! میں تمہیں اللہ سے بچا نہیں سکتا۔ اے فاطمہ بنت محمد! مجھ سے میرے مال میں سے جو چاہے لے لو، مگر میں تمہیں اللہ سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔“ ﷺ

رسول خدا ﷺ نے اعلان فرمایا کہ جو عصبیت کی طرف دعوت دے، اسے اسلام سے کوئی غرض نہیں۔ ”جو عصبیت کی طرف جلائے وہ ہم میں سے نہیں۔“ آپ نے جاہلی عصبیت کو بدترین الفاظ سے یاد فرمایا اور اس سے باز رہنے اور اسے ترک کرنے کا حکم دیا۔ ”اسے ترک کر دو، کیونکہ یہ بدبودار شے ہے۔“ اس کی تاکید مزید کے لیے اور اسلام کی روح کی وضاحت فرماتے ہوئے آپ نے فرمایا: ”میں ہر لہر ہر لہر بھائی ہوں، خواہ وہ جہنمی غلام ہی کیوں نہ ہو، اور ہر بد بخت سے قطع تعلق کرتا ہوں، خواہ وہ اشراف قریش ہی میں سے کیوں نہ ہو۔“

اس وقت اسلام دشمن عناصر نے پوری کوشش کی کہ اس و خنزرج میں قبائلی تعصبات اور نفوس کو ابھاریں، بلکہ قریش اور باقی تمام قبائل کے درمیان، اور عربوں اور غیر عربوں کے درمیان جو اسلام لائے تھے، اختلافات کو بھادیں۔ یہ وقت کڑے امتحان کا تھا، مگر یہ تمام سازشیں ناکام ہو گئیں اور



اسلام نے ان تمام شعوب و قبائل کو عقیدے کی کٹھالی میں پگھلا دیا اور ایک رائے، ایک راستے اور ایک ہی طرز فکر کے رشتے میں پروردیا۔ ان سازشوں میں، اسلام کے اولین دور میں، یہودیوں کا سب سے بڑا ہاتھ تھا۔

جب بھی اسلامی عقیدے کی اثر پذیری مسلمانوں میں زوال آمادہ ہوئی، مسلمانوں میں اس سے انحراف سے حفاظت کرنے والی تفصیل ٹوٹ پھوٹ گئی۔ سلطنت عثمانیہ کا دور اس لحاظ سے بدترین تھا کیونکہ اس وقت یورپ میں اٹیسویں صدی عیسویں میں ظاہر ہونے والے قومیت پرستی کے خیالات عالم اسلام پر حملہ آور ہو رہے تھے اور اسے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے کہ بھائی بھائی کے خلاف ہو رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں یہودیوں، عرب دشمنوں اور اسلام کے مخالفین کے لیے عالم اسلام کے بہت بڑے حصے کو ہتھیالینا ممکن ہو گیا۔

قومیت پرستی کے خیالات، سلطنت عثمانیہ میں "جماعت اتحاد و ترقی" اور "جمعیت شعبان ترکیہ" نے رائج کیے۔ سالونیکا کے یہودی جماعت اتحاد و ترقی کے لیڈروں کو شہرہ سے رہے تھے اور ان میں تورانی خصیبت پھیلانے اور ما قبل اسلام کی تہذیب، ادب اور ثقافت زندہ کرنے میں انہیں کا ہاتھ تھا۔ انہیں نے ترکوں کو اکیسا کہ وہ اس دین اسلام کا، اور اس کی شریعت و ثقافت کا اور زبان کا جائزہ لیں جو عربوں نے پھیلایا کیونکہ (ان کے خیال میں) یہ ترکی قومیت پرستوں کے لیے اجنبی اور غیر مانوس ہے۔ ان میں پروپیگنڈا کیا کہ ان کے لیے اسلام قبول کرنے سے پہلے کی "بت پرستی" کی طرف لوٹ جانا بہتر ہے۔ حتیٰ کہ زیادہ بچھیلے ترک، ہلاکو اور چنگیز خان جیسے تورانی بت پرستوں کی ذات پر فخر کرنے لگے اور ان کے ناموں کو مقدس اور سزاوار پرستش جان کر اپنانے لگے۔ یہ بھی ہوا کہ شاہ حسین کے لشکریوں نے، اس کے بھائی کی لاش پر (جو مدینہ میں ترکوں کا ہاتھ تھا) یہ لکھا ہوا دیکھا جسے یقیناً تورانی ترکوں کی چھانت نے لکھا تھا، کہ "یہ خونناک بدعت فرض، جسے امت اسلامیہ کہا جاتا ہے جو طویل مدت تک ہماری ترقی میں بالعموم اور تورانی وحدت کے قیام میں بالخصوص حائل رہی ہے، اب شکست و ریخت اور زوال سے دوچار ہے۔"

مسلمان عرب، جمعیت اتحاد و ترقی کے بارے میں اپنے شکوک ظاہر کر رہے تھے جن کے دو بنیادی سبب تھے: "اول یہ کہ جمعیت اتحاد و ترقی کے سب لیڈر اور زعماء، بغیر استثناء، فری میسن تنظیم سے تعلق رکھتے تھے اور دوم یہ کہ سالونیکا کے یہودی جمعیت اتحاد و ترقی کا جزو لازم تھے۔"

یہودی عناصر نے اپنی سازشوں سے جماعت اتحاد و ترقی کو یہ جہرات بخشی کہ وہ ہر چیز کو توہیناً  
 ”ریا تر کھیاتے“ کا مطالبہ کرنے لگی۔ یعنی ان تمام عناصر کو، جو سلطنت عثمانیہ کو تشکیل دیتے تھے ترک قومیت  
 اختیار کرنے پر مجبور کیا اور ان کے ترکی زبان لازم قرار دی۔ جیسا کہ معلوم ہے، سلطنت عثمانیہ متعدد  
 قومیتوں پر مشتمل تھی اور عقیدے کی بنا پر وجود میں آئی تھی اور صرف عقیدہ ہی انہیں یکجان اور متحد بنائے  
 ہوئے تھا، اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس وسیع مملکت میں ترکوں کی تعداد عربوں سے زیادہ نہ تھی اور  
 یہ دونوں عناصر اس کے مشرقی و مغربی بازوؤں میں آباد تھے اور ان میں اسلام کے سوا کوئی قدر مشترک نہ تھی  
 عرب، سلطنت عثمانیہ کو اپنی سلطنت سمجھنے لگے اور اس کی شان و شوکت کو اپنی شان و شوکت  
 اور اس کی فتوحات کو اپنی فتوحات سمجھتے اور اس پر فخر کرتے۔ ”ترکی نے“ کے عمل کے بعد بھی عربوں کا  
 رویہ اس سلطنت سے مستفغانہ اور دستاوردار رہا اور ان کے نزدیک اس کے احترام کا تقاضا تھا کہ اس  
 سلطنت کو تباہ و برباد اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچایا جائے۔ اس بات پر ان کے وہ بیانات،  
 کانفرنسیں اور اجتماعات دلالت کرتے ہیں جو وہ سلطنت عثمانیہ کے اعیان حکومت کے ساتھ کرتے رہے۔  
 لیکن آگ کو پٹر کالنے والے دونوں طرف تھے۔ جن لوگوں نے اس سلطنت کی، جو اپنے ضعف کے  
 باوجود مسلمانوں کے اتحاد کی علامت اور ان کی امیدوں کا مرکز تھی، تباہی کی منصوبہ بندی کی، انہوں نے  
 واپسی کے سبب راتیں بند کر دیئے۔ مسلمان تو یہ سمجھتے تھے کہ یہ سلطنت ان کی قوت اور شان و شوکت کو واپس  
 لے آئے گی، مگر بات جہاں سے چلی تھی وہیں واپس آگئی۔ یوں پھر قومیت عربیہ کا آغاز ہوا اور اس  
 نے بھی وہی شکل اختیار کر لی جو ترکوں کے نزدیک تورانی قومیت کی تھی (یہ بات بالیقین کہی جاسکتی  
 ہے کہ عرب قومیت کو پیدا کرنے والے عیسائی تھے، پھر فری میسن کے ارکان نے اسے ہوادی اور یہ  
 حقیقت سب پر عیاں تھی کہ فری میسن تنظیم اور یہودی ایک ہیں) ایک مرتبہ مسلمانوں پر قومیت پرستی  
 کا دروازہ کھل گیا تو پھر دوسری قومیتوں کے لیے کیا رکاوٹ تھی؟ جو پھر تم اپنے لیے پسند کرتے ہو  
 اُس سے دوسروں کو کس طرح منع کر سکتے ہو؟ وہ واحد دروازہ یعنی اسلام، جو ہمیں ایک دوسرے سے  
 ملانا تھا بند ہو گیا تو رابطہ ٹوٹ گیا۔

لارنس (آف عربیا) جو اس علاقے میں برطانوی سیاست کا مہرہ تھا، اپنی کتاب ”حکمت کے سنون“  
 میں اس مقصد کے حصول کے بارے میں تصویر کشی کرتا ہے:

”میں مدت تک شام اور صبح کے بارے میں غور کرتا رہا اور اپنے آپ سے پوچھتا تھا،

کیا قومیت پرستی کسی دن دینی رجحان پر غالب آجائے گی اور کیا وطن پرستی کبھی دین پر چھا جائے گی۔ اس کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے: کیا اعلیٰ سیاسی نصب العین وحی اور الہام کی جگہ لے لے گا اور شام اپنے دینی نظریے کو وطنی نظریے سے بدل دے گا؟ یہ خیال میرے ذہن میں نام راسدہ کلبلاتا رہا۔

سب واقف ہیں کہ ترکوں کے خلاف انقلاب کو برطانوی نائید حاصل تھی اور اس کے مادی اور صحافتی ذرائع اس کی مدد کر رہے تھے۔ فرانس کے قائدین بھی اس کے حلیف تھے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ترکوں کے کئی لیڈر ان قائدین سے ملاقات کے لیے غیر ملکی سفارت خانوں سے رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ قومیت پرستی اور نسل پرستی کے اصولوں سے انکار کا مطلب یہ نہیں کہ ہم وحدت عربی یا ان کے آپس میں تعاون یا قریبی باہمی تعلقات کو تسلیم نہیں کرتے۔ عرب تو دنیا میں اس وقت بھی فضیلت کے حامل تھے جب اسلام کا پیغام ان پر نازل ہوا۔ ان کا اتحاد اسی فضیلت کی اساس پر قائم تھا اور قائم رہا۔ وہ دوسروں سے برتر عربی زبان اور دنیا میں مرکزی حیثیت کی بنا پر اس فضیلت کے مزادار تھے۔ انہوں نے اس فضیلت کو دوبارہ پایا اور انہیں اس کی بشارت دی گئی۔ ”عربیت“ اسلام سے جدا نہیں ہو سکتی اور دنیا بھر کے مسلمان عربوں کی فضیلت کے قائل ہیں۔ عربی زبان سیکھنے کا شوق بھی رکھتے ہیں کیونکہ وہ قرآن کی زبان ہے اور عربوں کی تکریم و تعظیم بھی اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی، المتوفی ۱۷۰۷ء، کہتے ہیں:

”ہم لوگ اس خطہ زمین، یعنی ہند، میں اجنبی ہیں، کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد نے بہت مدت پہلے یہاں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس لیے عربی حسب نسب اور عربی زبان ہمارے لیے باعث عزت و افتخار ہے۔ انہی کے ذریعے ہم نے معرفت الہی پائی اور اشرف الانبیاء محمد رسول اللہ کو پہچانا۔ ہم پر واجب ہے کہ خدا کی اس رحمت کاملہ کا مفقودہ بھر شکر ادا کریں جس طرح ہمارے عرب اجداد کی عادت تھی۔ انہی میں سے ہمارے نبی کریم مبعوث ہوئے اور آپ نے سب سے پہلے دعوت اسلام انہی کو پیش کی۔“

قومیت تو ایک ظرف ہے، جو چیز اس میں ڈالی جائے وہ اسی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے بذات خود یہ کوئی معنی نہیں رکھتی، سوائے اس کے یہ چند لوگوں کا ایک مجموعہ ہے جو کسی خاص تعلق کی بنا پر

ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اس طرح "خالص" قومیت پرستی کا نعرہ ایک رجعت پسندانہ نعرہ بن گیا "جدید فکر رکھتے والے دانشور اور آزاد خیال مفکر بڑے شد و مد سے اور صاف صاف الفاظ میں اس کی مذمت کرتے ہیں اور وہ وحدت انسانیت اور عالمی رابطے کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ پختہ اشتراکی علمبرداروں نے اپنے خیالات عالمگیر قرار دیئے اور قومیت پرستی کی مذمت کی اور اسی اصول، عقیدے اور شعار پر قائم رہے۔ اس کے مقابلے میں جمہوریت پسند دنیا تھی۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہم نے وہاں سے ابتدا کی جہاں یورپ نے اختتام کیا اور اس طرح کمزور ملت اسلامیہ داخلی طور پر غیر معتبر ہو گئی۔ قومیت پرستی کا دور وہاں تو ختم ہو گیا مگر مشرق میں اسلامی ممالک نے اسے اپنا لیا حالانکہ اسلام وہ پہلا دین تھا جس نے اصول اور عقیدے کی بنیاد پر انسانی رشتوں کو استوار کیا۔

یہ تھی اسلام کی عالمگیری۔ البتہ انسان کے تمام امور اور انسانی جماعتوں کی تنظیموں اور اصولوں کے مشمولات کے بارے میں ہم تفصیل سے اُس وقت بات کریں گے جب ہم اسلامی نظاموں کو بیان کریں گے۔

## عبادت، عمل اور ذمہ داری

### عبادت

اسلام میں بھی دوسرے مذاہب کی طرح، فرائض اور واجبات کی اولین حیثیت ہے کیونکہ ان کے ذریعے انسان اپنے دل اور دیگر اعضا سے اقرار کامل اور مطلق عاجزی اور خضوع و خشوع کرتا ہے۔ یہ عاجزی اور الحاح فقط خدا کے لیے ہوتا ہے اور دوسری تمام موجودات باطل قرار پاتی ہیں۔ اس لیے قرآن کریم میں عبادت ہی کو غایت تخلیق قرار دیا گیا ہے، خواہ انس و جن ہوں یا مجاہد اور نباتات، تمام موجودات اسی ذات واحد کی حمد و تقدیس بخالاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرما رہا ہے:

"وما خلقت ..... الا ليعبدون" ۳۸

عبادت کی دعوت تمام انبیاء علیہم السلام نے دی۔ یہاں تک رسالت و نبوت حضور پر ختم ہو گئی

"ولقد بعثنا ..... ان اعبدوا الله" ۱۹

لا تعدد لوگ اس کی غرض و غایت کو نہ پاسکے کیونکہ (ان کے نزدیک) عبادت وقت طلب اور ان کی پہنچ سے باہر تھی اور اس کے لیے بڑی توجہ اور بیدار مغزئی کی ضرورت تھی۔ اس لیے وہ اللہ کے سوا دوسری اشیاء کی عبادت کرتے لگے جن میں پتھر، درخت، ستارے اور لوگ شامل تھے۔ وہ ان کے سامنے اسی عاجزی سے سر جھکاتے اور اپنی خواہشات اور حاجات کو اللہ کے سوا دوسرے خداؤں سے طلب کرتے تھے۔ اسی لیے اللہ کے رسول آتے رہے کہ لوگوں کو حقیقت حال سے آگاہ کریں، اللہ کے سوا دوسری اشیاء وغیرہ کی عبادت کا لغو پن بیان کریں اور ان سے یہ عہد و میثاق لیں کہ وہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے۔

چونکہ عبادت، دوسری تمام موجودات کی طرح وجود انسانی کی غایت بھی ہے، اس لیے اس کے مفہوم صرف اس خاص معنی تک محدود نہیں جن کی طرف ذہن متوجہ ہونا ہے اور اس کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے اور وہ ان مخصوص شعائر میں محصور ہو جاتی ہے جنہیں کوئی مومن ادا کرتا ہے۔ اور اصل عبادت کے دو معنی ہیں: ایک عام اور دوسرا خاص۔

عبادت اپنے عام معنی میں یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کو خدا کی رضا طلبی کے لیے اور شریعت الہی کے مطابق بسر کرے۔ اس لیے ہر وہ عمل جو خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لیے اور حقوق العباد کی پاسداری کی خاطر ہو جن میں فقط اللہ ہی کی خوشنودی مقصود ہو اور اس کے ذریعے زمین میں اصلاح کا حکم اور فساد سے منہا ہی مطلوب ہو، عبادت تصور ہوگا۔ اس لحاظ سے انسان کے وہ تمام اعمال جن میں وہ دنیاوی منفعت تو حاصل کرتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ ہی کی رضا بھی مقصود ہوتی ہے۔ عبادت ہی بن جاتے ہیں جس نے کوئی کھیت اگایا یا پودا لگایا اور اس سے انسان یا جانور کو نفع پہنچا تو اس کا صدقہ شمار ہوگا۔ جس نے اپنے بال بچوں کی پرورش کے لیے بھاگ دوڑ کی، نیکی کا حکم دیا اور برائی سے روکا یا کوئی بیک کلمہ ہی کہا تو وہ صدقہ ہی سمجھا جائے گا بشرطیکہ اس کی نیت اللہ کے لیے پُر خلوص ہو۔

کعب بن عجرہؓ کہتے ہیں: نبی کریمؐ کے سامنے سے ایک شخص گزرا تو صحابہ کرام نے اس کی ہمت اور جانفشانی کی تعریف کی اور کہا: "کاش یہ اللہ کے لیے ہوتا،" حضورؐ نے فرمایا:

"اگر وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے لیے محنت کرتا ہے تو یہ اللہ ہی کے لیے شمار ہوگی اور اگر محض نام و نمود کی خاطر اور ریاکاری ہے تو شیطان کے لیے سمجھی جائے گی۔"

حضرت ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں: لوگوں نے کہا یا رسول اللہؐ! اہل ثروت کے لیے تو کسی اجر

ہیں وہ ہماری طرح نماز بھی پڑھتے ہیں اور ہماری طرح روزہ بھی رکھتے ہیں مگر (مال کی کثرت کے سبب) خوب صدقہ بھی کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

”کیا اللہ نے تمہارے لیے صدقے کے کسی موقع پیدا نہیں کیے؟ تمہاری ہر تسبیح صدقہ

ہے، ہر تکبیر صدقہ ہے، ہر تمہید صدقہ ہے اور ہر (لا الہ الا اللہ کلمنا) صدقہ ہے

اور نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے، بڑائی سے روکنا صدقہ ہے، تمہاری نسل کشتی میں صدقہ ہے۔“

حاضرین نے کہا: یا رسول اللہ! اگر ہم اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کریں (حلال طریقے سے) تو کیا اس میں بھی اجر ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

”اگر یہ حرام ہوتا تو کیا گناہ نہ ہوتا؟ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے حلال قرار دیا ہے،

اس لیے اس میں بھی اجر ہے۔“

معنی خاص میں محض عبادت کو کافی سمجھنا اور نظام اجتماعی کے قیام سے بے نیازی برتنا، مفہوم اسلام سے انحراف ہے۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ نبی کریمؐ نے کسی شخص کو دیکھا کہ لوگوں پر بوجھوتا ہوا

تھا آپؐ نے اس کے بارے میں پوچھا تو لوگوں نے کہا: یہ ہمارا عابد (یا پیر) ہے۔ آپؐ نے پوچھا اسے

کھلتا پلاتا کون ہے؟ لوگوں نے کہا: ہم سب۔ آپؐ نے فرمایا: ”تم سب اس سے بہتر ہو۔“ اسی

طرح کا واقعہ حضرت عمرؓ کے بارے میں ہے کہ آپؐ نے وہی پوچھا جو نبی کریمؐ نے پوچھا تو لوگوں نے کہا

اس کا بھائی (اسے کھلتا پلاتا ہے) حضرت عمرؓ نے فرمایا: اس کا بھائی اس سے زیادہ عبادت گزار

ہے۔ رسول کریمؐ کی حدیث ہے:

”بئس تم میں سب سے زیادہ خدا سے ڈرتے والا اور سب سے زیادہ متقی ہوں مگر میں

نماز پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں۔ روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور

عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں۔“

معنا اور حقیقتاً، عبادت ہی عبودیت ہے، اور ہر وہ بات جس میں عبادت کی اطاعت کرتا

ہے، عبادت ہے۔ خاص معنی میں عبادت سے مراد نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، روزے رکھنا، اور

اگر مفذور ہو تو حج کرنا ہے۔ یہ سب واجبات دراصل سچی اور کامل عبادت کی تربیت میں سے ہیں۔

عبادات کی وہ قسم، جس کے خاص معنی دینی فرائض کا ادا کرنا ہے، دراصل فرد کی بھلائی یا جماعت

کی بھلائی یا بیک وقت دونوں کی بھلائی ہے۔ ان کا مقصد جماعت کو چھوٹے چھوٹے کاموں اور دنیا کے

نکروں سے بلند کرنا اور ان محدود مشاغل کی پریشانیوں سے آزاد کرنا ہے۔ جب بھی انسان مادی منفعت اور ہوا اور ہوس میں گرفتار ہو جائے تو پُرِ خُلُوص اور مسلسل عبادت اُسے قریبی مقاصد سے بلند تر مقاصد تک پہنچاتی ہے۔ اس معنی میں عبادت انسان کو ہمیشہ اس کا روحانی وجود زیادہ دلاتی رہتی ہے اور جسمانی مقاصد سے اس کی توجیہ ہٹا دیتی ہے۔ اسے باور کراتی ہے کہ اس کے زائل ہونے والے وجود سے پُرے ابدی زندگی بھی ہے، اور یہ بھی کہ اس زندگی سے ماورا، جو مشاغل دنیا تک محدود ہے، ایک ایسی زندگی بھی جو لاغابی ہے۔

استاذ محمد ابو زہرہ نے کیا خوب کہا ہے کہ عبادت سے دو نتائج حاصل ہوتے ہیں:

اولاً: وجدانِ دینی کی تربیت کی خواہش جو مومن کو اسلام سے پیوست کر دیتی ہے، اور اس یک رنگی سے ایسا معاشرہ جنم لیتا ہے جس میں آپس میں محبت اور یگانگی ہوتی ہے۔

ثانیاً: اسلام میں عبادت کی غرض و غایت محض متقی قسم کا تقویٰ پیدا کرنا نہیں بلکہ دنیا بھر میں تمام انسانیت کی بہبود مطلوب ہے، اور ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے جو بعض اور نفرت کی بجائے محبت اور حسن سلوک پر مبنی ہو۔ عبادت میں اخلاص اللہ کی علامت یہ ہے کہ وہ دل کو پاک کرے شرفِ انسانی میں اضافہ کرے اور فرد و معاشرے میں محبت اور سلفت پیدا کرے جس میں نہ ریاکاری و نہ مبالغہ آرائی۔

اسلامی عبادت کی امتیازی شان یہ ہے کہ وہ صرف خدائے واحد کے لیے ہیں۔ کوئی عبادت گزار عبادت کے دوران میں خدا کے سوا کسی اور طرف متوجہ نہیں ہوتا اور صرف خدائے مطلق کے آگے بھکتا ہے جس نے زمین و آسمان پیدا کیے۔ انسان اور اس کے رب کے درمیان یہ ایک ذاتی تعلق ہوتا ہے جس میں کسی واسطے یا وسیلے کی ضرورت نہیں۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ جب کوئی نمازی نماز ادا کرنا چاہے تو اُسے اس کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی، نہ کوئی دربان اُسے ٹوک سکتا ہے۔ وہ کسی ترجمان کی مدد کے بغیر اپنے رب سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اس کا دل اور اس کے اعضا سب کے سب اللہ کے حضور میں پیش ہوتے ہیں کیونکہ فطرتِ انسانی مادیت اور روحانیت دونوں کا مرکب ہے۔ عبادت اللہ کے آگے عاجزی سے عبادت ہے اور اسی کا منظر ہے، اور اسی طرح اکیبیتی کے بغیر ادا کی جاتی ہے جس نے شریعت نے مقرر فرمادی۔ گویا یہ تو فیستی امر ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کسی تعبیر و تفسیر، چھان پھٹک یا بحث و مباحثے کی گنجائش نہیں اور عقل کی رے سے اسے

جرح و تعدیل کی کسوٹی پر بھی نہیں کسا جاسکتا۔ اسے ترک کرنے یا اس کے سوا کسی اور کام کی طرف مائل ہونے کے بارے میں بھی عقل کی بات تسلیم نہیں کی جاسکتی۔

نماز، اسلامی عبادات کا رکن اول ہے اور دراصل یہ اللہ کے دربار میں حاضری اور اس سے مناجات کا نام ہے۔ نماز سے ہی انسان دن کا آغاز کرتا ہے۔ پھر دو بار دن میں نمازیں ادا کرتا ہے، پھر شام کو دن کا اختتام نماز سے کرتا ہے اور رات کا استقبال بھی اللہ کے حضور قیام سے کرتا ہے، گویا اپنے اعمال میں اللہ سے ہدایت طلب کرتا ہے اور بیداری سے لے کر رات کو آرام کرنے تک اپنے سب اعمال کا حساب اُسے پیش کرتا ہے۔ اس طرح وہ دن کی ابتدا نماز فجر سے کرتا ہے، جس میں اللہ کی عظمت و جبروت کو یاد کرتا ہے۔ اس سے ایک نور سا اُس کے دل میں پھوٹتا ہے اور وہ اپنے کام قلب سلیم سے شروع کرتا ہے اور اسی پاکیزہ نفس کے ساتھ لوگوں سے متاجلتا ہے۔ جب دل پر زنگ لگتا شروع ہوتا ہے اور اللہ کی یاد سے نخلت ہونے لگتی ہے تو نماز ظہر کا وقت آجاتا ہے، پھر عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کرتا ہے اور اپنے دن کا اختتام اسی طرح اللہ کی یاد میں مصروف ہو کر کرتا ہے، جس طرح اُس نے کیا تھا۔

نماز کی تیاری ہاتھوں اور دوسرے اعضا کی طہارت سے ہوتی ہے۔ اس سے مقصود یہ یوں دلانا ہے کہ چونکہ نماز تطہیر قلب کا نام ہے، اس لیے طہارت اس کا جوہر ہے اور یہ صرف ذکر، دعا اور تلاوت تک محدود نہیں، اور یہی جذبہ رکوع، سجود اور قیام کی تمام حرکات میں پیش نظر ہوتا ہے تاکہ اللہ کے اگے حضور و خشوع، اس کی عظمت اور تقدیس کے معنی راسخ ہو جائیں جس طرح اس کے اعضاء و جوارح عاجزی اختیار کرتے ہیں، اسی طرح اس کا دل بھی خدا کے اگے جھکتا ہے اور جس طرح اس کا وجدان اللہ کی عظمت بیان کرتا ہے، اسی طرح اس کی زبان خدا کی تعظیم کرتی ہے۔ ان سب باتوں سے یہ تاکیہ ہوتی ہے کہ نماز ادا کرتے وقت حضور قلب بنیادی شرط ہے۔ نماز وہی ہے جو سوچ سمجھ کر ادا کی جائے اور اگر اس میں اللہ کا ذکر اور غور و فکر نہ ہو تو وہ قبول نہ ہوگی بلکہ ایسی نماز ادا کرنے والا قابل مذمت ہے اس معنی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

”قَوِّمِ لِلْمُصَلِّينَ ..... يَهْنَعُونَ الْمَاعُونَ“<sup>۵۳</sup>

اس بنیادی عبادت کو، جو عموماً اسلام اور اس کا رکن اصلی ہے آسان بنانے کے لیے، اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کو مسجدہ گاہ بنا دیا ہے کہ جب وقت آئے تو کسی بھی جگہ پر بھی انسان نماز ادا کر لے اور



اپنے خالق کو یاد کرے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ باقی سب عبادات میں بھی لوگوں کے واسطے کی ضرورت نہیں رکھی کہ وہ انسان اور خدا کے درمیان حائل ہوں۔ اگر کئی افراد مل کر نماز پڑھیں تو ان میں سے سب سے زیادہ قرآن جاننے والا، عالم اور دین کی سوجھ بوجھ رکھنے والا مسلمانوں کی امامت کرے گا۔ اگر سب لوگ ہر لحاظ سے برابر کا مرتبہ رکھتے ہوں تو کوئی بھی امامت کا حق ادا کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ نماز اچھی طرح ادا کرے۔ اور اس کی کیفیت سے واقف ہو۔

اسلام نے نماز باجماعت ادا کرنے پر بہت زور دیا ہے اور اسی لیے صلوٰۃ الجمعہ کو خاص طور پر باجماعت ادا کرنے کو کہا کیونکہ نماز باجماعت سے آپس میں اتحاد، محبت اور اخوت پیدا ہوتی ہے اور انہیں یک دل اور یک جان کر دیتی ہے۔ جب بھی مسلمان مل کر اپنے رب کے آگے عاجزی کریں گے اور اسی کے سامنے رکوع و سجود کریں گے تو ان کے دل ایک دوسرے سے پیوست ہو جائیں گے اور ان میں اخوت کا شعور پیدا ہوگا۔ نماز باجماعت، اطاعتِ امیر بھی سکھاتی ہے، جسے مسلمان اپنے میں سے منتخب کر لیتے ہیں اور انہیں تسلیم و ضبط اور وقت کی پابندی کا عادی بناتی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کی ٹنگائی اور ایک دوسرے سے ہمدردی، مساوات اور باہمی الفت کا درس بھی دیتی ہے۔ امیر ہوں، یا فقیر، بڑے ہوں یا چھوٹے، اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ سب کندھے سے کندھا ملا کر خدائے واحد کو یاد کرتے ہیں۔ اور اسی خدائے کامل کی بندگی ان کا شعار ہوتا ہے۔

روزوں کی عبادت سے انسان کے وجدان کی تربیت اور نفس کی تہذیب ہوتی ہے۔ پروردگاری ریاضت کا مہینہ ہے اور اس میں دن بھر لذات و مشنات سے کنارہ کشی اختیار کی جاتی ہے۔ روزوں کا مطلب صرف یہ نہیں کہ انسان صرف جسمانی لذائذ کو ترک کر دے بلکہ اسے اپنے کانوں، آنکھوں، زبان ہاتھوں، پاؤں اور تمام دیگر اعضاء کو گناہ سے باز رکھنا ہوتا ہے اور دل کو ناپاک ارادوں اور دنیاوی فکروں سے آزاد کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ صرف اللہ عزوجل کا ہو جائے۔

ماہِ صیام میں انسان اپنے کھانے پیتے میں، جسم کو فراموش کر کے، صرف روح کا حق یاد رکھتا ہے اور یقین کر لیتا ہے کہ وہ مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہے اور اپنے جسم کو بے لگام نہیں رہتے دیتا، بلکہ جسم کو اجازت نہیں دیتا کہ اس کی لگام تھام لے اور اس کی خواہشات پر جسم کا تصرف ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے ارادے کے پس منظر میں خشیتِ الہی کا جذبہ ہونا ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ خدا خیر و بصیر ہے۔ اسی طرح آخرت پر ایمان، اللہ کے دربار میں حاضری اور قرآن اور رسول کی اطاعت وہ

اپنے دل سے کرتا ہے۔

جہاں تک عبادتِ زکوٰۃ کا تعلق ہے، تو یہ انسان کو یاد دلاتی کہ اس کے اُس مال میں مجھے اس نے محنت سے اور اپنے عمل سے کیا ہے، جماعت کا بھی حصہ ہے۔ زکوٰۃ اُسے یہ بھی یاد دلاتی ہے کہ وہ دوسرے سے وہی سلوک کرتے جو اپنے ساتھ کرتا ہے۔ دراصل یہ نفس کا امتحان ہے کہ وہ مال و متاع سے کس قدر محبت رکھتا ہے۔ زکوٰۃ روحانی عبادت ہے جس سے انسان اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے وہ اسے اپنی مرضی سے، اپنا محاسبہ کرتے ہوئے ادا کرتا ہے اور اُس سے اپنے اوپر اللہ کا احسان سمجھتا ہے، ٹیکس یا بوجھ نہیں۔ یہ ایک دینی فریضہ ہے، جو دوسرے دنیاوی ٹیکسوں ہی کی طرح جمع کی جاتی ہے لیکن اس کا حساب اللہ کو دینا ہوگا۔ قرآن مجید میں صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا ذکر کئی آیات اکٹھا آیا ہے۔ گویا مسلمانوں کی زندگی میں زکوٰۃ بھی اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی صلوٰۃ، اور اس کے ادا کرنے سے انسان ایشیا و قربانی کے اوصاف اختیار کرتا ہے، خود غرضی، حب لذات، تنگ دلی اور زر پرستی سے بچتا ہے اسلام کو ایسے لاکھی اور حریفان انسان کی ضرورت نہیں، جو دولت کے بجاری ہوں اور سانپ بن کر خزانے پر بیٹھے ہوں۔ اسلام تو ایسے انسانوں کو پسند کرتا ہے جو صاف ستھرے ہوں۔ اللہ کی راہ میں اپنی محنت سے کمایا ہوا مال قربان کر سکیں اور اسے ادا کرنے میں کوئی ذاتی غرض شامل ہو نہ ریاکاری، زکوٰۃ حقیقت میں مسلمانوں کو ایسی ہی قربانی کی تعلیم دیتی ہے کہ جب ملک و ملت کو ضرورت ہو تو ہنسی خوشی اور کھلے دل سے اپنا مال خرچ کرنے سے گریز نہ کریں۔

اسلام ایسا دین ہے جو تمام انسانوں کو رب العالمین کی عبادت کی طرف بلاتا ہے۔ حج بھی ایسا ہی فریضہ ہے جو مسلمانوں کو مختلف ملکوں سے نسبت رکھنے اور قوموں اور نسلوں کے اختلاف کے باوجود انسانیت سے محبت اور اخوت کا درس دیتا ہے۔ حج بدنی اور مالی عبادت ہے، جس کی خاطر دور دور سے مسلمان اللہ کے گھر میں جمع ہوتے ہیں اور اس کے مہمان بنتے ہیں۔ اس عبادت کے دوران میں وہ اپنے اہل و عیال مال و دولت اور اپنی خوشحالی و تونگری کے تمام مظاہر جھکا دیتے ہیں اور اُس روحانی ”دسترخوان“ پر جمع ہوتے ہیں جہاں انہیں تقویٰ اور اللہ کی خوشنودی پیش کی جاتی ہے۔ موسم حج میں انسانی وحدت کے جو نشان مسلمان مشاہدہ کرتے ہیں۔ ان میں ابو الانبیاء حضرت ابراہیمؑ کے آثار بھی ہیں جن سے انہیں تمام ادیانِ سماوی کی وحدت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ انسان کی اصل ایک ہے اور اقلیم و اجناس کے تفرقے کے بغیر مطلق مساوات ہی مطلوب و مقصود ہے۔ اس کے علاوہ، حج اللہ کو ہمیشہ یاد رکھنے کی

تلقین کرتا ہے اور اللہ کی یاد دلوں کی دوا اور سمجھے ہوئے نفوس کے لیے قرار ہے، جو اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔

ان مخصوص عبادات پر آیاتِ الہیہ اور اس کی مخلوقات میں غور و فکر، اللہ کے ذکر، قرآن کی تلاوت دعا، استغفار اور اللہ کے ایک ہونے اور محمدؐ کے نبی برحق ہونے کی شہادت کا اعتبار کیا جاسکتا ہے ان میں ہر ایک انسان کو اپنا روحانی وجود یاد دلاتی ہے، جو اس کے وجودِ خاکی سے زیادہ بلند اور زیادہ پائیدار ہے۔

## عمل

عمل بھی عبادت کے عام معنوں میں، عبادت ہی کی قسم ہے، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لیے تخلیق کیا کہ وہ اس کرۂ ارض کو نیک اعمال سے اور نیکی کے لیے آباد کرے۔ اس کائنات میں خوشی سے ہمکنار اور اس میں جتنے خزانے ہیں ان سے استفادہ کرے۔

اسلام میں عمل اپنے نتیجے سے منسک ہے جو اس کے لیے مرتب ہونا ضروری ہے، یعنی اللہ کا شکر اور استغفار اور اس دنیا میں کیے گئے ہر عمل کی آخرت میں مکمل جواب دہی۔ اللہ نے فرمایا:

”هوانت اکم..... قریب مجیب“

انسان اسی زمین سے پھوٹا ہے، جس کی تعمیر اللہ نے اس کے سپرد کر دی ہے اور اسے نیکی کے راستے کا جو بیا بنایا۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ ہر وقت خدا کو یاد رکھے اور توبہ و استغفار کرتا رہے اور یہ بچتہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہر پُر خلوص توبہ اور ہر عملِ خالص کو قبول فرماتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی سنتِ چلی آتی ہے کہ انسان زمین پر، یا زمین کے اندر کی نعمتوں یا رزق اور خزانوں کو اپنی محنت اور عمل کے بغیر نہیں پاسکتا:

”لما الذی حبل..... و امن ذقہ“ جو چلتا پھرتا ہے وہی رزق حاصل کرتا ہے اور جو چلنے پھرنے پر قادر ہونے کے باوجود حرکت نہ کرے تو وہ اس لائق ہے کہ رزق سے محروم رہے۔ امام احمد بن حنبل سے پوچھا گیا کہ اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو اپنے گھر یا مسجد وغیرہ میں بیٹھا رہے اور کہے کہ جب تک مجھے میرا رزق نہیں ملے گا میں کوئی عمل نہیں کروں گا۔ امام نے کہا: ”اس شخص کا علم جہالت ہے، کیا اس نے نبی کریمؐ کا قول نہیں سنا کہ ”میرا رزق میرے

نیزے کے نیچے بنایا گیا ہے۔ جب آپ سے پرندوں کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ”صبحِ تعالیٰ پیٹ جاتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ لٹتے ہیں“ وہ طلبِ رزق میں دن گزارتے ہیں۔ اصحابِ رسولؐ بحر و بر میں تجارت کرتے اور کھیتی باڑی میں مصروف رہتے تھے۔ ان کی مثال پیش نظر رکھو۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے کچھ لوگوں کو نماز کے بعد مسجد میں جم کر بیٹھے ہونے دیکھا۔ جو اللہ پر توکل کے دعوے دار تھے تو آپ اپنا درہ لے کر ان پر پل پڑے اور فرمایا:

”طلبِ رزق کی خواہش لے کر کوئی بیٹھا نہ رہے اور یہ نہ کہے: اے اللہ مجھے رزق دے آسمان سے سونے اور چاندی کی بارش نہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

”فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ... من فضل اللہ“

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا اور کائنات کو اندازے، نظام اور ترتیب سے بنایا ہے اور وہ عقل انسانی کی محتاج ہے کہ اس کے اصول و قواعد پر غور کر کے عمل کرے کیونکہ یہی اس کی مشکلات کا حل اور اس سے استفادہ کرنے کا ذریعہ ہیں۔ ان سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے اُسے جدوجہد کی ضرورت ہے اگر انسان ان قوتوں کو، جنہیں اللہ تعالیٰ نے ایک مدت کے لیے پیدا کیا، کام میں لاتے سے قاصر رہے یا اس کائنات میں اپنا صحیح مقام حاصل نہ کر سکے تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کے مقاصدِ تخلیق کی مخالفت کر رہا ہے اور احکامِ خداوندی سے پہلو تھی کر رہا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص محنت کرتا ہے اور اپنی طاقت استعمال میں لاتا ہے وہ اللہ کی خوشنودی اور بخشش پانے کا سزاوار ہے:

”فمن كان... عملاً صالحاً...“

اسی باعث مسلمانوں پر واجب ہے کہ اُن تمام راستوں کو طے کریں جن سے اس کائنات کے امور اُر کھل سکیں اور ان امور سے انسان کا فائدہ حاصل ہو بلکہ صرف یہی کافی نہیں، مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس میدان کے تلاء سوار بنیں جس طرح وہ ایمان باللہ، عبودیت اور اخلاقِ کریمہ کے معاملے میں لوگوں کے سر دار بنے تھے۔ دراصل مسلمان خطا کار ہیں اگر کوئی علم نافع یا مفید ہنر و مہر وں کے پاس ہو اور وہ اس سے ناواقف ہوں۔ اسی وجہ سے عمل بھی عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور تقرب الی اللہ کا وسیلہ ہے جسے ہر مسلمان اسی طرح پورے خلوص سے ادا کرتا ہے جس طرح وہ نماز کو خضوع و خشوع سے ادا کرتا ہے۔ کوئی شخص محض اسی وجہ سے تارکِ عمل نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کی عبادت میں مشغول رہتا ہے کیونکہ کوشش بھی جہاد فی سبیل اللہ کی طرح ہے،

”وآخرون يضربون ..... فی سبیل اللہ“

نہ کوئی شخص اسے حقیر یا توہین آمیز خیال کرتے ہوئے ترک کر سکتا ہے کیونکہ اسلام میں عمل کی خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو، بڑی قدر و منزلت ہے اور جو کوئی گھمنڈ کرتا اور دوسروں پر ”توکل“ کرتا ہے، اسلام اُسے حقارت سے دیکھتا ہے اسی لیے تمام انبیاء بھی محنت اور کام کرتے تھے، اللہ نے جس نبی کو مبعوث کیا اس نے شبانی کی۔ لوگوں نے کہا: آپ یا رسول اللہ؟ فرمایا: ”میں اہل مکہ کے جانور چراتا رہا ہوں“ رسول اللہ نے یہ بھی فرمایا:

”ہاتھ کی کمائی سے کھانا، سب سے بہتر کھانا ہے بے شک اللہ کے یہی، داؤدؑ بھی محنت کر کے کماتے تھے“

اسلام کے بڑے بڑے سرداروں اور سرخیلوں کا بھی یہی عمل تھا۔ ان میں بزار بھی تھے اور سائر بھی، شینگر گر بھی تھے اور دوز بھی، سبزی فروش بھی تھے اور تاجر بھی، صابون فروش بھی اور روٹی بیچنے والے بھی، بے شمار فقہاء، مصنفین اور متبحر علماء اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔

محض ”توکل“ اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے کو اسلام نے مسلمانوں کے لیے تاپینہ کیا ہے۔ یہ نہ صرف اس کی تخلیق کے مقاصد کے خلاف ہے بلکہ عبادت کے معنوں میں اسلام کے بنیادی اصولوں سے بھی متعارض ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کو اس دنیا میں مستند صدارت سے محروم کر دینا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کے لیے یہ مفدور تھا کہ وہ امتیازی مرتبے کی حامل ہو، خود زمانے کو سازگار بنائے اور جملہ اقوام کے درمیان اعلیٰ حیثیت اور درجہ پائے۔

”وکنذک جعلناکم ..... علیہم شہیداً“

یہ ”گواہی“ عام اور جامع ہے، زندگی کے ایک ہی پہلو یا طرز عمل ایک ہی نوع تک محدود نہیں۔ یہاں ہم قرآن سے چند آیات درج کرتے ہیں جو عمل کی فضیلت اور اہمیت ظاہر کرتی ہیں:

”عمل صالحاً..... ما کانو یعملون“ (النحل: ۹۷)

”ومن احسن قولاً..... اذنی من المسلمین“ (فصلت: ۳۳)

”ان الذین آمنوا..... من احسن عملاً“ (الکف: ۳۰)

”ولقد آتینا..... بما تعملون بصیر“ (سبا: ۱۰-۱۱)

”فمن کان یرجو..... عملاً صالحاً“ (الکف: ۱۱۰)

”فاستجاب لهم..... ذكرا و اؤمئى“ (آل عمران: ۱۹۵)

”والىه يصد..... يرفعد“ (فاطر: ۱۰)

## ذمہ داری اور جواب دہی

منطقیوں کے نزدیک انسان (اپنی عقلی برتری کے لحاظ سے) حیوانِ ناطق ہے۔ معاشرتی علوم کے ماہرین (انسان کے اجتماعی تعلقات کے پیش نظر) اُسے مدنی الطبع حیوان سمجھتے ہیں۔ شریعت کے لحاظ سے بھی انسان کی تعریف کی جاسکتی ہے کہ وہ ایسی مخلوق ہے جو مکلف بنا دی گئی ہے۔ کیونکہ اس کرۂ ارض میں بسے والے تمام مخلوقات کے مقابلے میں اُسے پابند اور جواب دہ بنایا گیا ہے۔ قرآن اسی پابندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

انا عرضنا..... وحملها الانسان

ایک اہم سید کی وجہ سے انسان کو مکلف بنایا گیا ہے۔ اس کائنات میں وہ واحد ایسی مخلوق ہے جسے ارادے کی آزادی عطا کی گئی ہے، جس کی وجہ سے وہ چاہے تو قانون و قواعد اور اقدار کی پابندی گوارا کرے اور چاہے تو انہیں ترک کر دے۔ جمادات میں نہ ارادہ ہے نہ اختیار، اور وہ اللہ کے احکام کے پابند ہیں۔ حیوانات میں اللہ نے جملی طور پر ایسی خصلتیں رکھ دی ہیں کہ وہ ان سے کسی طرح انحراف نہیں کر سکتے۔ مثلاً کبھی گھاس نہیں کھائے گا اور بکری گوشت نہیں کھاتی۔

مگر انسان کو کسی اور طبیعت پر پیدا کیا گیا ہے۔ ایک طرف زندگی کے بعض پہلوؤں میں اللہ تعالیٰ نے اُسے کائناتی قوانین کا پابند بنایا ہے جس سے انحراف انسان کے لیے ممکن نہیں۔ ”ایک طرف اس پر اس فقہاء کے قوانین عائد ہونے ہیں جس میں وہ سانس لیتا ہے، پھر جسم کے اصول ہیں مثلاً ”نظام ہضم، دورانِ خون، پھر حرارت اور روشنی کے قوانین ہیں، جن سب کا وہ پابند ہے۔ دوسری طرف اسے قدرتِ ارادہ و اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے افعال و اعمال میں بغیر کسی جبر و اکراہ کے خود مختار ہے۔“ اسی ارادے کی موجودگی، انسان کو ان تمام اعمال کے لیے جوابدہ بناتی ہے جو وہ عمر بھر کرتا ہے۔ انسان کا عروج و زوال دونوں اس بات سے مشروط ہیں کہ اُسے مکلف بنایا گیا ہے اور اُسے ارادے کی آزادی دے کر جواب دہ بھی کر دیا گیا ہے۔ مکلف ہونے کی صورت میں وہ اتنا بلند ہو سکتا ہے کہ اس زمین پر خلیفہ کا منصب حاصل کر سکتا ہے اور گرنے پر اُسے تو اسفل ساقلیں ہو جائے ہر عمل کے لیے

ہر انسان انفرادی طور پر جواب دہ ہے۔ یہ انصاف سے بعید ہے کہ اسے ایسی خطاؤں کے نتائج بھگتے کے لیے کہا جائے جو اس سے سرزد ہی نہیں ہوئیں اور یہ بھی انصاف نہیں کہ دوسروں کی نیکیوں کا اجر سمیٹ لے۔ اس بارے میں قرآن کی چند آیات اشارہ کرتی ہیں:

”ام لم ینبأ..... و ذذ اٰخری“ (الجم: ۳۶-۳۸)

”بلیٰ منا کسب..... اصحاب الناد“ (البقرہ: ۸۱)

”والسارق والسارقہ..... کما کسبا“ (المائدہ: ۳۸)

”ثم قونی..... لا یظلمون“ (البقرہ: ۲۸۱)

”لہا ما کسبت و علیہا ما اکتسبت“ (البقرہ: ۲۸۶)

”ووفیت کل..... لا یظلمون“ (آل عمران: ۲۵)

”الیوم تجزی..... لا یظلم الیوم“ (غافر: ۱۷)

”قلک امة قد خلت..... یعملون“ (البقرہ: ۱۳۳)

ذمہ داری اور جواب دہی کی بات کرنے ہوئے مسئلہ قدر پر ضرور بحث چلی نکلتی ہے کیونکہ یہ کائنات سے انسان کے ابدی تعلق کی بنا پر ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، جیسے کہ ارادہ و اختیار انسانی اہم ہے۔ اس مسئلے پر اسی روز سے بحث جاری ہے جب سے انسان نے اپنے آپ کو جانا اور شاید روزِ حشر تک جاری رہے گی۔ اسلام سے زیادہ کسی اور مذہب نے اس مسئلے کا بہتر حل پیش نہیں کیا۔ ہندوؤں میں یہ عقیدہ رائج ہے کہ تمام مخلوقات میں (انسان ہوں یا حیوانات، نباتات یا جمادات) صرف تقدیر ہی اول و آخر ہے۔ آتش پرستوں کے نزدیک موجودات دو خداؤں میں بٹی ہوئی ہیں: ایک خدائے نور اور دوسرا خدائے ظلمات جس چیز پر خدائے نور کا غلبہ ہو وہ نیکی ہے اور جس پر خدائے ظلمات کا غلبہ ہو وہ بدی ہے۔ خیر و شر کی اس دائمی آدیزش سے خود خدائے نور بھی محفوظ نہیں۔ یونانیوں کا عقیدہ ہے کہ تقدیر عبد اور مہبود دونوں پر غالب ہے۔ یہودیوں کے ایک فرقے کا خیال ہے کہ تقدیر کا حکم غالب رہتا ہے، مگر ایک فرقے کو سب فرقوں پر قبضت حاصل ہے اور ان کی اولاد کو باقی سب کی اولاد پر سبقت ہے اور ان کے اعمال و افعال سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔ عیسائیوں کا خیال ہے کہ حقیقی دین صرف ان کا ہے کیونکہ ”گناہِ اول“ کا عقیدہ تقدیر کی بالادستی ظاہر کرتا ہے اور اس عقیدے کی رو سے آدمؑ کے ”گناہ“ اور اس کی اور جملہ بنی آدم کی موت

میں ایک ربط ہے۔

فلاسفہ میں سے واقعین کہتے ہیں کہ انسان ارادے اور اختیار کا مالک ہے لیکن یہ ارادہ انسان کی میراث، جسم اور معاشرے کی حدود میں مقید ہے۔ مثلاً اس کی پیدائش اس کے اختیار سے باہر ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے لیکن وہ نہیں چاہتا جو چاہتا ہے۔ فلاسفہ کا ایک اور فرقہ روحیوں سے جن کا خیال ہے کہ انسانی جسم مادے کے حکم کا پابند ہے۔ اس کی روح آزاد اور خود مختار ہے جو کبھی تو اپنی مرضی سے جسم کے زیر نگیں ہوتی ہے اور کبھی جسم کو زیر نگیں کر لیتی ہے۔ یہ تمام عقائد اور مذاہب تقدیر کے مسئلے کا ایسا حل پیش نہیں کرتے جو قلب و عقل کو مطمئن کر سکے، جیسا کہ اسلام نے کیا ہے کہ اللہ کے وجود پر ایمان کے ساتھ عقل کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ کی قدرت اور حکمت سے، اور قدرت اور حکمت کے درمیان عدل سے الکا کر سکے۔ عقل کے لیے یہ تسلیم کرنا ممکن ہی نہیں کہ انسان مکلف اور مجرب اختیار میں برابر ہیں۔ دشواری اس وقت پیش آتی ہے جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے یا کسی فعل پر تداوت کا عذاب جھیلنا پڑتا ہے اور اسے اللہ کی قدرت اور اس کے انصاف کے درمیان موافقت پیدا کرنے کا احتیاج ہوتی ہے۔ اس مشکل کا حل یہ ہے کہ ہم یاد رکھیں کہ خدائی عدل کا ایک نظر سے احاطہ کرنا ممکن ہے۔ نہ وہ ایک حالت میں محدود ہے کسی اچھی تصویر میں سیاہ دھبہ بد نما دلغ ہے۔ اگر ہم تصویر کو چھپادیں اور صرف دھبے کو دور سے دیکھیں لیکن یہی سیاہ دھبہ اس تصویر میں استعمال کیے گئے رنگوں میں سے ایک رنگ بھی ہے جس سے مفر نہیں، بلکہ بعض اوقات وہ تصویر کا حسن بڑھا دیتا ہے اور اس کے بغیر اس کی دلکشی اور جمال ممکن نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہم اپنی زندگی میں کسی حادثے سے دوچار ہوتے ہیں تو اُسو بہاتے ہیں پھر کچھ دیر بعد ہم ہنسنے بھی لگتے ہیں، یا کوئی گمشدہ چیز مل جائے تو ہمیں خوشی ہوتی ہے۔

کائنات کے گزشتہ ایک ہزار برس پر نظر ڈالیے، ہمیں اس میں قدرتِ خداوندی اور عدلِ خداوندی میں ہم آہنگی کے کئی نشان ملیں گے، مگر پورے ایک برس تک بھی اس پر غور کرتے رہیں تو عین ممکن ہے ہمیں کچھ نئے۔ کسی ایک واقعے کو جو دنیا کے کسی گوشے میں کسی خاص فرد پر گزرا ہو، یاد کرنا مشکل ہے۔ اسی طرح ہم قدرتِ خداوندی کا اور عدلِ خداوندی میں موافقت کے قریب تو آجاتے ہیں لیکن اس موافقت کے تمام دلائل کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ خود عقل کے لیے حکمتِ خداوندی کے دلائل کا احاطہ کرنا غیر معقول بات ہے کیونکہ عقل محدود ہے اور قدرت غیر محدود۔



اس اساس پر ہم قرآن مجید کی ان آیات کو سمجھ سکتے ہیں جو اللہ کی قدرت، انسان کی خود مختاری اور اپنی قدرت کو نافذ کرنے کے لیے عدلِ خداوندی اور انسان کی خود مختاری پر اس کے محاسبے سے متعلق ہیں :

”وما تشاؤون..... كان عليماً حكيماً“<sup>۱۱</sup>

”ولو شئنا لآيتنا كل نفس“<sup>۱۲</sup>

”ذات يا ان الله..... ما با نفسهم“<sup>۱۳</sup>

”كل امرئ بما كسب“<sup>۱۴</sup>

”والذين جاهدوا فينا ينهم سبيلنا“<sup>۱۵</sup>

”ومن يرو.....“<sup>۱۶</sup>

## حواشی

- ۱- مصطفیٰ السباعی : " من رواح حصار تنہا " : ۱۴
- ۲- ایضاً ص ۶۴
- ۳- ایضاً ص ۶۸
- ۴- ایضاً ص ۷۰
- ۵- محمد جلال کشک : " المارکیہ والعز والفکر " ص ۲۸
- ۶- ایضاً ص ۲۸ ( نقل از استاذ و سیم خالد )
- ۷- سید قطب : ہذا الذین - ص ۵۳
- ۸- ابو الحسن ندوی : ماذا خسر العالم باخطا المسلمین
- ۹- عباس العقاد : حقائق الاسلام - ص ۱۹۱
- ۱۰- بنی اسرائیل : ۵۵
- ۱۱- البقرہ : ۲۵۳
- ۱۲- الزمر : ۹
- ۱۳- الزخرف : ۳۲
- ۱۴- النحل : ۷۱
- ۱۵- محمد قطب : بیہات حول الاسلام - ص ۱۰۲
- ۱۶- الحجرات : ۱۰
- ۱۷- ڈاکٹر صلاح الدین المنجد : المجمع الاسلامی فی ظل العدالتہ - ص ۳۸
- ۱۸- بخاری و مسلم
- ۱۹- ابو الاعلیٰ مودودی : بین الدعوة القومیۃ والرابطۃ الاسلامیۃ -
- ۲۰- ابو الاعلیٰ مودودی : مرجع سابق ، ص ۱۲

۲۱۔ عبدالرحمن عزام: "الرسالة الخالدة" - ص ۲۰

۲۲۔ "ہذا الدین" - ص ۸۳-۸۴

۲۳۔ النساء: ۱

۲۴۔

۲۵۔ ابوالاعلیٰ مودودی: "بین الدعوة القومية والربط الاسلامیة"

۲۶۔ الحج: ۶۵

۲۷۔ النساء: ۹۷

۲۸۔ التوبة: ۲۴

۲۹۔ ابوبکر البزار: مسند (حدیث حذیفہ رضی)

۳۰۔ متفق علیہ

۳۱۔ مسلم، صحیح (حدیث جابر رضی)

۳۲۔ ابوالحسن الندوی: "ماذا خسر العالم باحتطاط المسلمین" - ص ۱۹۹

۳۳۔ زین نور الدین زین: "نشور القومية العربیة" - ص ۹۰

۳۴۔ ایضاً - ص ۸۶

۳۵۔ "جمال پاشا کے دمشق پہنچنے سے پہلے، چند ترکوں نے دمشق اور بیروت میں فرانسیسی سفارتخانوں

پر حملہ بولا اور وہاں اچھی طرح کماشی کی۔ وہاں انہیں کچھ ایسے کاغذات ملے جن میں عربوں کی مشہور

شخصیات پر الزام تراشی کی گئی تھی۔ ان وثیقوں میں جس ذوق و شوق کا اظہار کیا گیا تھا وہ

خیانت پر دلالت کرتا تھا، لیکن جمال پاشا نے ارادہ کیا کہ عوام میں اچھا تاثر قائم کرے اس

لیساس نے صرف شریف حسین کے حالات ظاہر کرنے پر اکتفا کیا اور باقی اوراق کو الماری میں

رکھ کر مقفل کر دیا۔" جارج انطونیوس: "یعقبة العرب"

۳۶۔ برنارڈ لوویس: مغرب اور شرق اوسط

۳۷۔ ابوالحسن ندوی: العرب والاسلام، ص ۹۴

۳۸۔ الذاریات: ۵۶

۳۹۔ النحل: ۳۶

۴۰۔ قرآن کریم کے اس کی طرف کئی آیات میں اشارہ کیا ہے، مثلاً الانعام: ۵۶، مریم: ۲۲۶۔ ۲۲۷

المائدہ: ۷۶، العنکبوت: ۱۷، الشعراء: ۸۱، الزمر: ۳، سبا: ۴۱

۴۱۔ اس کے بارے میں بھی متعدد آیات ہیں، مثلاً البقرہ: ۸۳، التوبہ: ۳، النسا: ۱۷۲،

مریم: ۲۲

۴۲۔ معجم طبرانی

۴۳۔ صحیح مسلم

۴۴۔ محمد المبارک: "نظام الاسلام" "عبادت" کا باب

۴۵۔ محمد ابو زہرہ: المجتمع الانسانی فی ظل الاسلام، ص ۹۸

۴۶۔ متفق علیہ

۴۷۔ المودوری: مبادی الاسلام - ص ۹۲

۴۸۔ عباس محمود العقاد: حقائق الاسلام ص ۱۰۸

۴۹۔ المجتمع الانسانی فی ظل الاسلام - ص ۹۶-۹۷

۵۰۔ محمد المبارک: نظام الاسلام

۵۱۔ عباس محمود العقاد: حقائق الاسلام - ص ۱۰۲

۵۲۔ محمد ابو زہرہ (مرجع سابق) ص ۹۱

۵۳۔

۵۴۔ ہود: ۶۱

۵۵۔ یس: ۱

۵۶۔ روایت احمد از حدیث ابن عمر

۵۷۔ حدیث: گو تو کلمتہ علی اللہ.....

۵۸۔ یوسف القرضاوی: مشکاة الفقہ و علمہ فی الاسلام - ص ۲۶-۲۷

۵۹۔ الجمعہ: ۱۰

۶۰۔ الکصف: ۱۱۰

۶۱۔ المزمل: ۲۰

۶۲۔ صحیح بخاری

۶۳۔ صحیح بخاری

۶۴۔

۶۵۔

۶۶۔ الاحزاب: ۷۲

۶۷۔ نظام الاسلام: العقیدہ والعبادۃ، ص ۸۲

۶۸۔ عباس محمود العقاد، حقائق الاسلام، ص ۸۱

۶۹۔ قرآن مجید کی بعض آیات کی یہ تفسیر ہو سکتی ہے کہ تقدیر کا مطلب کائنات کا کسی معین نظام پر چلنا ہے۔

۷۰۔ العقاد: مرجع سابق۔ ص ۸۲-۸۳

۷۱۔ الانسان: ۳۰

۷۲۔ السجدہ: ۱۳

۷۳۔ الانفال: ۵۳

۷۴۔ الطور: ۲۱

۷۵۔ التکوین: ۶۹

۷۶۔ آل عمران: ۱۴۵

# اسلام کے مختلف نظام

## سیاسی نظام

بہت سے لوگ جو غیر ملکی تعلیمات سے متاثر ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ دین فقط انسان اور خدا کے درمیان تعلق کا نام ہے، یا دوسرے الفاظ میں یہ چند رسوم و عبادات کا نام ہے جنہیں انسان اللہ کی موجودگی کا اعتراف کرتے ہوئے ادا کرتا ہے اور اس کے آگے سر جھکا تا ہے۔ اسی وجہ سے وہ لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ دین صرف اس تعلق تک محدود ہے اور اس سے آگے امور زندگی کے سوائے روزی کمانے اور معاشرے کی تنظیم اور وہ اصول بنانے میں جو انسان کی فکری اور معاشرتی سرگرمیوں کو ضبط میں لانے ہیں، اس کا کوئی حصہ نہیں۔ اسی طرح وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام سیاسی، اقتصادی، مالی، عسکری، قانونی اور عدالتی اداروں سے بھی جو معاشرتی تنظیم کی صورت گئی کرتے ہیں، دین کا کوئی علاقہ نہیں۔ اس عقیدے کے مانگ امور دین اور امور دنیا کو الگ الگ کر دیتے ہیں اور امور دنیا صرف انسان کے سپرد کر دیتے ہیں، جنہیں دین سے کوئی مطلب نہیں۔

دراصل، اسلام ان کے تصور سے مختلف ہے کیونکہ اسلام انسان کے تمام امور کو منظم کرنے کے لیے آیا تھا۔ ان لوگوں کے تصور کے لحاظ سے یہاں تک تو درست ہے کہ یہ انسان اور مقررہ عبادات ادا کرنے کے طریقے میں ربط کا نام ہے، لیکن اس سے بھی آگے افراد اور معاشرے کے درمیان تعلقات مربوط کرنے کا نام بھی ہے، کیونکہ اسلام دین بھی ہے اور دولت بھی، عقیدہ بھی ہے اور نظام بھی، اخلاق بھی ہے اور شریعت بھی، سیاست بھی ہے اور حکومت بھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں

کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم اتنا وسیع اور جامع ہے کہ اس میں انسان کے وہ تمام اعمال شامل ہیں جس سے وہ خدا کی رضا کا طلبگار ہوتا ہے۔ اس لیے وہ صرف ان رسوم و افعال تک محدود نہیں ہیں انسان مقررہ اوقات میں اور معین طریقے سے ادا کرتا ہے۔

اسی بنا پر ہم نظام اسلامی میں سیاسی، مالی، اخلاقی اور معاشرتی تنظیموں کو شامل کرتے ہیں اور ان تمام تنظیمات کو اور ان کی غرض و غایت کو بیان کرتے ہیں کہ وہ دوسرے نظاموں سے کس طرح مختلف ہیں اور ان میں نئی بات کیا ہے، تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ نظام اسلام دوسرے نظاموں پر کس طرح اور کیا فوقیت رکھتا ہے۔ یہ اس لیے بھی ہے کہ اسے خداوند دانا و بینا نے نازل کیا ہے اور جس چیز کو اللہ نے بتایا ہو، انسانی عقولیں اور شعور اس سے بہتر چیز پیدا نہیں کر سکتیں۔

اسی لیے ہم اسلام کے سیاسی نظام سے ابتدا کرتے ہیں کیونکہ یہ نظام دیگر نظاموں کی اس سے ہے اور سب انسانی ادارے لازماً قانون اور حکومت کے محتاج ہوتے ہیں۔ حکومت کا نقشہ اور اس کی غرض و غایت واضح ہو جائے تو دوسری تمام تنظیموں کا سمجھنا آسان ہوگا۔

## کیا اسلام کے اصولوں پر کوئی

### ریاست قائم ہو سکتی ہے؟

اسلام کا سیاست اور حکومت کا مشتمل ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس پر مسلمانوں میں خلافت عثمانیہ کی انتہا تک کوئی بحث نہیں ہوئی۔ اسلام کی فطرت بھی اس کی تائید کرتی ہے اور رسول کریم کی مدینہ کی طرف ہجرت سے لے کر اس وقت تک مسلمانوں کی تاریخ بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہے علمائے اسلام میں بھی اس بارے میں کوئی شک نہ تھا اور اسلامی افکار بڑے مصادریں اس پر متفق ہیں اس حقیقت کو درج ذیل عنوانات کے تحت واضح کیا جا سکتا ہے:

- (۱) قرآن کریم میں ریاست کے قیام کے بارے میں احکام۔  
 (۲) سنت نبویؐ اور تاریخ اسلام میں اس کے بارے میں اشارات۔  
 (۳) اسلام کے اہم مصادر میں اس موضوع پر افکار۔

## ۱۔ قرآن اور ریاست

قرآن کریم میں ریاست اور حکومت کے قیام کے بارے میں کئی آیات وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً وہ آیات جو اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیتی ہیں:

”یا ایہا الذین آمنوا..... واولی الامر منکم“ اور  
 ”ولو رءوه..... یستنبطوہ منہم“

کچھ ایسی آیات ہیں جو نبی کریمؐ کو مختلف قانونی، حربی اور انتظامی امور کا درس دیتی ہیں اور جو ریاست کے اہم اصولوں کے دائرے میں آتی ہیں۔ مثلاً:

”فبما رحمة من اللہ..... ان اللہ یحب المتوسلین“ اور قول باری تعالیٰ:

”وان احکم..... ما اتول اللہ والیک“

## ۲۔ سیرت و سنت نبویؐ اور ریاست کا تصور

نبی کریمؐ کو ریاست اور حکومت کے مختلف اہم امور درپیش رہے اور آپؐ مختلف مالی، خاندانی اور تعزیری معاملات میں، اور حدود قائم کرنے، والیوں کی تقرری، غزوات و سرایا میں لشکر کے سرداروں کی تعیناتی اور اسلام کے مبلغین کی تقرری، صدقات کی تقسیم، دستموں سے جنگ، غنیمت اور زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم جیسے معاملات میں فیصلے فرماتے رہے، جو حکومت ہی کے کام ہیں۔ آپؐ نے اپنی ریاست میں حکومت کو مستحکم فرمایا اور قرآن کریم کے احکام اور ارشادات کو نافذ کیا۔ اس دور میں بعض ادازیں بلند ہوئی ہیں کہ رسول کریمؐ کے طے کردہ تمام معاملات کا تعلق حکومت کے شعبے سے نہیں تھا، نہ ریاست کے انتظام سے تھا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ آپؐ کے تمام عمل صرف دین اور اس کی دعوت سے مخصوص تھے۔ ان مصنفین کی کوشش تھی کہ دین کو ریاست سے الگ کر دیں، اور وہ اس بات سے منکر تھے کہ نظام خلافت، جو مسلمانوں میں عرصہ دراز تک رائج رہا، نظام اسلامی تھا۔



اس نظریے کے خلاف ہم اصول سیاست سے ریاست کی مختلف تعریف پیش کرتے ہیں، تاکہ معلوم ہو سکے کہ رسول کریمؐ کی حکومت ریاست سے کہاں تک مثل تھی اور آپؐ کس حد تک اعمال سیاست کو انجام دیتے تھے سیاست کے ماہرین نے ریاست کی کئی تعریفیں کی ہیں، ان میں سے جامع ترین یہ ہے کہ ”ریاست، افراد کی جماعت ہے جو کسی مقررہ خطے میں ہمیشہ سکونت پذیر ہو، اس کی اپنی معنوی شخصیت ہوتی ہے اور نظام حکومت ہوتا ہے جس کی اطاعت کی جاتی ہے، جو احکام صادر کرتی ہے اور اسے سیاسی اقتدار حاصل ہوتا ہے۔“ اس سے ریاست کے قیام اور وجود کے لیے درج ذیل اجزاء ثابت ہوتے ہیں:

- ۱۔ آبادی جو مستقل طور پر کسی مخصوص خطہ ارض میں سکونت رکھتی ہو۔
  - ۲۔ معنوی شخصیت، جس سے یہ آبادی متصف ہوتی ہے اور صاحب اختیار شخص اسے مانتا ہے۔
  - ۳۔ نظام حکومت، جس کی اطاعت کی جائے اور حکومت کی صورت یا نوع کو واضح کرتا ہے۔
  - ۴۔ اقتدار اعلیٰ، جس کی وجہ سے یہ آبادی خود مختار ہوتی ہے اور کسی اور ریاست کے تابع نہیں ہوتی۔
- یہ تمام اجزاء ریاست، مدینہ میں آنحضرتؐ کی حکومت میں پائے جاتے تھے کیونکہ مدینہ میں رہنے والی مستقل آبادی بھی تھی (اور پھر سارے جزیرہ نمائے عرب کی آبادی) اس آبادی کی معنوی شخصیت بھی تھی جس کا اظہار رسولؐ کے اختیار و حکم سے ہوتا تھا، اس کا ایک واضح نظام بھی تھا جس کی اطاعت کی جاتی تھی اور جس کی بددلت حدود قائم کی جاتی تھیں اور لوگوں میں فیصلے صادر ہوتے تھے۔ اسی طرح اس آبادی کو مستقل اقتدار اعلیٰ بھی حاصل تھا اور وہ اس وقت کی کسی سلطنت (مثلاً ایران، روم، یا حبشہ) کے زیر نگیں نہ تھی۔ ہر انصاف پسند شخص جو قرآن کریم سے واقف، تاریخ اسلام سے آشنا اور سیرت نبویؐ جانتا ہے، یہی فیصلہ کرے گا کہ مدینہ میں رسول کریمؐ نے ریاست کی بنیاد رکھی تھی جس کا دوسری ریاستوں سے یہ فرق تھا کہ وہ خدا اور اس کے نبیؐ کی طرف بھی دعوت دینی تھی۔
- رسولؐ کی دعوت اور حقیقت اسلام کے مزاج سے آگاہی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک یہ نہ جان لیا جائے کہ دولت دین ایک دوسرے کے ہم معنی تھے۔ اس حقیقت کا اعتراف مغربی اور مشرقی مصنفین کی بڑی تعداد لے گیا ہے۔

ہم نہیں جانتے حکومت اور ریاست اور کیا چیز ہوتی ہے اگر رسولؐ کے مدینہ میں تمام اعمال کو حکومت اور ریاست کی قسم کے اعمال نہ سمجھا جائے، یا نظام سیاسی کا قیام، حدود پر عمل، لوگوں

میں عدل و انصاف اور معاہدات کی توثیق حکومت میں شامل نہیں؟ اگر یہ سب حکومت ہی کے فرائض نہیں تو پھر کیا ہیں؟

دیکھئے رسول کریمؐ کس طرح ایک معاہدے میں آپؐ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کا اعلان فرماتے ہیں، جو ہاجرین و انصار اور یہود کے درمیان تھا جس میں آپؐ نے یہودیوں کو فریق بنایا، اور ان کے دین و مال پر معاہدہ کیا اور اقرار لیا، کچھ شرطیں ان پر عائد کیں اور کچھ اپنے اوپر عائد کیں اس معاہدے کی ابتدا کچھ یوں ہوتی ہے:

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔“

یہ تحریر ہے محمدؐ کی طرف سے، قریش اور یثرب کے مومنین اور مسلمین کے درمیان اور حوان کے پیروہیں اور ان سے شیعہ ہیں اور ان سے معاہدے میں شریک ہیں، یہ سب لوگوں سے سوا ایک امت ہیں۔۔۔۔۔“

اس تحریر میں اسلامی ریاست اور ان یہود میں جو موجود تھے، ایک دوسرے پر چڑھائی نہ کرنے کا معاہدہ بھی شامل ہے۔

ریاست کے قیام کے بارے میں سنت نبویؐ میں رسول کریمؐ کا یہ قول بھی آتا ہے: ”جو شخص اس حالت میں مرا کہ اس نے بیعت نہیں کی تو وہ جاہلیت کی موت مرا“ اور اس معنی میں آپؐ نے تاکیداً کہا: ”جب تم میں سے تین افراد سفر پر نکلیں، تو اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنالیں“ آپؐ نے یہ بھی فرمایا: ”تم میں سے تین افراد جب بھی کسی خالی قطعہ زمین میں ہوں تو ضروری ہے کہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں“

جب رسول کریمؐ بنین مسلمانوں کو بھی امیر یا ذمہ دار شخص کے بغیر پسند نہیں فرماتے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ لاکھوں کروڑوں مسلمان کسی ریاست یا کسی نظام حکومت کے بغیر رہیں، حوان کے امور کی نگرانی ہو، ان کا دفاع کرے اور ان کے مفادات کی امین ہو؟

اسی میں میں ایک حدیث ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

”تم میں سے ہر ایک حیر و اہا (یعنی نگران) ہے اور ہر نگران سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ امام اپنی رعیت کا مسئول ہے، ہر آدمی اپنے اہل خانہ کے بارے میں مسئول ہے۔“

یہ تو رسول کریم اور آپ کی سیرت کا احوال تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ جب ہم وفات رسول کے بعد مسلمانوں کے معاملات پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے حاکم یا امیر کا انتخاب دفن رسول سے بھی اہم سمجھا۔ بعض مسلمان تو رسول کریم کی تجہیز و تکفین میں مصروف ہو گئے اور باقی سب سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور طویل بحث و تخیص کے بعد جس سے جمہوریت اور مکمل شورائی روح جھلکتی ہے، مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ رسول اللہ مقرر کیا، کیونکہ آپ اسلام میں الاولون میں سے تھے اور رسول کریم سے رشتہ داری بھی تھی۔ اس کے بعد سے کوئی موقع ایسا نہیں آیا کہ مسلمان خلیفہ یا اپنے امور کے ذمہ دار شخص کے بغیر رہے ہوں، جو اسلام اور مسلمانوں کا دفاع کرے، ریاست کو دشمنوں سے محفوظ رکھے اور لوگوں میں عدل و انصاف قائم کرے۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد عمرؓ، ان کے بعد عثمانؓ، اور پھر علیؓ ہوئے، یہاں تک کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد خلافت ختم ہو گئی، مگر مسلمان ملک اور قومیں برقرار رہیں۔

### ۳۔ اس موضوع پر قابل اعتماد آراء

مسلمان ریاست کے قیام کی تاکید کے لیے ہم بعض صحابہؓ اور سلف صالح کے اقوال نقل کرتے ہیں اس کے علاوہ بعض قابل اعتماد سیاسی مصادر بھی اس موضوع پر بیان کرتے ہیں:

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: ”محمدؐ تو اپنی راہ چل دیئے، مگر اس دین کے لیے کوئی قیم ہونا ضروری ہے۔“ عمر بن الخطابؓ نے فرمایا: ”جماعت کے بغیر اسلام نہیں، امارت کے بغیر جماعت نہیں اور اطاعت کے بغیر امارت نہیں۔“ الماوردی نے ”الاحکام السلطانیہ“ میں لکھا ہے: ”امامت اس کی ہے جو امت میں اس کا مستحق ہو اور بالاجماع واجب ہے۔“ الغزالی ”الاقتصاد فی الاعتقاد“ میں لکھتے ہیں: ”دنیا اور جان و مال کی سلامتی ایسے سلطان کے بغیر ممکن نہیں، جس کی اطاعت کی جاتی ہو۔ اس کا مشاہدہ اس وقت (بالخصوص ہوتا ہے جب کسی سلطان یا امام کے مرنے کے بعد فتنے نر اٹھاتے ہیں۔ اگر صورت حال یہی رہے اور اس کا سدباب کسی سلطان مطاع کی تقرری سے نہ کیا جائے تو فساد برپا ہوگا، تلواریں چلیں گی اور اقتصادی بد حالی جنم لے گی۔“

ابن تیمیہ ”السیاسة الشرعية“ میں کہتے ہیں: ”یہ جان لینا چاہیے کہ لوگوں کے معاملات کی نگہداری دین کے اہم فرائض میں سے ہے، بلکہ یہ کتنا چاہیے کہ دین اس کے بغیر سلامت نہیں رہتا۔“

کیونکہ بنی آدم کے مفادات باہمی تعاون سے پورے ہوتے ہیں، کیونکہ افراد ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ ان کے لیے باہمی رضامندی سے اپنا نہیں مقرر کرتا ضروری ہے..... رسول کریمؐ نے تین آدمیوں کے لیے بھی اپنے میں سے امیر مقرر کرتا واجب قرار دیا ہے..... اس سے قیاس کریں کہ جب چھوٹی جماعتوں کے لیے یہ بات ضروری ہے تو بڑی جماعت کے لیے کیوں نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے، اور یہ فریضہ طاقت اور امارت کے بغیر سرانجام نہیں پاسکتا۔ اسی طرح جہاد، عدل و انصاف اور حدود کا قیام بھی طاقت اور امارت کا متقاضی ہے اسی لیے کہا گیا کہ: سلطان یا حاکم زمین پر خدا کا سایہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا: ظالم امام کے زیر حکومت ساٹھ سال، سلطان کے بغیر ایک رات سے بہتر ہیں۔“

ابن خلدون اپنے ”مقدمہ“ میں کہتے ہیں: ”امام کی تقرری واجب ہے، اور اس کا وجوب شریعت میں اجماع صحابہ و تابعین کے سبب معروف ہے۔ صحابہ کرامؓ نے نبی کریمؐ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کرنے میں جلدی کی اور اپنے معاملات ان کے سپرد کیے، اور اسی طرح ان کے بعد ہر دور میں ہوتا چلا آیا اور کسی دور میں بھی لوگوں نے تراج نہ پیدا ہونے دیا۔ انہوں نے واضح اجماع سے امام کی تقرری کے وجوب کو استقرار و انتشار بعض لوگوں کے نزدیک اس کے وجوب کا جواز عقل ہے کیونکہ اس پر اجماع عقل، ہی کی رو سے ہوا۔“

ہم دیکھتے ہیں کہ تمام دلائل و اقوال اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام دین بھی ہے اور ریاست بھی اور سیاسی نظام، ان تمام نظاموں میں سے ایک ہے جنہیں اسلام نے اس لیے پیش کیا کہ اس کے اصولوں کی پابندی کی جائے اور ہر اس بات کو تسلیم کیا جائے جو نیکی، بھلائی اور دنیا و آخرت میں لوگوں کی فلاح کی طرف دعوت دے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس فصل کو، نبی کریمؐ کے بعد ریاست اور حکومت کے برقرار رہنے اور اس کے وجوب پر نص قرآنی سے چند آیات پیش کر کے ختم کریں۔ یہ آیات عام مسلمانوں سے مخاطب ہیں اور ان میں کسی مقررہ دور یا خاص عہد کی تخصیص نہیں۔ ان آیات میں ریاست اور حکومت کے باب میں مسلمانوں کو تمام فرائض پورے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان ان فرائض کو اپنے نمائندوں ہی کے ذریعے ادا کر سکتے ہیں اور یہی اولوالامر یا اہل حل و عقد ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وقاتلوا فی سبیل اللہ ... لا یحب المعتدین“ ( )  
 کیا مسلمانوں کے ممکن ہے کہ دشمن سے کسی نظام کے بغیر جنگ کر سکیں، جس کے سربراہ ذمہ دار انخاص  
 ہوں اور مسلمانوں کے قائم ہوں؟ اسی طرح قرآن میں وارد ہوا:

”ولکم فی القصاص حیاة یا اولی الاباب“ ( )  
 سوچئے کہ حدود کی ضمانت یا قصاص وغیرہ کس طرح ممکن ہے۔ جب تک ایسی حکومت نہ ہو جو اس  
 کام کی ذمہ دار ہے؟ قرآن مجید کہتا ہے:

”واعذوا للہم ما استعظتم ... عدوا للہ وعدوکم“ ( )  
 وہ کیا طریقہ ہے جس سے یہ قوت بہم پہنچائی جاسکتی ہو، اگر نظام اور نظام کے چلانے والے نہ ہوں؟

## اسلامی سیاسی نظام اپنی ذات میں مکمل ہے:

اسلامی سیاسی نظام مستقل بالذات حیثیت کا مالک ہے، جو دوسروں سے مختلف اور ممتاز ہے  
 اور عدم حاضری کی سیاسی لغت کی کوئی اصطلاحات اس پر منطبق نہیں ہوتیں۔  
 بعض لوگوں نے جن اسلام کے دوست اور پیروکار اور مخالفین دونوں شامل ہیں یہ کوشش کی  
 ہے کہ اسلامی نظام پر نئے یا پرانے نام چسپاں کریں۔ اسلام کے دوستوں نے یہ خیال کیا کہ اس بات میں  
 اسلام کی عزت ہوتی ہے اور اس کی شان بلند ہوتی ہے۔ اسلام کے دشمن تو چاہتے تھے کہ لوگوں کی نظروں  
 میں اسلام کی تحقیر ہو اور اس میں جو پاکیزگی اور اچھائی ہے، وہ لوگوں کے سامنے ظاہر نہ ہو۔  
 مسلمانوں میں سے کئی افراد اسلام پر جمہوریت، ائٹراکیت، مہرماہ داری ائٹنڈتھاہیت یا امریت  
 کے نام حیرت دیتے ہیں اور دشمنان اسلام اسلامی حکومت کو ”تھیٹا کرسی“ یا مذہبی فرقے کی حکومت کے نام  
 سے پکارتے ہیں۔

اس مناسبت سے یہ لازم آتا ہے کہ بعض اعتراضات وغیرہ کا جائزہ لیا جائے:  
 ۱۔ ان اسماء اور اصطلاحات کے اطلاق سے اسلام کی شان بلند نہیں ہوتی کیونکہ اسلام بذاتہ ایک  
 مستقل اور نمایاں نظام ہے اور ان اصطلاحات کی اسے حاجت نہیں۔ سیاست اور حکومت  
 میں اسلام کے اپنے اصول اور نظام ہیں اور دنیا کے تمام معروف و مشہور نظام اس کی برابری  
 نہیں کر سکتے نہ اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

۲۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلامی سیاسی نظام فلاں نظام سے مماثل ہے تو اس سے مراد نہیں کہ اسلام، وہ نظام ہے۔ مثلاً اگر جمہوریت کے بعض اصول، اسلامی حکومت میں پائیں جائیں تو یہ کہنا صحیح نہیں کہ اسلام جمہوریت کا نام ہے کیونکہ جمہوری نظام میں کئی باتیں ایسی ہیں جو اسلام کے اصولوں سے متعارض ہیں کیونکہ اسلام، کائنات، زندگی اور انسان کے بارے میں اپنا خاص مزاج اور نظر رکھتا ہے۔ یہی بات اشتراکیت، یا کسی اور نظام سے نسبت دینے پر صادق آتی ہے۔ یہ تمام اصطلاحات اور نظام، ایسے معانیوں کے تجربات کا حاصل ہیں جو عرب اور اسلامی ماحول کے لیے اجنبی ہیں۔ یہ اصطلاحات تغیر و تبدل کے کئی ادوار سے گزر چکی ہیں۔ اس لیے مغرب کے لوگوں کے لیے جو انہیں استعمال کرتے ہیں ان کا ایک واضح اور معین مفہوم ہے۔ غیر عرب انہیں اس طرح استعمال کرتا ہے گویا یہ آخری مطلق حکم ہو اور اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ مروریام سے ان کے معنی کیسے بدل گئے۔ مثلاً "جمہوریت" (یا ڈیموکریسی) کو سب سے پہلے اس لفظ کو حکمائے یونان نے استعمال کیا اور ان کے نزدیک اس کا مطلب "عوام کی حکومت" تھا۔ یعنی وہ "عوام" جو حکومت کرنے کے اہل تھے اور اصلاً یونانی تھے اس قبیل کے لوگ یونان کے ہر شہر میں محدود تعداد میں تھے۔ یونانیوں نے جملہ ساکنین کو امور سلطنت میں شریک ہونے کی کبھی اجازت نہ دی کیونکہ ان میں غلام بھی تھے اور دوسرے درجے کے شہری بھی۔ چنانچہ یونان میں "جمہوریت" سے مراد ہرگز یہ نہ تھی کہ سب لوگ حکومت میں حصہ لینے یا سرداری کے اہل ہیں۔

اس "جمہوریت" سے مراد اسلام میں کیا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ جدید جمہوری نظام اور اسلام میں مماثلت ہے کہ دونوں میں حقوق میں مساوات، فرائض کی ادائیگی اور حکومت کے کاروبار میں شرکت بنیادی اصول ہیں، مگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ عوام یا ان کے نمائندے قانون سازی میں آزاد ہیں اور انہیں مطلق سیادت حاصل ہے کیونکہ یہ وہ مروجہ اصول ہیں جنہیں صرف قرآن اور سنت نے صحیح وقعت بخشی ہے۔ اس لحاظ سے لفظ جمہوریت کا اسلام پر مکمل طور پر اطلاق نہیں ہوتا۔

اسی طرح بعض دانشوروں نے اشتراکیت کا نام بھی اسلام پر چسپاں کیا ہے، ہم جو کچھ اور جمہوریت کے بارے میں کہہ آئے ہیں، وہی بات اشتراکیت کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ اگر اسلام کے اشتراکی ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ معاشرتی اور اجتماعی انصاف پر زور دیتا ہے یا شہریوں کو مساوی مواقع ہم پہنچاتا ہے، یا ذخیرہ اندوزی اور استحصال سے منع کرتا ہے تو اسلام "اشتراکی" ہے، مگر اشتراکیت عرف عام

میں، ایسی مخصوص اصطلاح ہے جو کائنات اور زندگی کے بارے میں ایک مخصوص نظریہ رکھتی ہے۔ اور اس کے خصوصی ادارے ہیں۔ اس میں پیداوار میں کے ذرائع محدود ہیں، دولت کی تقسیم کے بارے میں اس کا اپنا نقطہ نظر ہے اور یہی حال حکومت کے لیے اہلیت کا ہے۔ اس معنی میں اسلام، اثنزاکیت سے مختلف ہے کیونکہ اثنزاکیت اپنے فلسفے اور تصورات کے لحاظ سے خالص مادی نظریہ ہے جبکہ اسلام اس کے بالکل برعکس ہے، اور اس میں ذرائع پیداوار، تقسیم دولت اور نظام حکومت وغیرہ کے نظریات اثنزاکیت سے بالکل جدا ہیں۔

جہاں تک یقیناً کرسی کا تعلق ہے، جیسے دشمنانِ اسلام، اسلامی سیاسی نظام پر چپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ بھی اسلامی طرزِ حکومت پر منطبق نہیں ہوتا، اگرچہ اس کے بعض اصول سے اسلام اتفاق کرتا ہے۔ اگر یقیناً کرسی سے مراد نظامِ سیاسی کو قانونِ خداوندی سے الگ کرنا ہے تو اسلام بھی یہ کہتا ہے اور اس میں اتنی لچک ہے کہ ہر زمانے اور ہر موقعے کی مناسبت سے تطبیق کا اہل ہے لیکن اگر اس سے وہ نظام مراد ہے جو قرونِ وسطیٰ میں یورپ میں رائج تھا، تو غلط ہے کیونکہ اس طرزِ حکومت میں دین کا اجارہ دار طبقہ استبدادی اختیارات رکھتا تھا، اور ان کا رئیس پوپ تھا۔ اس دور میں یہ ایک نظام تھا اور عیسائیوں کے نزدیک اس نظام کو چیلانے والوں کو حقوق اور اقتدار حاصل تھا۔ ایسا کوئی طبقہ مسلمانوں میں موجود نہیں کیونکہ مسلمان کو اپنے اور اپنے رب کے درمیان کسی واسطے کی ضرورت نہیں اور ہر مسلمان کے بارے میں یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے دینی معاملات و احکام سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور رکھتا ہے جب اسے دین سے گہرا متعلق ہو جائے تو وہ "عالم دین" کہلاتا ہے لیکن اس سے اسے کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہوتی نہ وہ "طبقہ علماء" کا رکن بن جاتا ہے جس کے خصوصی حقوق و اختیارات ہوں۔

یورپ میں یقیناً کرسی بدترین نظامِ حکومت تھا جس سے زیادہ قابلِ نفرت، ظالمانہ اور آمرانہ نظام تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ مذہبی گروہ یا طبقہ اس بات کا مدعی تھا کہ اُسے اللہ تعالیٰ سے براہِ راست حکومت کا حق ملا ہے اور یہ کسی کو اُن سے باز برس یا ان کے افعال پر پابندی لگانے کا حق حاصل نہیں۔ نہ ان کے احکام سے بالاتر کسی کا حکم چل سکتا ہے۔ یقیناً کرسی ہی وجہ سے یورپ میں دین و ریاست میں جدائی پیدا ہوئی مسلمان اس طرزِ حکومت سے نا آشنا تھے اور اس کی سادہ وجہ یہی ہے کہ ایسا طبقہ اسلام میں تھا ہی نہیں۔ جب ہم اسلامی حکومت کا نام لیتے ہیں تو ہماری مراد ایسے صاف تفرسے

اور پاک نظام سے ہوتی ہے جو اسلامی اصولوں کے سرچشموں سے کسبِ قانون و شریعت کرتا ہے۔ ایسا نظام کوئی بھی فرد یا جماعت، جو علم، اہلیت اور صحیح سامنے کا مالک اور اسلامی اصولوں کی پابندی کرنے والی ہو، چلا سکتی ہے۔

## اسلام میں حکومت کے بنیادی اصول

حکومت ہو یا سیاسی معاشرتی اور اقتصادی نظام، ہر ایک معینہ بنیادوں پر قائم ہے۔ ان بنیادوں میں فکری یا فلسفیانہ قواعد بھی ہیں اور عملی قواعد بھی، جن کے بغیر نظریاتی یا فکری اساس پوری طرح قائم نہیں ہو سکتی۔ اس اصول کو اگر اسلام کے نظام حکومت پر منطبق کیا جائے تو ضروری ہے کہ دونوں قسم کی بنیادوں یعنی نظریاتی اور عملی، پدم بات کی جائے۔

### نظریاتی اساس

اس دنیا کے تمام سیاسی نظام، کائنات، انسان اور زندگی کے بارے میں کوئی نہ کوئی فلسفیانہ واضح نظریہ رکھتے ہیں۔ مختصر طور پر بعض نظاموں کے نظریاتی فلسفے کا ذکر کرتے ہیں، اور پھر اس فلسفے سے مقابلہ کرنے میں جس پر اسلامی سیاسی نظام قائم ہے، کوئی حرج نہیں۔ مثلاً مادیت زندگی کے بارے میں خالص مادی نظریہ رکھتی ہے اور زندگی کے ہر تغیر کی، خواہ وہ فکری تفسیر ہی کیوں نہ ہو مادیت کے نقطہ نظر سے تعبیر کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ معاشرے کو فرد پر ترجیح دیتی ہے۔ اس کے چند موٹے موٹے اصول ہیں:

۱۔ جدلیاتی منطق (جو صرف کائنات، انسان اور معاشرے کو تسلیم کرتی ہے)

اور خدا اور انسانی فطرت کا انکار کرتی ہے۔

۲۔ تاریخ کی مادی تعبیر۔ اس کی رو سے معاشرے کی ہر تبدیلی مادی ہے جس میں افکار اور تربیت کا کوئی حصہ نہیں کیونکہ معاشرتی نظام کی اشکال ہر معاشرے کے وسائل پیداوار میں تبدیلی کا نتیجہ ہیں۔

۳۔ معاشرے میں فرد کی ہستی سے انکار اور انفرادی کوششوں کی نفی۔



۴۔ طبقاتی جنگ (جو معاشرے میں تبدیلیوں کے باعث واقع ہوتی ہے) اور تمام وسائل پیداوار پر انفرادی ملکیت کی نفی۔

۵۔ جب اثنزاکیت عام ہو جائے گی اور تمام بنی نوع انسان اثنزاکا ہو جائے گی، تو دولت اور سرمائے کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مغربی طرز جمہوریت کے بھی کئی بنیادی اصول ہیں۔ ان میں سب سے اہم فرد کی آزادی ہے چونکہ یہ نظام یورپ میں، جاگیردارانہ نظام کو ختم کر کے قائم ہوا تھا، اس لیے ضروری تھا کہ یہ حقوق و فرائض میں مساوات اور معاشرے کے تمام افراد کی آزادی کا دعویٰ تیار تھا۔ ان اصولوں کا اعلان پہلے پہل ”انقلاب فرانس“ کے دوران ہوا۔ اور انہی اصولوں پر عوام کی آزادی (نظریاتی طور پر) کو سیاسی اور اقتصادی عمل میں شامل کر لیا گیا۔ اس سے فرد کو مکمل اقتصادی آزادی اور حرکت و عمل کی آزادی حاصل ہوئی۔ منافع میں شخصی مفاو کی اجازت کے نتیجے میں مغربی جمہوریت پر مابہ دارانہ نظام بن گئی۔ اس وقت ان دونوں نظاموں (اثنزاکیت اور جمہوریت) پر بحث و تجویس کی گنجائش نہیں ہم نے محض ان کے نظریاتی اصولوں کا ذکر کیا ہے تاکہ ان میں اور اسلام کے سیاسی نظام میں مقابلہ کیا جاسکے۔ ان دونوں نظاموں کے بارے میں ہم مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں ایک طرح کا مذہب ہیں۔ ایک آزادی کا مذہب اور دوسرا کسی مذہب، مگر دونوں، اختلاف موقف کے باوجود زندگی کا خالص مادی نظریہ رکھتے ہیں اور اللہ پر ایمان کا پہلے نظام انکار تو نہیں کیا مگر اسے اپنے اصولوں میں شامل بھی نہیں کیا، دوسرے نظام نے اس پر غور کیا مگر اس سے انکار کیا۔ یہیں سے اسلام شروع ہوتا ہے۔

اسلامی نظام ایمان باللہ کی اساس پر قائم ہے اور کائنات، زندگی اور انسان کے بارے میں اس کا نظریہ اسی ایمان سے چھوڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے اور خالق کو اپنی مخلوقات کے جملہ امور میں تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے اور مخلوق کا فرض ہے کہ وہ اپنے خالق کی رضا کے مطابق امتثال امر کرے۔

اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ ارض و سما میں کوئی چیز اس کے علم سے خارج یا اوچھل نہیں کیونکہ انسان کی طرح وہ باقی تمام اشیاء کا خالق بھی ہے اور اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کے بندوں کے لیے اس کے دین و دنیا کے امور میں کوئی سی بات بہتر ہے جب اس نے

بندوں کے لیے ایک نظام تجویز کیا تو لازمی طور پر یہ سب نظاموں سے افضل ہے اور انسانوں کے مفاد کے لیے، فرد ہوں، یا جماعت، سب سے بہتر اور قابل عمل نظام ہے۔ اللہ اپنے مصانع و شرائع میں حکیم بھی ہے جب اس نے انسانوں کی طرف شریعت وحی کی تو وہ یقیناً اس غرض سے تھی کہ انسانی معاملات اس طرح تشکیل و تکمیل پائیں کہ اس سے فلاح و فوز حاصل ہو اور فساد کا خاتمہ ہو۔

اللہ تعالیٰ معبود بھی ہے عبودیت کا تقاضا ہے کہ انسان اللہ سے کامل محبت کے ساتھ عاجزی اختیار کرے، انسان دنیاوی اور طبیعی قانون کے سامنے مجبور ہو کر سر جھکا تا ہے۔ کیا شرعی قوانین جو اللہ نے اپنے رسولوں پر نازل کیے اس کے منہ اور نہیں کہ ہم پورے خضوع و خشوع سے اپنی عبودیت کا اظہار کریں تاکہ دنیا اور آخرت میں ہمیں بھلائی اور برکت نصیب ہو اور ہم ہدایت اور نور پائیں۔

یہ تو ایک رنج ہے دوسرے پہلو سے انسان اللہ تعالیٰ کا اس دنیا میں خلیفہ ہے۔

”هو الذي جعلكم خلائف الارض“ (الانعام : ۱۶۵)

اللہ نے اس کو ارض کی تعمیر کا کام اس کے سپرد کیا۔ ہر خلیفہ یا نائب یا ایجنٹ کا کام ہے کہ وہ اس شخص یا ہستی کی مرضی کے مطابق کام کرے جس نے اسے خلیفہ وغیرہ بنایا، اور اس کے لیے کسی طرح روا نہیں کہ وہ اس کے خلاف کام کرے یا اس کی مرضی پر چلتے سے انکار کر دے۔ اپنے تمام علم و معرفت کے باوجود انسان اشیاء کی طبائع، یا قانون و تشریح کے ان تقاضوں کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے جو تمام احوال و امور میں انسانی مفاد و فلاح کے ضامن ہیں، اور اس کے میلانات، خواہشات اور طرزِ بود و باش یا کسی مخصوص طبقے یا گروہ سے نسبت سے متاثر کرتی کرتی ہے اور اس سے انسانیت کے لیے مکمل اور جامع قانون وضع کرنے کی صلاحیت سلب کر لیتی ہے۔

اسلامی نظریے کے مطابق اسلام ہی وہ آخری اور مکمل دستور العمل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے پسند فرمایا اور اپنے رسول پر نازل کیا اور اس میں وتمام اصول و قواعد جمع کر دیے جن کی انسانیت کو احتیاج تھی اور اس میں آنے والی تبدیلیوں اور تغیرات کے امکان کو مد نظر رکھا جس کے سبب ہر زمانے اور ہر صورت حال میں اور ہر معاشرے کے لیے مفید مطلب ٹھہرا۔

جہاں مارکسیت اور جمہوریت (سرمایہ والیانہ نظام) دونوں کی اساس مادی ہے، اسلام کی اساس روحانی ہے اور ایمان باللہ پر قائم ہے اور اس میں انسان کی مصلحتوں کی رعایت ہے، انسانیت کا احترام اور زمین میں اس کی خلافت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اسلام کی بنیاد پر جس سیاسی نظام کی بھارت کھڑی ہے اس میں ایمان کی نہیں، انسان کی تکریم، آزادی اور حقیقی انسانیت کے خلاف کوئی بات ہے۔

## عملی اساس

اسلامی حکومت کی عملی اساس کے اہم پہلو یہ ہیں :-  
شوریٰ، جو عوام اور حکام کے درمیان تعلق پیدا کرتی ہے۔ اطاعت، جو عوام پر اس وقت تک واجب ہے جب تک حکام سیدھے رہیں اور راہ حق سے انحراف نہ کریں۔ عدل و انصاف، جن سے حکومت کے دونوں فریقوں، یعنی عوام اور حکام میں صحیح تعلق پیدا ہوتا ہے۔

عدل و انصاف کے بارے میں ہم پہلے، اسلام کے مثالوں پر بحث کرتے ہوئے کہہ آئے ہیں۔ اطاعت پر ہم اس وقت مفصل بات کریں گے جب ہم حکام کے حق میں عوام کے فرائض کا مفصل ذکر کریں گے۔ اس وقت ہم شوریٰ پر بات کرتے ہیں:

شوریٰ: شوریٰ کے اصول پر اسلام نے خصوصی توجہ دی ہے اور لازم قرار دیا کہ اس کی غیر موجودگی میں صحیح حکومت قائم ہی نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو مسلمانوں سے مشاورت کا وضع حکم دیا:

”وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ“ فتوکل علی اللہ (آل عمران، ۱۵۹)

اور شوریٰ کو سچے اور نیک مسلمانوں کے لیے لازمی صفت قرار دیا:

”وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِي... يَنْفِقُونَ“ (الشوریٰ: ۳۸)

اس کے بارے میں قرآن کے اہتمام کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ایک سورۃ کا نام ہی ”الشوریٰ“ رکھا۔

اس اصول کی ساخت میں اسلام تمام نظاموں اور مذاہب پر سبقت لے گیا۔ اس دور کے جدید معاشرہ نے یہ اصول بالعموم انقلابِ فرانس سے لیا ہے مگر اسلام اس سے بھی گیارہ صدیاں

پہلے اس اصول کا اعلان کر چکا تھا۔ ہماری ہجرت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے شوریٰ کی پابندی اور اعلان لوگوں کے کسی مطالبے یا ان کے حالات میں تبدیلی یا سیاسی معاشرتی پروٹیکٹڈ سے کی خاطر نہیں کیا تھا، کیونکہ ظہور اسلام کے وقت کے معاشرے شوریٰ کے بارے میں سوچ سکتے تھے نہ اس کا مطالبہ کرنے کے اہل تھے۔ اس دور میں تو معاصر سلطنتوں کے "عوام" اپنے حکام کو خدا یا خدا کا نائب سمجھتے تھے۔ اور ان کے اعمال و افعال کو اننا مقدس گردانتے تھے کہ ان پر نقد و جرح یا ان کے خلاف اظہارِ رائے "کفر" تھا۔ اسی وجہ سے عوام کو یہ حق نہ تھا کہ وہ کوئی رائے دے سکیں یا حکومت میں شریک ہوں، خود حکام بھی اپنی رعایا کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے۔ عام طریقہ یہ تھا کہ اللہ کے رسول آتے تھے، وہ حکومت کرتے تھے اور ان کے بعد ان کے خلفاء انہی کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات تھی نہ ناپسندیدگی کی کیونکہ بالعموم یہی حکومت کا معمول تھا۔ مسلمانوں کو رسول کریم سے اس قدر محبت تھی کہ آپ کے ادنیٰ سے اشارے پر مسلمان اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار رہتے تھے اور آپ جس طرز حکومت کا مشورہ دیتے، مسلمان اُسے بے چون و چرا قبول کر لیتے، لیکن اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کاملہ و خالده اس قسم کے اصول سے رہا کرتی ہے اور وہ جماعتِ مسلمین کا درجہ بلند کرنا چاہتی ہے تاکہ عمومی مسائل اور ضروری مصلحتوں میں مسلمانوں کا نقطہ نظر معلوم ہوتا رہے اور حکومت میں مشارکت ہو اور حکام کی نگرانی ہوتی رہے۔

چونکہ اسلام نے انسان کو بلند مقام عطا کیا ہے اس لیے اسلام کا یہ موقف فطری بات تھی۔ اسلام نے انسان کو زمین میں خدا کا نائب بنایا تاکہ دنیا اور آخرت میں وہ سرفرو ہو اور اس دنیا کو اس طرح آباد کرے کہ سب کی بھلائی ہو۔ اسلام ہی ہے جس نے مساوات، صحیح آزادی اور مطلق العنانی کے اصول لوگوں میں راسخ کیے۔

شوریٰ کے بارے میں قرآن کریم کا حکم محض نظرِ باقی نہیں تھا بلکہ رسول کریم نے سب سے پہلے خود اپنی ذات پر اسے منطبق فرمایا اور آپ کے بعد صلحائے راشدین نے حتیٰ الوسع اسے اپنے اوپر نافذ کیا۔ سیرت پاک کا مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ حضور بڑے بڑے کاموں میں، ماسویٰ ان کے جن پر وحی نازل ہو یا نص قرآن موجود تھی، تمام مسلمانوں سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ مثلاً:

۱۔ غزوہ بدر میں، جب نبی کریم کو خبر ملی کہ قریش اپنے قافلے کی حمایت میں نکل کھڑے ہوئے ہیں اور آپ کو یقین ہو گیا کہ مسلمانوں اور کافروں میں جنگ ہو کر رہے گی، لہذا بقول ابن ہشام، آپ نے اپنے

صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا۔ پہلے حضرت ابوبکرؓ کھڑے ہوئے اور مناسب رائے دی۔ پھر عمرؓ نے خطاب کھڑے ہوئے اور مناسب رائے دی۔ پھر مقداد بن عمروؓ کھڑے ہوئے اور کہا: یا رسول اللہؐ نے آپؐ کو جو ہدایت دی ہے، اس کے مطابق عمل فرمائیے۔ ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔ خدا کی قسم! ہم ہرگز اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح بنی اسرائیل نے موسیٰؑ سے کہا: تم اور تمہارا خدا جاؤ اور جنگ کرو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں، بلکہ (ہم کہیں گے) آپ اور آپ کا خدا جائیں اور جنگ کریں اور ہم آپ کے ساتھ مل کر لڑیں گے۔ اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو مبعوث فرمایا، اگر آپؐ ہمیں برک النہاد (یعنی کا ایک مقام) تک بھی لے چلیں تو ہم اس راہ میں جنگ کرتے جائیں گے حتیٰ کہ وہاں تک پہنچ جائیں۔ رسول اللہؐ نے مقدادؓ کے حق میں دعائے خیر فرمائی، پھر فرمایا: ”مسلمانوں! تم سب اس پر مشورہ دو اور اس سے آپؐ کی مراد انصار تھے کیونکہ جب انہوں نے بیعت العقیقہ کی تھی تو یہ حلف اٹھایا تھا کہ آپؐ کو مدینہ میں ہر جملہ آور سے بچائیں گے۔ مگر اب معرکہ خارج مدینہ ہونے والا تھا، اسی لیے رسول اللہؐ اس خاص سبب سے ان کی رائے جاننے کے خواہشمند تھے۔ اس کے بعد سعد بن معاذؓ انصاری، سردار خزرج، کھڑے ہوئے اور کہا: ”یا رسول اللہ! شاید آپؐ ہماری رائے جاننا چاہتے تھے، آپؐ نے فرمایا: ”ہاں!۔“ سعدؓ نے کہا: ”ہم آپؐ پر ایمان لائے، آپؐ کی تصدیق کی اور گواہی کہ آپؐ جو کچھ لائے ہیں وہ برحق ہے تو آپؐ اپنا ارادہ پورا کیجئے، ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔“ اس طرح انصار کے نمائندوں نے اپنی موافقت اور اطاعت کا اعلان کیا۔ اس وقت رسول اللہؐ نے فرمایا: ”اٹھو اور تمہیں خوشخبری ہو کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں طائفوں (قریش کا لشکر یا ان کا قافلہ) میں سے ایک کا وعدہ نبی سے فرمایا ہے۔ خدا کی قسم، گویا میں اس قوم کی قتل گاہیں دیکھ رہا ہوں۔“ آپؐ نے اندازہ لگایا کہ رسول اللہؐ بدر کی طرف اس وقت تک روانہ نہ ہوئے، جب تک آپؐ کو یقین نہ ہو گیا کہ تمام مسلمانوں کی رائے آپؐ کی رائے سے متفق ہے۔

۲۔ معرکہ بدر شروع ہونے سے پہلے رسول اللہؐ نے مسلمانوں کو وادی بدر میں ایک مقام پر نزل کرنے کا حکم دیا تو حباب بن منذرؓ آگے بڑھے اور کہا: ”یا رسول اللہ! کیا یہ منقام اللہ تعالیٰ نے تجویز فرمایا ہے؟ اس صورت میں ہم کوئی رد و قدح نہ کریں گے، لیکن اگر یہ آپؐ کی اپنی رائے اور جنگ اور حکمت عملی ہے تو اور بات ہے۔“ آپؐ نے فرمایا: ”نہیں، یہ میری اپنی رائے ہے۔“ تو حبابؓ نے کہا: ”یہ منقام مناسب نہیں، آپؐ اٹھیے تاکہ ہم پانی کے ذخیرے پر قبضہ کر لیں۔ اس صورت میں ہم

جنگ کریں گے تو ہم سیراب ہوں گے اور ہمارے دشمن پیاسے رہیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس مشورے کو پسند فرمایا اور کہا: تم نے اچھا مشورہ دیا ہے۔

۳۔ رسول کریم کی اپنے صحابہؓ سے مشورہ کرنے کی ایک اور مثال لیجئے، جو غزوہ اُحد میں پیش آئی آپ ﷺ نے سنا کہ مشرکین بدر میں اپنی ہزیمت اور ذلت کا انتقام لینے کے لیے بھاری جمیعت کے ساتھ اُحد میں اکٹھے ہوئے ہیں۔ آپ نے مسلمانوں کو اکٹھا کیا اور ان سے پوچھا کہ اب کیا کیا جائے؟ انصار اور بعض بڑے بڑے صحابہؓ نے مدینہ ہی میں رہ کر مشرکین کا مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا اور حضورؐ بھی اس پر مائل تھے مگر بعض دیگر اہم مسلمانوں کی رائے میں اُحد پہنچ کر مشرکین کا مقابلہ ضروری تھا ان میں نوجوانوں کی کثرت تھی جو بدر کے بارے میں سن چکے تھے مگر اس میں شریک نہ ہو سکے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ایک معرکہ اور ہو جائے۔ ان میں سے نعمان بن مالک انصاریؓ نے کہا: مجھے جنت سے محروم نہ فرمائیے، قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ میں ضرور جنت میں داخل ہوں گا، آپ نے پوچھا: کیسے؟ نعمان نے کہا: اس وجہ سے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اس کے رسول ہیں اور میں جنگ سے پیٹھ پھرتے والوں میں سے نہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ مسلمانوں کی اکثریت مدینہ سے نکل کر اُحد میں مشرکین سے مقابلہ کرنا چاہتی ہے تو آپ نے اپنی زرہ طلب فرمائی اور اسے زیب تن فرمایا۔ اس وقت وہ لوگ شرمندہ ہوئے جنہوں نے مدینہ میں رک کر لڑنے کا مشورہ دیا تھا اور انہوں نے گمان کیا کہ شاید انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو تکلیف پہنچانی ہے اور انہوں نے معافی مانگی اور رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ آپ کو جو مناسب سمجھتے ہوں اس پر عمل فرمائیے حضورؐ نے مسلمانوں اور ان کے حکام کے لیے مثال قائم کرنے کے لیے، اپنے ارادے سے رجوع کو ترک فرمایا اور اس بات پر قائم رہے جس کا مسلمانوں کی اکثریت نے مشورہ دیا تھا، آپ نے فرمایا: کسی نبی کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ ہتھیار اٹھا کر رکھ دے اور زرہ پہن کر اتار دے جہت تک جنگ نہ کر لے۔

کئی اور مثالیں بھی ہیں مگر یہاں تنگی دہاں کا گلہ ہے، البتہ اتنا عرض کرتا ضروری ہے کہ ہم یہ نہ بھولیں کہ رسول کریم ﷺ مسلمانوں کے سردار ان کے تمام امور میں اسوہ ہیں جس میں کسی تصرف کی گنجائش نہیں آپ نے چاہا کہ مسلمان عوام اور حکام دونوں کو یہ تعلیم دیں کہ ان کی ریاست مشورے ہی پر قائم ہونی چاہیے اور تمام ظروف احوال میں حکام اور عوام کے درمیان مشارکت ضروری ہے۔ اگر ہم خلفائے راشدین کی تاریخ پر غور کریں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ بھی اپنی حکومت کو اسی

اصول پر چلاتے تھے، یعنی جس اصول مشاورت کا قرآن نے حکم دیا اور رسولؐ نے اس پر عمل فرمایا حضرت ابو بکرؓ نے مرتدین کے معاملے میں دوسروں سے مشورہ کیا، پھر حضرت عمرؓ کی خلافت میں بھی یہی اصول جاری رہا، بلکہ حضرت عمرؓ نے تو اپنی شہادت سے پہلے خلیفہ کے انتخاب کو بھی شوریٰ سے طے کرنے کا حکم دیا جس میں عبدالرحمن بن عوفؓ نے اجہتا دیکھا کہ اہم مسلمانوں اور اہل رائے سے مشورہ کرنا چاہیے جس کی بدولت حضرت عثمانؓ کا انتخاب عمل آیا۔ رسول کریمؐ نے اپنے بعد کسی کو خلیفہ نہ بنایا اور اس کا اختیار عامۃ المسلمین کو دے دیا، جس کی وجہ سے مسلمانوں نے بحث و تمحیص کے بعد حضرت ابو بکرؓ کو منتخب کیا، بہت سے لوگوں نے مخالفت بھی کی مگر جب حضرت ابو بکرؓ کا انتخاب قرار دیا گیا تو بیعت کرنے والوں میں ان کے مخالف پیش پیش تھے گویا ان کا انتخاب کامل مشاورت سے انجام پایا شاید اس دور کے عوام کے دل میں تاریخ اسلام کا یہ زمانہ گزرا بھی ہے یا نہیں! خلفائے راشدین میں سے ہر ایک کی اپنی مختصر سی مجلس مشاورت تھی لیکن شورائے عام بھی برقرار تھی حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ سے مشورہ فرماتے تھے۔

حکیم حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، عثمانؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم اجمعین سے مشورہ کرتے تھے۔ مجلس شوریٰ کا اجلاس بالعموم قیر بنیؓ اور منبر رسولؐ کی درمیانی جگہ ہوتا تھا جب حضرت عمرؓ کو دور دراز سے کوئی خبر یا اطلاع ملتی تو وہ اپنے اصحاب کے پاس جاتے، انہیں صورت حال بتاتے اور ان سے مشورہ طلب کرتے۔

شوریٰ کے بارے میں پڑھنے کے بعد اور حیات اسلامی میں اس کی تطبیق سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ نص قرآنی نے شوریٰ کے بارے میں اتنی نرمی اور گنجائش رکھی کہ مسلمانوں کو کسی معین صورت یا مخصوص طریقے کا پابند نہ بنایا کہ لوگ اس کا التزام کرتے اور اس سے عمیر مؤخرانہ نہ کرتے۔ یہ بات اہل حل و عقد اور عوام الناس پر چھوڑ دی گئی کہ وہ جو طریقہ چاہیں اختیار کر لیں، سوائے اس کے کہ شوریٰ حقیقی معنوں میں صحیح صحیح عمل ہونا چاہیے۔ یہ بات اس رشتے پر مبنی ہے کہ اسلام دین انسانیت ہے اور اس کا نظام ہر عصر اور ہر دور کے لیے ہے، اس لیے قدرتی طور پر وہ لوگوں کو تفصیلات اور جزئیات کا پابند نہیں بنا سکتا اور صرف اس کے عام اصولوں کو راسخ اور بنیادوں کو پائیدار بنانا چاہتا تھا جن کے بغیر چارہ نہیں۔ شوریٰ بھی ایسی حقیقت ہے جس سے گریز ممکن نہیں کہ اس سے کوئی یہاں

نظام، اسلامی بننا ہے مگر اس پر عمل کا طریق کار مختلف رہا ہے کہ رسول کریمؐ کبار الصحابہ سے مشورہ فرماتے تھے اور خلفائے راشدینؓ صحابہ اور اسلام میں اسالقول الاولون سے مشورہ کرتے تھے، حالانکہ یہ لوگ خود مسند فضیلت و صدارت پر منکمن تھے اگر وہ شوریٰ پر عمل کرتے تھے تو کسی اور معاشرے کو شوریٰ کے قیام و استقرار سے کیا بات مانع آسکتی ہے؟ اہل حل و عقد، موجودہ دور کے انتخابات کی طرح کوئی سا طریقہ بھی اس کے لیے اختیار کر سکتے ہیں۔

۲۔ مسلمانوں سے تمام مسائل اور امور میں مشورہ کرنا واجب ہے، سوائے دو حالتوں کے: اول یہ کہ جس امر کے بارے میں نص قرآنی وارد ہو چکی ہے اس پر مشورہ نہیں کیا جاسکتا، سوائے اس کے کہ قرآن اور سنت نے جن باتوں کا حکم دیا ہے ان کے نفاذ اور انتظام کے حدود کیے جائیں۔ دوم، شوریٰ کا فیصلہ کسی ایسی بات کے لیے نہیں ہونا چاہیے جو نص قرآنی کی مخالفت کرے یا شریعت کی روح سے بغاوت ہو۔ یہ دونوں شرائط شوریٰ کی حقیقت کو تبدیل نہیں کرتیں کیونکہ وہ نص قرآنی کسی بہتر تبدیلی یا صحیح فکر کے سامنے میں رکاوٹ نہیں، بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام زندگی کے مسائل کو عام مشاورت اور رائے سے حل کرنے کو اہم ترین عنصر گردانتا ہے تاکہ زمانے کے ساتھ ساتھ چلا جاسکے اور ہر تغیر و تبدل کے مطابق ضرورتوں کو پورا کیا جاسکے۔

۳۔ علمائے اسلام اور مفکرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ شوریٰ، حاکم کے لازمی ہے یا اختیاری؟ یعنی کیا امام یا رئیس مملکت کے لیے مشورہ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اور اگر وہ مشورہ کرتا ہے تو مسلمانوں کی رائے سے جو طے پایا ہو، اس پر عمل کرنا اس پر واجب ہے یا نہیں؟ یا اسے پھر بھی اختیار ہے کہ وہ ان کی رائے کو قبول کرے یا حسب سابق اپنی رائے پر ہی عمل کرے؟ بعض علماء کی رائے میں، شوریٰ اختیاری ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کے فرمان سے دلیل لاتے ہیں کہ قرآن نے شوریٰ کا حکم دینے کے بعد کہا:

”فَاذْعُزْمَتِ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ“

وہ کہتے ہیں کہ عزم کا مطلب یہ ہے کہ حاکم چاہے تو اپنی رائے پر عمل کرے اور چاہے تو مسلمانوں کی رائے اختیار کرے، جیسا کہ بعض تاریخی حوالوں سے ثابت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے جب مرتدین سے جنگ کرنے کے بارے میں مسلمانوں سے مشورہ کیا تو غالب رائے یہ تھی (جہاں میں عمرؓ بھی شامل تھے) کہ ان سے نماز کی ادائیگی قبول کی جائے اور دکوۃ کا مطالبہ مؤخر کر دیا جائے۔ مگر ابو بکرؓ نے نماز



کو، زکوٰۃ کی ادائیگی کے بغیر قبول کرنے سے انکار کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ دونوں الگ الگ نہیں کی جاسکتیں کیونکہ ایک حقوق اللہ میں سے ہے اور دوسری حقوق العباد میں سے۔ انہوں نے زور دے کر کہا: "خدا کی قسم! اگر وہ لوگ دسی کا ایک ٹکڑا دینے بھی انکار کریں گے جو رسول اللہ ص کو ادا کرتے تھے تو میں ان سے جنگ کروں گا" ابو بکر رضی نے مرتدین سے جنگ کے بارے میں اپنی رائے پر اصرار کیا۔ یہ علماء اس سے یہ ثبوت لائے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی نے مسلمانوں کی اکثریت کی رائے میں اپنی رائے پر عمل کیا، جس سے واضح ہو گیا کہ شوریٰ اختیاری ہے۔ طبری اور قرطبی نے اپنی تفسیروں پر اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

اس کے برعکس، بعض دوسرے علماء میر رائے رکھتے ہیں کہ حاکم کے لیے اکثریت کی رائے پر عمل لازم ہے۔ جب مسلمانوں کی یا اہل حل و عقد کی رائے کسی معاملے میں طے پا جائے تو حاکم کے لیے کسی اختلاف کی مجال نہیں رہتی۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ شوریٰ سے طے پانے والے معاملے پر اگر حاکم عمل نہیں کرتا تو شوریٰ بے وقعت اور بے کار ہے اس بات پر وہ تاریخ اور سیرت سے حوالے پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بے شمار موقعوں پر رسول اللہ ص نے مسلمانوں سے مشورہ کیا اور ان کی پر عمل کیا جن میں اہم ترین جنگ احد میں مسلمانوں کی اکثریت کی رائے کے مطابق پانی کے قریب نزول کا ہے۔ فریق اول حروب ر وہ میں ابو بکر رضی کے مسلمانوں سے مشورہ طلب کرنے اور پھر اس کے خلاف عمل کرنے پر جو دلیل لاتا ہے، فریق ثانی اس کی توجیہ یوں کرتا ہے کہ ابو بکر رضی نے مسلمانوں سے مسلسل رائے طلب کرتے رہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل ابو بکر رضی کی رائے کی طرف مائل کر دیئے جن میں عمر رضی بھی شامل تھے اور بالآخر تمام کبار صحابہ رضی ابو بکر رضی کی رائے سے متفق ہو گئے اور اس طرح ابو بکر رضی نے مسلمانوں کے مشورے سے اختلاف نہ کیا۔

۴۔ اسلام میں شوریٰ کی دو قسمیں ہیں :

۱۔ حاکم کے انتخاب میں شوریٰ۔

۲۔ حکومت کا انتظام چلانے اور حکام کی نگرانی کے لیے شوریٰ۔

معنی اول میں شوریٰ کا قیام اس طرح عمل میں آتا ہے کہ مسلمانوں یا اہل حل و عقد یا مجلس شوریٰ کی طرف سے حاکم اعلیٰ کا انتخاب ہو۔ ان کا کام ہے کہ وہ اس بہترین انسان کا انتخاب کریں، جو مفروضہ شرائط پر پورا اترتا ہو۔

معنی ثانی میں شوری، امت کے نمائندوں کے ذریعے، جو اہل حل و عقد میں سے ہوں، حاکم کو صحیح مشورہ دینے، اس کی خیر خواہی اور حکومت کے کاروبار میں نگرانی کرنے کا نام ہے، تاکہ حکومت اپنے مقاصد اور غایات سے منحرف نہ ہو۔

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اسلام نے شوری کی کوئی خاص شکل مقرر نہیں کی، مگر اتنا ضرور ہے کہ اس میں وہ افراد حصہ لیں جو اس کے اہل ہوں، اس لحاظ سے مجلس شوری کے ارکان اہل دین و فقہ ہونے چاہئیں یا وہ لوگ جو شریعت میں قانون میں خصوصی نظر اور مہارت رکھتے ہوں تاکہ ان امور میں صحیح صحیح رائے دے سکیں جن کے بارے میں نص قرآنی موجود نہیں۔ مجلس شوری کے ارکان کا اہم فرض یہ ہے کہ وہ امور حکومت کی نگرانی کریں۔

اس مجلس کے انتخاب و بہیت کے طریقے متعدد ہیں:

(ا) بعض لوگوں کے نزدیک اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ حاکم بذاتِ خود، عوام کی رائے اور توثیق سے اس کے ارکان کا تقرر کرے۔

(ب) کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس مجلس میں پیشوں کے اعتبار سے نمائندگی دینی چاہیے، یعنی مختلف کاروبار کرنے والے افراد کو رکن بنانا چاہیے اور ان میں سے ایسے اشخاص کو منتخب کرنا چاہیے جو مشورہ دینے کے اہل ہوں اور صاحبِ رائے بھی ہوں۔

(ج) کچھ اور لوگوں کی رائے میں تمام ارکان کا عام انتخاب ہونا چاہیے اور یہ طریقہ دوسرے دونوں طریقوں کے مقابلے میں زیادہ مستعمل ہے۔

بہر حال، اسلام کسی خاص طریقے کا پابند نہیں کرتا کہ ہر فرد کو "اسلامی" کہا جاسکے۔ ہم عام انتخابات ہی کو مجلس شوری کے قیام کا موزوں طریقہ سمجھ سکتے ہیں۔ البتہ انتخابات کے سلسلے میں ہوتا یہ ہے کہ انسان خود اپنی نامزدگی کرتا ہے اور انتخاب کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے مگر یہ طریقہ رسول اللہ کے فرمان سے متعارض ہے کہ "ان لوگوں کو عہدے دینا صحیح نہیں جو انہیں طلب کریں یا اس پر اصرار کریں"۔ بالعموم قانون ساز اداروں کے انتخابات غیر پسندیدہ طریقوں سے عمل میں آتے ہیں اور اس دور کے معائشوں میں لوگ خود ہی اپنے آپ کو انتخاب کے لیے پیش کرتے ہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ نامزدگی ان افراد کی جائے جو اس مجلس کی رکنیت کی شرائط پر پورے اترتے ہوں۔

۵۔ شوری اسلامی نظام کا امتیازی وصف ہے جو رسالہ اور خیال انگیز ہے۔ جدید یا معاصر نظاموں

سے تقابل سے اس کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ جمہوریت (ڈیموکریسی) بھی شوریٰ اور تعاون پر مبنی ہے، مگر عملاً اس میں محکوم، حاکموں پر مسلط ہو جاتے ہیں اور آمریت (ڈکٹیٹر شپ) کی اساس حاکموں اور محکوموں میں سمع و اطاعت اور اعتماد پر ہے مگر انجام پر یہ ہوتا ہے کہ اعتماد مٹ جاتا ہے اور حاکم مسلط ہو جاتے ہیں۔

ان کے برعکس اسلامی نظام، مشاورت کے مرحلے میں، شوریٰ اور تعاون پر مبنی ہوتا ہے اور نفاذ کے مرحلے میں سمع و اطاعت اور اعتماد پر قائم ہوتا ہے اور اس کے اصولوں پر اگر خلوص دل سے عمل کیا جائے تو کوئی فریق (حاکم و محکوم) ایک دوسرے پر مسلط نہیں ہوتا۔

## زُئیس مملکت کی شرائط

ہم نے اب تک ان اصولوں کا ذکر کیا ہے جن کی بدولت اسلامی مملکت قائم ہوتی ہے۔ اب ہم ان قواعد کو بیان کرتے ہیں جو اسلامی مملکت اپنے قیام کے بعد داخلی طور پر مضبوط کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زُئیس مملکت کا عندہ ایسی مملکت میں سب سے اہم بنیادی ہے۔

اسلامی مملکت کے زُئیس کے عہدے پر اسلامی تاریخ، علم معاشرت اور علم کلام کی کتابوں میں وسیع بحث کی گئی ہے۔ اس موضوع پر بالعموم "امامت" کے عنوان کے تحت بحث ہوئی ہے کیونکہ بیشتر مؤلفین اسلامی مملکت کے زُئیس کو "امام" یا "خلیفہ" لکھتے ہیں، ان کتابوں میں امام کی صفات، تقرری اور معزول کا طریقہ، حکومت کرنے کے وسائل اور حکومت کے بنیادی اصول و ضابطے کیے گئے ہیں۔ ہم ان میں سے حاکم اعلیٰ کی صفات اور شرائط پر مفکرین اسلام کے اہم مباحث کو بیان کریں گے اور واضح کریں گے کہ ان صفات کی اہمیت کیا ہے اور طویل تاریخی دور گزرنے سے ان میں کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں۔

الماوردی نے اپنی کتاب "الاحکام السلطانیہ" میں سات اہم صفات بیان کی ہیں۔

۱۔ عدالت، جملہ شرائط کے ساتھ۔

۲۔ علم، جو حادثات و احکام دونوں میں اجتہاد کے قابل بنائے۔

۳۔ سماعت، بصارت اور گفتگو وغیرہ کے لیے حواس کی سلامتی۔

۴۔ اعضاء کی سلامتی کہ حرکت اور اٹھتے بیٹھنے سے مانع نہ ہو۔

۵۔ رعیت کی سیاست اور مصالح کے انتظام میں پختہ رائے۔

۶۔ شجاعت اور چوکنا پن تاکہ ملت کا دفاع اور دشمن سے جنگ کر سکے۔

۷۔ صحیح النسب ہونا یعنی خلیفہ قریش میں ہونا چاہیے۔

امام ابن حزم نے اپنی کتاب ”الفصل فی الملل والادوار والنحل“ میں حاکم کے لیے چار شرطیں

بیان کی ہیں:

۱۔ بالغ ہو، جیسا کہ رسول اللہ نے فرمایا: ”تین قسم کے لوگ مرفوع و تعلم ہیں: سونے والا، حیب

بک بیدار نہ ہو جائے۔ بچہ، حیب بک بالغ نہ ہو جائے، دیوانہ، حیب تک صحت یات نہ ہو جائے۔

۲۔ مرد ہو، جیسا کہ رسول اللہ نے فرمایا:

”وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاتی جس نے اپنے امور کسی عورت کے سپرد کر دیئے ہوں۔“

۳۔ فرائض دین کا علم، اور

۴۔ تقویٰ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”اور نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو اور گناہ اور حد سے تجاوز کرنے میں تعاون نہ کرو۔“

ابن خلدون نے ”مقدمہ“ میں پانچ شرطیں گنوانی ہیں:

۱۔ علم۔

۲۔ عدالت

۳۔ کفایت (اہلیت و قابلیت)

۴۔ حواس و اعضاء کی سلامتی

۵۔ صحیح النسب ہونا (ابن خلدون نے کہا ہے کہ اس شرط پر اختلاف ہے۔

مفکرین اسلام کا مقصد ان شرائط کے بیان کرنے سے یہ تھا کہ رئیس مملکت کے عہدے کے

لیے ایسا مرد صالح ڈھونڈا جائے جو امت کے امور کو مہمرا انجام دے سکے، ان کی ضرورتوں کا خیال رکھے

اور ان کے مفادات کی تکرانی کرے۔ اسی لیے انہوں نے اسلامی مملکت کے رئیس اول کے لیے

عقل، قوت فکر، سلامت رائے، حکمت تدبیر، صحت اعضاء جسمانی اور ایسے نقائص بدنی سے

ہوتے کی شرائط مقرر کیں جو اس کے فرائض کی انجام دہی میں حارج ہوں۔ اسی طرح اس کے لیے لازم ہے کہ اُسے اسلام کے اصولوں کے مطابق حکومت چلاتے کا طریقہ آتا ہو، اور وہ مملکت کی بااست سے آگاہ ہو۔ اس کے علاوہ وہ ایسا شخص ہونا چاہیے جس کا ایمان مضبوط اور عقیدہ درست ہو، آزاد ہو، منصف مزاج ہو، اسلام کے مفادات کو ملحوظ رکھے، اس کے شعائر کی تنظیم کرے اور میں صرف زرخاندہ کرے نہ خلقت پر طعنہ زن ہو۔ اس کے ساتھ وہ وہ شرعیات کا عالم، اس کے حکام و مقاصد سے آگاہ، مخلص اور امانت دار ہونا چاہیے۔ اس میں اتنی دانائی، شجاعت اور بہت ہو کہ اللہ کے حرمت، لوگوں کے حقوق اور مملکت کی حدود اور افتدار کے خلاف عناصر کو کچل سکے۔ اس تمام بحث کو سمیٹتے ہوئے، ہم ان شرائط اور اوصاف کو دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

- ۱۔ وہ شرائط جن کی عدم موجودگی میں کوئی شخص امام بن ہی نہیں سکتا۔
  - ۲۔ وہ شرائط جو مختلف راستے ہوں۔
- وہ بنیادی شرائط، جو کسی مسلمان حاکم کے لیے ضروری ہیں اور جن پر اکثریت کا اتفاق ہے یہ ہیں:

- ۱۔ مرد ہونا
  - ۲۔ بالغ ہونا
  - ۳۔ صاحب عقل ہونا
  - ۴۔ دین و دنیا کے اُن امور کا علم جو حکومت کے لیے ضروری ہیں۔
  - ۵۔ حواس اور اعضا کی سلامتی جو علم و عمل پر اثر انداز ہوتی ہیں۔
  - ۶۔ عدالت، یعنی صحیح العقیدہ ہونا، فرائض اسلامی کی ادائیگی اور شعائر اسلام کی تعظیم۔
  - ۷۔ آزاد ہونا (غلام نہ ہو)۔
  - ۸۔ عمل کی اہلیت (کفایت)۔
- اختلافی شرائط یہ ہیں:

- ۱۔ نسب، یعنی کسی خاص نسب، قبیلے یا برادری سے نسبت ہوتا۔ بالعموم اس سے مراد ہے، قریشی ہونا، ان کی کسی خاص شاخ (ہاشمی یا عباسی وغیرہ) سے متعلق ہونا۔
- مسلمانوں کی اکثریت کی رائے میں خلیفہ کا قریشی ہونا ضروری ہے، کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ

”الائمة من قریش“ (یعنی امام قریش میں سے ہونے چاہئیں) اور آپ نے یہ بھی فرمایا:  
 ”قدموا قریش ولا تقدموها“ (قریش کو سبقت لیتے دو اور ان پر سبقت نہ کرو)  
 بعض مسلمان مفکروں نے اس شرط پر زور نہیں دیا، جس کا ہم بعد میں ذکر کریں گے۔

بعض مسلمان (مثلاً شیعہ) شرط عائد کرتے ہیں کہ خلیفہ ہاشمی النسب ہونا چاہیے۔ ان میں سے  
 اس کو فاطمہ کی اولاد میں محدود رکھتے ہیں، اور کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ خلیفہ آل عباس بن عبدالمطلب  
 میں سے ہونا چاہیے۔

۲۔ تمام مسائل دین، اس کے اصول اور فروع کا علم، مسلمانوں کی اکثریت یہ شرط عائد نہیں  
 کرتی اور صرف اس پر اکتفا کرتی ہے کہ حاکم کو اتنا علم ہونا چاہیے، جو اس کے امور میں آسانی پیدا  
 کرے۔

۳۔ تمام گناہوں اور برائیوں سے پاک ہونا (عصمت) شیعہ میں سے امامیہ اس شرط پر اصرار  
 کرتے ہیں، باقی تمام مسلمان اس سے متفق نہیں کیونکہ ان کے خیال میں ”معصوم“ صرف خدا کی  
 ذات ہے اور کسی بھی انسان کے لیے خطا یا لغزش سے معصوم ہونا ممکن نہیں۔

حسب نسب کی شرائط تاریخ اسلام میں اہمیت رکھتی ہے۔ شقیفہ بن ساعدہ ہی میں اس  
 شرط پر اختلاف رونما ہو گیا تھا جب انصار کے مطالبہ کیا کہ خلیفہ ان میں سے ہونا چاہیے تو  
 ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس بات کو قول رسول سے مسترد کر دیا تھا (کہ آئمہ قریش میں سے ہونے چاہئیں) انصار  
 اور جملہ مسلمان اس حدیث پر خاموش ہو گئے۔ اور انہوں نے ابوبکر کو خلیفہ مقرر کر دیا جو قریشی تھے  
 پھر ان کے بعد عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ خلیفہ ہوئے جو سب قریشی تھے۔ ان کے بعد خلافت یا سرداری  
 قریش ہی میں رہی خواہ وہ اموی تھے یا عباسی تھے یا فاطمی غیر قریش میں سے کسی نے رئیس اول  
 کے منصب کے مطالبے کی جرات نہ کی۔ یہاں تک کہ خلافت عثمانیوں میں منتقل ہو گئی جو ترک تھے

بہر حال مسلمانوں میں صدیوں تک یہ اجماع رہا کہ حاکم قریش ہی میں سے ہونا چاہیے کیونکہ اس باب  
 میں احادیث رسول صحیح ہیں جن میں کوئی شک نہیں، اور ان کے مقابلے میں دوسری احادیث  
 (مثلاً ”بد اگر تم پر کوئی حدیث بھی، جس کا سر کشمیش کی طرح ہو، حاکم ہو تو اس کی بات سنو اور اطاعت  
 کرو“) ضعیف ہیں اور رئیس اول کے منصب سے ان کا تعلق نہیں بلکہ خاص حدیث پر حضور نے  
 ارشاد فرمایا اور ولی الامر کی اطاعت کی مسلمانوں کو ترجیح دی۔ اب جبکہ حدیث رسول اور مسلمانوں

اجماع اس بات پر وارد ہے کہ ریاست اولیٰ قریش کے لیے ہے تو ان دو مصادر سے انکار اور ان سے عرف کیسے ممکن ہے اور کسی قریشی کے بغیر حکومت قائم کرنا کہاں تک جائز ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کام شریعہ کے کچھ بڑے کچھ بقا ضروری ہیں اور حکومت انہیں پر مشتمل ہے اور انہی کی وجہ سے قائم ہوتی ہے۔

قریش النسب ہونے کی شرط کا کیا مقصد ہے؟ اس بات پر بحث کو بڑھایا جائے تو اس کی بڑی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ حکومت کی حمایت کے لیے عبیت ضروری ہے جو اس کی بنیادوں کو مضبوط کرے۔ تاریخی طور پر عرب قریش ہی کو ولایت اور حکومت کا اہل سمجھتے تھے، اسی پر ان کا اجتماع تھا اور انہی کی سرداری کو مانتے تھے اور قریش کے سوا کسی کی سنتے بھی نہ تھے۔ اگر رسول کریم کسی غیر قریشی کے ہاتھ میں زمام حکومت سے دینے تو عربوں میں شائبہ پیدا ہو جاتا اور حکومت پائیدار نہ ہوتی۔ قریش لوگوں سے حسبِ خواہش کام لینے پر قادر تھے اور کسی فرد یا گروہ کی مخالفت رائے سے ڈرتے نہ تھے۔ اس کا اعلیٰ اعلان اظہار "حروبِ رذہ" میں ہوا۔ یہ بیشتر عرب قبائل مرتد ہو گئے تھے۔ اور قریش ہی نے اس فتنے کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ملکت کو قوی بنایا۔

اسی باعث قریشی النسب ہونے کی شرط عامہ کی گئی تھی۔ جب قریش کی عبیت اور جمعیت نکل ہو گئی تو ان کی قوت بھی جاتی رہی اور قریشی النسب ہونے کی شرط کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ اس میں کوئی حرج نہیں کہ مسلمان ایسے حاکم کو تسلیم کر لیں جو ان کو ایک مرکز پر جمع کرے اور ان میں اتحاد پیدا کرے خواہ وہ قریشی ہو یا نہ ہو۔ تاریخ اسلام کے آخری دور کے مفکرین اسی رائے پر متفق تھے۔ ان خلدون اس سلسلے میں پہلا شخص شمار ہوتا ہے جس نے اس رائے پر زور دیا اور اسی کی تائید کی۔

## رئیس مملکت کی تقرری کا طریقہ

ہم نے دیکھا کہ اسلام مسلمانوں پر فرض قرار دیتا ہے کہ وہ ریاست کو اسلام کے مبادی پر قائم کریں۔ اس بارے میں جو شہید پیدا ہوتا ہے، ہم نے وہ بھی پیش کیا اور اس کا جواب بھی قرآن کریم میں رسول کریم کی سنت و سیرت ہمارے قول کی تائید کرتی ہے۔ ہم نے واضح کیا تھا کہ مدینہ منورہ میں رسول اللہ کی حکومت میں آئینی اور بین الاقوامی قانون کے ماہرین کی تعریف کے مطابق، ولایت کے تمام عناصر موجود تھے۔ اس کے بعد ہم نے اس نظر یاتی اور عملی ریاست کی اساس کے جملہ پہلوؤں

کا تذکرہ کیا۔ اب ہم اس ریاست کی شکل و صورت اور اسے تشکیل دیتے والے بنیادی عناصر کی تفصیل بیان کرتے ہیں چونکہ رئیس اعلیٰ کا موضوع ان سب سے اہم ہے، اسی لیے ہم نے اس کی صفات و شرائط بیان کر دئی تھیں۔ اب اس کی تقرری کا طریقہ بیان کیا جاتا ہے۔

اسلامی حکومت کے سربراہ کے انتخاب کے طریقے کا دو حصوں میں مطالبہ کیا جا سکتا ہے :

(ا) اس بارے میں تاریخی شواہد اور مثالیں، جو تاریخ اسلام میں بیان ہوئی ہیں۔

(ب) بعض اسلامی مفکرین کی آراء، اس میں ان امور پر غور کرنا ضروری ہے کہ قرآن اور سنت میں کیا حکم آیا ہے؟ کیا خلیفہ سابق نامزد کرتا ہے؟ یا انتخاب ہوتا ہے؟ یا خلیفہ سابق ولی عہد مقرر کرتا ہے یا یہ عہدہ موروثی ہے؟ اگر خلیفہ کا تقرر صرف انتخاب سے ہے تو انتخاب کا حق کس کو ہے؟ کیا ساری مسلم قوم کو؟ یا صرف اہل حل و عقد کو؟ یا ان میں سے بھی چند ایک کو یا کسی فرد واحد کو؟

## ۱۔ تاریخی شواہد

تاریخی شواہد یا واقعات کے لحاظ سے ہم صرف خلقائے راشدین کے تقرر کے طریقے کو مدنظر رکھیں گے کیونکہ ہم انہیں اپنے دین و دنیا کے بیشتر امور میں رسول کریمؐ کا صحیح پیروکار گردانتے ہیں اس کے بعد اس طریقہ کا ذکر ہونا چاہیے جس کے ذریعے اموی اور عباسی خلفاء وغیرہ برسر اقتدار آئے، جہاں تک خلقائے راشدین کے طریقہ انتخاب کا تعلق ہے تو چاروں خلفاء کا انتخاب ایک دوسرے سے الگ طریقے سے ہوا اور اسی طرح ان کے بعد کے خلفاء کا انتخاب خلقائے راشدین کے انتخاب سے مختلف تھا۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ رسول اللہؐ نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت مسلمانوں کے لیے کسی خلیفہ کا تقرر نہیں فرمایا تھا، حالانکہ آپؐ کو قریب مرگ کا احساس تھا اور جب یہ آیت نازل ہوئی کہ:

”الیوم اکملت لکم دینکم واتممت نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً“

تو بہت سے مسلمانوں کو بھی حضورؐ کے وداع کا احساس ہو گیا تھا اور پھر آپؐ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں فرمایا: ”شاید اس برس کے بعد میں تم سے رمل سکوں“ جب رسول اللہؐ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو آپؐ کو یقین ہو گیا کہ اب آپؐ رفیق اعلیٰ سے ملنے والے ہیں تو بھی آپؐ نے



مسلمانوں پر کوئی سردار مقرر نہ فرمایا۔ آپ نے ابوبکرؓ کو ولی عہد مقرر کرنے کے بارے میں سوچا اور آپ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

”میں نے چاہا یا ارادہ کیا، کہ ابوبکرؓ اور ان کے بیٹے کو بلوا بھیجوں اور اپنے بعد نائب بنا جاؤں اور دیکھوں کہ کتنے ولے کیا کہتے ہیں اور چاہتے ہیں واسطے کیا چاہتے ہیں۔ پھر میں نے کہا ہو سکتا ہے اللہ سے نہ چاہے اور مسلمان بھی اسے نہ ذکر دیں: یا اللہ ذکر دے اور مسلمان بھی انکار کر دیں۔“

حضرت عائشہؓ نے فرمایا: رسول اللہؐ نے مجھ سے کہا:

”عبدالرحمن بن ابوبکرؓ کو میرے پاس لاؤ کہ میں ابوبکرؓ کے لیے تحریر لکھ دوں کہ میرے بعد کوئی اختلاف نہ کرے۔“

پھر آپ نے حضرت عائشہؓ سے کہا: ”رہنے دو! خدا نہ کرے کہ مسلمان ابوبکرؓ کے بارے میں اختلاف کریں۔“ بہر حال اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے نہ ابوبکرؓ کو خلیفہ مقرر کیا نہ ان کے سوا کسی اور کو۔ اب سوال یہ ہے کہ حضورؐ کے اس موقف کا سبب کیا تھا؟

بعض لوگوں نے یہ حجت دی ہے کہ حضورؐ کا مرض اتنا شدید تھا کہ آپ کو خلیفہ کے تقرر پر توجہ کرنے کا ہوش ہی نہ تھا، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ حضورؐ کی بیماری ابتدائی ایام میں شدید نہ تھی۔ اور بعد میں بھی یہ علالت آپ کو مملکت کے اہم امور انجام دینے سے مانع نہ ہوئی۔ مثلاً آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنی جگہ نماز میں مسلمانوں کی امامت کرنے کا حکم دیا اور آپ نے اپنے بعد خلیفہ مقرر کرنے پر بھی توجہ فرمایا تھا۔

بعض مستشرقین نے دعویٰ کیا ہے کہ رسول کریمؐ اس بات سے آشنا تھے کہ قبائلی نظام میں وارث مقرر کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ اسی لیے آپ نے خلیفہ کے تقرر کو مسترد کر دیا۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہؐ کی کوئی اولاد تیرینہ نہ تھی کہ آپ کے بعد حکومت سنبھالتی اور حکومت وراثتاً منتقل ہو جاتی۔ اگر آپ کسی کو منتخب فرماتے تو صحابہؓ ہی میں سے کرتے۔ آپ نے واضح طور پر تو اپنا مقرر نہ فرمایا مگر اشارہ فرمایا کہ ”اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو درست کو بنانا تو وہ ابوبکرؓ ہی ہوتا۔“ اور آپ نے یہ بھی فرمایا: ”میری امت میں لوگوں پر سب سے زیادہ رحم کرنے والا ابوبکرؓ ہے۔“ البتہ آپ نے اس اشارے کو وضاحت کا جامہ نہ پہنایا۔

ہمارے نزدیک قولِ راجح یہ ہے کہ حضورؐ اس بات سے گھبراتے تھے کہ اگر آپؐ کسی کو اپنا خلیفہ مقرر فرمادیں تو مسلمان یہ گمان کریں گے کہ اس کا تقرر امرِ خداوندی ہے اور اس کی خلافت اللہ کی طرف سے ہے۔ اس کے بعد کسی مسلمان کے لیے اس حکم سے سہرتابی کی مجال نہ رہتی۔ اس کے اعمال پر نکتہ چینی کی جاسکتی۔ اس طرح حکومتِ امریت میں تبدیل ہو جاتی یا بعض لوگ اس خلیفہ کو مرتبہ نبوت و غیرہ کا حامل قرار دیتے یا نبی کی جگہ سمجھتے۔ اسی لیے حضورؐ نے مسلمانوں کو اپنے امورِ سرانجام دینے میں آزاد چھوڑ دیا تاہم آپؐ جانتے تھے کہ ابوبکرؓ سب سے زیادہ خلافت کے متفرق ہیں اور مسلمان بھی اس بات کو جانتے تھے کیونکہ ابوبکرؓ حضورؐ کے رفیقِ غار تھے اور انہوں نے آپؐ کی تصدیق اس وقت کی جب دوسروں نے تکذیب کی اور آپؐ نے صرف انہیں کو اپنی امت میں سے ”دوست“ بنانا چاہا۔

## حضرت ابوبکرؓ کا طریقہ انتخاب

رسول اللہؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں نے جو اولین کام کیا وہ آپؐ کے خلیفہ کا انتخاب تھا حتیٰ کہ انہوں نے اس کام کو حضورؐ کی تجہیز و تکفین پر بھی فوقیت دی۔ اس کام کو کسی سخت نقصان کے بغیر مؤخر بھی کیا جاسکتا تھا مگر اس صورت میں ایک نوزائیدہ مملکت کسی ذمہ دار فرد یا حکم کے بغیر رہ جاتی اور ایہ بات نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی کیونکہ جزیرہ عرب کے بیشتر قبائل اس نئے زمین سے عہد و پیمان توڑنے کی فکر میں تھے، اور روم اور فارس، جو اس نئی اسلامی ریاست سے خونزودہ تھے، اسے ختم کرنے کے لیے اپنے عساکر جمع کر رہے تھے۔

تمام مسلمانوں نے یکجان ہو کر خلیفہ رسولؐ کے انتخاب کے بارے میں سوچا۔ ان میں انصار بھی شامل تھے جنہوں نے دل و جان سے اسلام قبول کیا تھا اور اڑھے وقت میں اس کی مدد کی اور مسلمانوں کو پناہ دی تھی، اور بنو ہاشم اور عامر بن عبدمنہم اور عامر بن عبدمنہم بھی شامل تھے۔

جب حضرت عمرؓ کو علم ہوا کہ انصار سفیقہ بن ساعدہ میں جمع ہو رہے ہیں تو وہ فوراً حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے، جو رسول اللہؐ کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے، اور انہیں اس بات کی اطلاع دی۔ دونوں انصار کے اس اجتماع میں پہنچے۔ راستے میں انہیں ابوبعلیہ بن الجراح مل گئے تو انہیں بھی ساتھ لے لیا۔

بعض مستشرقین، جو تاریخ اسلامی میں عیاری اور مدائیت کے شوگر ہیں، ان تینوں اصحابِ رسولؐ کے اجتماع کو بھی "سارش" قرار دیتے ہیں کہ وہ تینوں یکے بعد دیگرے خلافت یا حکومت کے خواہشمند تھے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ غزوہ اُحد کے بعد ہی سے، جب رسول کریمؐ کے قتل کی افواہ پھیل گئی تھی اس موضوع پر سوچ بچار کر رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ سب مستشرقین کی خرافات اور ان کے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کینے کا نتیجہ ہے۔ ہم تو اسے اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ اس پر غور کریں۔ مستشرقین کو سازشوں اور عیب چینیوں کے عادی ہیں اور نہیں جانتے کہ صحابہ رسولؐ کو رسول اللہؐ سے کیا ربط اور کیا عشق تھا۔ یہ وہی عمر تھے جنہوں نے رسول کریمؐ کی وفات سن کر دھمکی دی تھی کہ جو ان کی موت کا ذکر کرے گا وہ اُسے قتل کر دیں گے!

بہر حال، انصارِ سنیہ میں جمع ہوئے اور پھر کچھ ہاجرین بھی آگئے جن میں سرفہرست ابو بکرؓ، عمرؓ اور ابو عبیدہؓ تھے۔ یہ اجتماع تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور بڑے بڑے سیاسی اجتماعات میں اس کا شمار ہوتا ہے، یہ نہ صرف اسلامی تاریخ کا، بلکہ انسانی سیاسی فکر کا زندہ و جاوید وثیقہ ہے۔

مسلمانوں، یا ان کے اہل حل و عقد نے دل کھول کر اس اجتماع میں اپنی اپنی آراء کا اظہار کیا اور ایک دوسرے پر پوری آزادی سے جرح و تنقید کی، انہیں اس بات کا قطعاً خوف نہ تھا کہ دوسرا فریق ان کے اظہارِ خیال سے ناراض ہوگا کیونکہ سب کا مقصد ایک تھا یعنی مسلمانوں کی فلاح اور ان کی بھلائی کی کوشش۔ ہاجرین کے نمائندے اپنی مدلل رائے دیتے اور انصار کی رائے کا جواب بھی۔ اسی طرح انصار اپنی رائے پیش کرتے اور بحث کرتے، اس کے نتیجے میں سب نے حضرت ابو بکرؓ کو متفقہ طور پر منتخب کر لیا اور جو لوگ مخالفت کر رہے تھے انہوں نے بھی بیعت میں پس و پیش نہ کی۔

اس تاریخی جلسے کی اہمیت کے پیش نظر ہم طبری کی مختصر تاریخ سے اقتباس پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ مسلمانوں کے بارے میں کتبِ تاریخ میں بے حد غلط بیانی اور دسبہ کاری ہوتی ہے۔

اس عظیم مؤرخ نے مکمل اسناد کے ساتھ ایک طویل حدیث میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھا ہے:

”جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور کہنے لگے محمد کے بعد ہم سعید بن عبادہؓ کو ولی الامر مقرر کرتے ہیں۔ سب نے انہیں بلو ا بھیجا حالانکہ وہ بیمار تھے اور ان سے اپنے خیال و ارادے پر نمائے طلب کی۔ اور ہاجرین کا بھی نقطہ نظر بھی بیان کیا۔ اسی اثنا میں حضرت عمرؓ کو تخیر مل گئی وہ تیزی سے حضورؐ کے دولت خانے پر گئے اور حضرت ابو بکرؓ کو جو اندر تھے، بلو ا بھیجا وہ اور حضرت علیؓ اس وقت رسول کریمؐ کی تجہیر و تکفین مشغول تھے، اور کہا کہ جلدی سے آئے ایک ایسا معاملہ ہو گیا ہے جس میں ان کی موجودگی ضروری ہے۔ جب ابو بکرؓ باہر آئے تو عمرؓ نے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر سعید بن عبادہؓ کو ولی الامر مقرر کرنا چاہتے ہیں، ان میں سے کسی نے کہا ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک قریش میں تھے دونوں چل پڑے راستے میں انہیں ابو عبیدہ بن الجراح مل گئے جنہیں ساتھ لے کر اجتماع انصار میں پہنچے۔ عمرؓ ابھی کچھ کہتا ہی چاہتے تھے کہ ابو بکرؓ نے کہا: آرام سے، پہلے مجھے بات کرنے دو۔ ابو بکرؓ نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، پھر کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لیے محمدؐ کو رسول بنا کر بھیجا اور آپؐ کو اپنی امت پر گواہ بنایا کہ اسی کی عبادت کریں اور اُسے ایک جانیں۔ اس سے پہلے کئی خداؤں کی پوجا ہوتی تھی جنہیں وہ اپنا شفیع سمجھتے تھے۔ کوئی خدا پتھر سے تراشا ہوا تھا اور کوئی لکڑی سے گڑھا ہوا۔ پھر ابو بکرؓ نے تلاوت کی:

”ويعبدون من دون الله..... شفعا عند الله“

”وقالوا ما نعبدهم..... ذكفنا“

”عربوں پر یہ بات شاق تھی کہ وہ اپنے آباؤ و اجداد کا دین ترک کر دیں، اس لیے اللہ نے آپؐ کی قوم سے اولین ہاجرین کو مخصوص کیا کہ وہ آپؐ کی تصدیق کریں آپؐ پر ایمان لائیں، آپؐ کی سب سے اور آپؐ کے ساتھ مصائب پر صبر کریں۔ حالانکہ آپؐ کی قوم نے ابدا ہی میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور آپؐ کی تکذیب شد و مد سے کی۔ ہر قوم کے اندر مخالف نظریات رکھنے والے ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے

جنہوں نے اس سرزمین پر پہلے پہلے اللہ کی عبادت کی اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے یہی لوگ آپ کے اولیاء ہیں اور آپ کے بعد سرداری یا حکومت کے زیادہ منزاوار ہیں۔ صرف بے انصاف لوگ ہی اس بات پر جھگڑا کریں گے۔ اسے قوم انصار یا جہان تک تمہارا تعلق ہے، کوئی بھی دین میں تمہاری فضیلت اور اسلام میں سبقت سے انکار نہیں کرے گا۔ اللہ تمہیں اپنے دین اور اپنے رسول ﷺ کا انصاف بنا تا پسند فرمایا اور آپ لوگوں ہی کی طرف آپ نے ہجرت کی۔ تمہیں میں آپ کی ازواج اور اصحاب ہیں اس لیے مہاجرین اولین کے آپ لوگوں کی منزلت تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ تم و درود ہو جن سے مشورے میں کوتاہی نہیں کی جائے گی اور امور ریاست تمہارے بغیر سمرانجام نہ پائیں گے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بعد جناب بن منذر انصاری اور انصار کے لیے حکومت کا مطالبہ کیا کہ ان کے خلاف جانے کی کوئی جرأت نہ کرے گا اور لوگ انہی کی رائے پر عمل کریں گے کیونکہ ہم لوگ اہل عزت و قوت ہیں، تعداد میں زیادہ ہیں، نجابت کے مالک ہیں اور طاقت رکھتے ہیں۔ اگر یہ لوگ (مہاجرین) اس سے انکار کریں تو ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایکہ ان میں سے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کا جواب دینے بغیر نہ رہ سکے:

”اُفسوس دو تلواریں ایک نیام میں نہیں رہ سکتیں اور دو اونٹ ایک رسی سے نہیں باندھے جاسکتے۔ خدا کی قسم ہا عرب اس پر راضی نہیں ہوں گے کہ امیر تم میں سے ہو اور نبی دوسروں میں سے۔ البتہ عربوں کو اس پر اعتراض نہ ہو گا کہ وہ امارت بھی اسی کو دے دیں جس میں نبی تھا، اور اپنے امور کو خود ہی سمرانجام دیں۔ اس لحاظ سے ہمارے پاس اُس شخص کے لیے جو عربوں (کی بیادت سے) انکار کرے۔ واضح دلیل اور ظاہری طاقت ہے۔ جو محمد کے اختیار اور اس کے حکم میں جھگڑا کرتا ہے، جبکہ ہم اس کے ولی اور اہل خاندان ہیں، تو وہ دلیل باطل پیش کر رہا ہے یا گنہگار ہے یا ہلاکت میں گر گئے والا ہے۔“

جناب بن منذر نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات کا سختی سے جواب دیا جس کو طبری نے پورے کاپورا

نقل کیا ہے، ان کے بعد ابو عبیدہ نے کہا:

”اے انصار! تم اولین لوگ تھے جنہوں نے (اسلام کی آمد کی اور پشت پناہ تیجاہ تمہیں زیبا نہیں کرتی ہیں سب سے پہلے پلٹے والے اور بدلتے والے بن جاؤ۔“  
پھر بشیر بن سعد کھڑے ہوئے اور کہا:

”اے انصار! خدا کی قسم ماہم لوگ مشترکین سے جہاد میں سب سے آگے اور دین میں سبقت رکھتے والے ہیں، اس سے ہماری غرض صرف خدا کی رضا اور نبی کی اطاعت تھی اور ہم نے اپنی جانوں کو تکلیف میں ڈالا۔ ہم نہیں چاہتے کہ ان باتوں سے لوگوں پر رعب ڈالیں، نہ ہم اللہ سے اس کا کوئی اجر یا بدلہ چاہتے ہیں کیونکہ اس طرح تو اللہ نے ہم احسان کیا تھا، مگر یاد رکھو کہ محمد قریش میں سے تھے اور ان کی قوم کا حق اولیت رکھتا ہے اور خدا کی قسم، میں تو ہرگز اس بارے میں ان سے بحث نہیں کروں گا۔ تم بھی خدا سے ڈرو اور اس بارے میں ان کی مخالفت کرو نہ ان سے جھگڑا کرو۔“

حضرت ابو بکرؓ نے کہا:

”یہ عمر نہیں اور یہ ابو عبیدہؓ ان میں سے جس کے ہاتھ چاؤ بیعت کر لو“  
دونوں نے یک زبان ہو کر کہا:

”خدا کی قسم، ہم آپ کے مقابلے میں حکومت کے اہل نہیں کیونکہ آپ مہاجرین میں افضل ہیں۔ حضورؐ کے رفیق غار ہیں اور تمنا میں رسول اللہؐ کے خلیفہ ہیں اور تمنا میں اسلام کا سب سے افضل رکن ہے، کون چاہے گا کہ آپ پر سبقت کرے اور امارت کو آپ پر مسلط کرے؟ ہاتھ بڑھائیے، ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں۔“

جب دونوں بیعت کے لیے بڑھے تو بشیر بن سعد ان پر سبقت لے گئے۔ پھر لوہے کی قبیلہ اوس نے بیعت کی اور پھر باقی مسلمانوں نے ان کی۔

اس عالی شان اجتماع اور ان بلند پایہ مباحث کا جو وہاں اٹھائے گئے، تجزیہ کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کا انتخاب حضرت عمرؓ کی نامزدگی، اہل حل و عقد کی موافقت اور تمام مسلمانوں کی بیعت سے عمل میں آیا۔ اس بحث و تھیس سے، جو سفینہ نبی ساعدہ میں ہوئی، یہ صاف نظر آتا ہے کہ دونوں مخالف نظریوں میں ابھرتی ہوئی اسلامی مسکت کا مفاد ہی مقدم تھا۔ انصار کا خیال تھا

کہ چونکہ مملکت اُن کے علاقے میں قائم ہو رہی ہے اس لیے وہ اس کی حفاظت اور دفاع پر زیادہ قادر ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہاجرین کی رائے تھی کہ عرب معاشرہ مصلحت عامہ کے معاملے میں کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ اس لیے وہ قریش سے زیادہ کسی کو امارت کے اہل نہ پاتے تھے۔

## حضرت عمرؓ کے انتخاب کا طریقہ

حضرت عمرؓ کا انتخاب، حضرت ابوبکرؓ کے طریقہ انتخاب سے بالکل مختلف تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے لیے اپنی زندگی ہی میں عہدے لے لیا تھا اور مسلمانوں کے اہل حل و عقد نے اس سے اتفاق کیا تھا۔ جب حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہوا تو مسلمانوں کو علم تھا کہ ان کے بعد ان کا امیر کون ہوگا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ مسلمانوں میں کھڑے ہوئے اور اپنی بیعت کے عہد سے انہیں آزاد کرتے ہوئے فن سے خلیفہ منتخب کرنے کو کہا، مگر مسلمانوں نے یہ انتخاب انہی پر چھوڑ دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ کے بارے میں مشورہ کرنا شروع کیا، ظاہر یہ ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیخوشی کہ مسلمان کسی ایک نام پر بطور خلیفہ متفق ہو جائیں، اس لیے تھی کہ اس وقت مملکت اسلامی دو عظیم مملکتوں (فارس و روم) سے زبردست جنگ میں الجھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے رئیس اعلیٰ کے انتخاب میں کسی بحث یا تاخیر کی گنجائش نہ تھی تاکہ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے فوراً بعد مسلمانوں کے امور اور مفادات کا کوئی نہ کوئی نگران موجود ہو۔

یوں حضرت ابوبکرؓ کبھی صحابہ سے مشورہ کرنے لگے اور اہل حل و عقد کو بلا کر بات چیت کی۔ وہ مسلمانوں کی رائے بھی ٹٹولتے رہے۔ انہوں نے عبدالرحمن بن عوف، عثمان بن عفان، سعید بن زید، اسید بن الحضیر رضی اللہ عنہم سے رائے بالخصوص چاہی۔ وہ سب حضرت عمرؓ کی فضیلت، خلافت کی اہلیت اور مسلمانوں کی سیادت میں اولیت پر متفق تھے۔ البتہ بعض تے حضرت عمرؓ کی فضیلت کے ساتھ ساتھ اُن کی سحت مزاجی کا خدشہ ظاہر کیا۔ مگر حضرت ابوبکرؓ نے انہیں تسلی دی کہ عمرؓ کی نرمی ان کی سختی پر غالب آجائے گی اور جب وہ خلیفہ بن گئے تو نرمی اور رحم کا موقف اختیار کریں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت عمرؓ سے بڑھ کر مسلمانوں میں خلافت کا مستحق کوئی نہ تھا، کیونکہ وہ دور ایسا تھا، کہ مملکت اسلامیہ تکلیف دہ حالات سے دوچار تھی اور شدید جنگوں میں الجھی ہوئی تھی جن کی وجہ سے

کسی ایسے شخص کا عہدہ خلافت سنبھالنا ضروری تھا جو دو راتدیش، صاحب عزیمت اور بارعب ہو۔ چنانچہ جب ابو بکرؓ نے اپنی مشاورت ختم کیں اور عرض کے انتخاب پر مسلمانوں کا اجماع پایا تو انہوں نے مسلمانوں کے روبرو ہو کر حضرت عمرؓ کے انتخاب کی اطلاع دی، مسلمانوں نے اس پر رضامندی ظاہر کی اس لحاظ سے حضرت عمرؓ کا انتخاب، حضرت ابو بکرؓ کی ذاتی نامزدگی سے ہوا جس سے مسلمانوں نے اتفاق کیا۔ یہ معاملہ حضرت ابو بکرؓ کی زندگی ہی میں طے پا گیا گیا حضرت عمرؓ کے انتخاب پر شوریٰ کا انعقاد اسی طرح واضح تھا جس طرح خود حضرت ابو بکرؓ کی تقرری میں تھا۔

### حضرت عثمانؓ کے انتخاب کا طریقہ

حضرت عمرؓ جب ابولؤلؤ قیرز کے ہاتھوں زخمی ہوئے تو انہوں نے مسلمانوں کو جمع کیا کہ ان کے بعد خلیفہ کا فیصلہ کر لیں۔ مسلمانوں کے اصرار کے باوجود انہوں نے اپنے بیٹے یا کسی کو اور نامزد کرنے سے انکار کر دیا، حالانکہ اگر ابو بکرؓ کسی کو خلیفہ نامزد کر سکتے تھے تو وہ بھی کر سکتے تھے۔ اور اگر ایسا کرتے، تو سنتِ رسولؐ بھی تھی لیکن عمرؓ نے نیا طریقہ سوچا اور چھ عظیم صحابہ کے شوریٰ پر معاملہ چھوڑ دیا کہ رسول اللہؐ دنیا سے رخصت ہوتے وقت اُن سے راضی تھے۔ یہ چھ صحابہ عثمان، علی، عبدالرحمن بن عوف، اوس بن عامر، طلحہ بن عبید اللہ اور سعد بن ابی وقاص تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں اور انہیں تین دن کی ہفت دی کہ زیادہ سے زیادہ اس عرصے میں نہیں اول کا انتخاب ہو جانا چاہیے، حضرت عمرؓ نے یہ بھی کہا کہ ان چھ صحابہ کی مشاورت میں ان کے بیٹے، عبد اللہ بن عمر بھی شریک ہوں گے مگر انہیں خلافت کا حق نہ ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی عائد کی کہ اگر چھ میں سے تین، ایک امیدوار کی اور تین دوسرے امیدوار کی حمایت کریں تو وہ اس فریق کا ساتھ دیں جس میں عبد الرحمن بن عوفؓ ہوں اور یہ حکم بھی دیا کہ جو شخص اکثریت کے اختیار کردہ امیدوار کی مخالفت کرے یا اس کی بیعت میں رکاوٹ ڈالے تو اُسے قتل کر دیا جائے۔

جب اصحابِ شوریٰ جمع ہوئے تو عبد الرحمن بن عوفؓ خلافت کے عہدے کی امیدواری سے دستبردار ہو گئے۔ باقی سب نے ان سے درخواست کی کہ مشورے میں ان کا ساتھ دیں اور اُسے نامزد کریں جس پر مسلمان متفق ہوئے۔

حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ دن رات لوگوں کی رائے معلوم کرتے رہے یہاں تک کہ انہیں احساس ہوا



کہ لوگ دو میں سے کسی ایک کے انتخاب کو تسلیم کر لیں گے یعنی علی بن ابی طالب اور عثمان بن عفان  
 عبدالرحمن بن عوف نے بالآخر یہ دیکھا کہ مسلمانوں کی اکثریت حضرت عثمان رضی کی رحم دلی اور نرمی کو پسند کرتی  
 ہے، شاید مسلمانوں کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ اب ان کی مملکت مضبوط بنیادوں پر استوار ہو چکی ہے  
 اور وقت آ گیا ہے کہ وہ پورا من ماحول میں زندگی گزاریں اور مرقہ الحالی سے فیض یاب ہوں۔  
 جب عبدالرحمن رضی مشاورت کر چکے تو اب ان کے لازم تھا کہ وہ دو میں سے ایک کو مسلمانوں کے  
 لیے نامزد کریں۔ انہوں نے مسلمانوں کو مسجد نبوی میں جمع کیا اور پہلے حضرت علی رضی کو بلا کر پوچھا کہ وہ  
 کتاب اللہ، سنت رسول اور آپ کے دونوں خلفاء کے طریق کے مطابق حکومت کرنے پر آمادہ  
 ہیں؟ حضرت علی رضی نے جواب دیا کہ وہ حسب استطاعت ان کے مطابق عمل کریں گے۔ پھر انہوں نے  
 یہی سوال حضرت عثمان رضی سے کیا تو انہوں نے صرف "ہاں" کہا اور کوئی شرط عائد نہ کی۔ اس پر  
 عبدالرحمن رضی نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور تمام مسلمانوں نے بھی بیعت کی جن میں حضرت علی رضی  
 بھی شامل تھے۔ اس طرح عبدالرحمن رضی نے مسلمانوں سے کرنے کے بعد حضرت عثمان رضی کو نامزد کر دیا، جس کی  
 توثیق بعد میں اہل حل و عقد اور جملہ مسلمانوں نے عام بیعت کے ذریعے کر دی۔

## حضرت علی رضی کے انتخاب کا طریقہ

حضرت علی رضی کا انتخاب خلفاء سابقین سے بالکل مختلف تھا کیونکہ اس وقت مسلمانوں کے حالات  
 مختلف تھے، فتنہ و فساد کا دروازہ کھل چکا تھا اور مسلمان گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ امیر المؤمنین عثمان رضی  
 قتل ہو چکے تھے اور لوگ سخت اضطراب اور پریشانی میں تھے۔ مدینہ میں اقطار و جوانب کے لشکر جمع تھے  
 گویا وہ حالت جنگ میں ہو۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ خلیفہ کی اچانک رحلت کے بعد  
 جو ان کے لیے بے حد اندوہناک تھی، کیا کریں اور خلیفہ مقتول کی جگہ کسے مقرر کریں اور مملکت اسلامیہ  
 کو حیات نو بخشنے کے لیے کیا اقدام کریں، اور جس ظالمانہ فعل کا ارتکاب کیا گیا ہے اس کا صدر کس  
 طرح زائل کریں؟

تمام لشکر حضرت علی رضی کے گرد جمع ہو گئے اور تقاضا کیا کہ وہ مسلمانوں کے امیر کا عہدہ سنبھالیں  
 علی رضی نے اس مطالبے کو مسترد کر دیا اور کہا کہ انہیں (لشکریوں کو) خلیفہ کے انتخاب کا حق حاصل نہیں  
 علی رضی کو احساس تھا کہ اگر انہوں نے ارباب حل و عقد کی رضامندی کے بغیر، محض ان لوگوں کی بیعت سے

خلافت قبول کر لی تو ایک ایسی نظیر قائم ہو جائے گی جو خطرناک بھی ہو سکتی ہے، اور عملاً یہ بیعت جبر و اکراہ کے دائرے میں آئے گی، اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہی چاہا کہ حسب سابق اور اپنے سے پہلے تینوں خلفاء کے طریق کار کے مطابق، صحابہ کبار اور ارباب حل و عقد ہی کو خلیفہ کے انتخاب کا اختیار ہونا چاہیے۔

جب کیا صحابہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور انہیں خلافت پیش کی تو علی رضی اللہ عنہ نے اس سے انکار کی کوشش کی لیکن ان لوگوں نے اصرار کیا اور بہت زور دیا۔ اس پر علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ سب مسلمان مسجد نبوی میں جمع ہوں اور عام بیعت کا اعلان کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور سب حاضرین نے علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ان میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو اجماع ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی بیعت پر ہوا تھا وہ بیعت علی رضی اللہ عنہ کے وقت مفقود تھا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے بعد میں کہا کہ انہوں نے بجز واکراہ بیعت کی تھی اور دونوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ساتھ دیا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لینے کا مطالبہ کیا۔ اس طرح معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام نے بھی اپنے ذاتی سبب سے بیعت سے انکار کیا اور علی رضی اللہ عنہ کے مطالبہ کیا کہ وہ عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو ان کے حوالے کر دیں۔ ماہصل یہ کہ مسلمانوں میں دو خوفناک اور لندہ مناک جنگیں، جنگ جمل اور جنگ صفین اسی مناقشے کے نتیجے میں لڑی گئیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت پہلے اہل مدینہ نے کی اور پھر اس پاس کے تمام علاقے کے مسلمانوں نے، سوائے اہل شام کے، بیعت کر لی،

حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ، معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دست بردار ہو گئے اور مسلمانوں کے ایک گروہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کر لیا، جس کے بعد خلافت موروثی حکومت بن گئی، اگرچہ ہر نیا خلیفہ، اپنے باسبق خلیفہ کا ولی عہد مقرر کیا جاتا تھا۔ مثلاً معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کے لیے عہد لیا، مروان نے اپنے بیٹے عبد الملک کے لیے عہد لیا، پھر اس نے اپنے بیٹے ولید کے لیے اور پھر دوسرے بیٹے سلیمان کے لیے عہد لیا اور یہ سلسلہ اسی طرح چل نکلا۔ اتنا ضرور تھا کہ بنو امیہ اور ان کے بعد کے خلفاء بیعت کی پاسداری کرتے رہے اور یہ عمل جاری رکھا۔ ان میں سے ہر ایک کو یہ خواہش رہی کہ وہ اپنے بیٹے کے حق میں، یا اپنی زندگی ہی میں کسی اور کے لیے بیعت لے اور اس کے بعد اس کے تحت نشین ہونے پر مسلمان دو حرمی دفعہ بیعت کریں۔ اس موروثی نظام کی ایجاد پر بعض نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو

کی طرف یہ عذر پیش کیا ہے کہ حالات ایسے تھے جن کی وجہ سے ایسا نظام ضروری ہو گیا تھا۔ مسلمانوں میں تفرقہ پرچو کا تھا، فتوحات کو مستحکم کرنا لازمی تھا اور اسلام کی دشمن طاقتوں کے ہوتے ہوئے، جو گھات لگائے بیٹھی تھیں، ایک مضبوط مملکت کے قیام کی ضرورت تھی۔ اس موقع پر ایک ایسی حکومت کی ضرورت محسوس کی گئی جو "عصبیت" رکھتی ہو۔ اور ان حالات میں نقطہ بنو امیہ کی "عصبیت" ہی اس بات پر قادر تھی کہ اسلامی حکومت کے استقرار کا بوجھ اٹھا سکے اور اس کی بنیادوں کو پختہ کرے انہی اسباب کی بنا پر معاویہؓ نے یہ نظام رائج کیا اور اپنے بیٹے کو ولی عہد مقرر کیا۔

ہم نے حاکم اعلیٰ کے انتخاب کے بارے میں تاریخی واقعات پیش کر دیئے ہیں، اور اب ہم ان کا تجزیہ پیش کرنے ہیں تاکہ ہم حالات کا جائزہ لے سکیں۔ جن کے تحت مسلمانوں نے خلیفہ یا امام کی تعیین کی بلکہ یہ واضح رہے کہ ہم ان نظام کے اتباع یا التزام کے پابند نہیں۔ ہم تو ان سے صرف روشناس ہونا چاہتے ہیں، کیونکہ یہ کوئی آسمانی حکم نہیں جس کی پیروی لازمی ہو، مسلمان اپنے حالات، ماحول اور زمانے کے مطابق اور مناسب کوئی بھی طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔

خلیفہ کے انتخاب کے بارے میں یہ طریقے سامنے آتے ہیں:

- ۱۔ اہل حل و عقد کی طرف سے انتخاب۔
- ۲۔ مابتن خلیفہ کی طرف سے نامزدگی۔
- ۳۔ اپنے آپ کو خلافت کا مستحق سمجھنے والے کی طرف سے اعلان اور اس کے ہاتھ پر مسلمانوں کی بیعت
- ۴۔ خلیفہ سابق کی طرف سے اس کے جانشین کے انتخاب کے طریقے کا تعیین
- ۵۔ وراثت۔
- ۶۔ جبر و غلبہ
- ۷۔ قرآن یا سنت یا خلیفہ سابق کی طرف سے کوئی حکم۔

مثالی طریقہ تو یہی ہے کہ — اور یہی سب طریقوں میں قدر مشترک رہی ہے — کہ ارباب حل و عقد خلیفہ کا انتخاب کریں۔ "ارباب حل و عقد" کون ہیں؟ ان کے بارے میں ہم بعد میں تفصیل سے عرض کریں گے۔ مگر اتنا جان لیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اسلامی مملکت میں رائے رکھتے ہیں اور ان کی بات سنی جاتی ہے۔ علمائے سیاست اور فقہائے مسلمین کی اکثریت کی رائے میں ارباب حل و عقد وہ ہیں جو مملکت میں خلیفہ کے انتخاب کی حیثیت کے حامل ہیں، خلیفہ اول کے انتخاب کے وقت جو لوگ جمع تھے ان کی حیثیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ شوریٰ کا مفہوم کیا ہے؟

علمائے سیاست و دین اس بارے میں مختلف رائے رکھتے ہیں کہ انتخاب خلیفہ کے لیے ارباب حل و عقد سے کیا مراد ہے۔

پہلی یہ کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو انتخاب کے وقت مملکت اسلامیہ یا دارالحکومت میں موجود ہوں، ان کی دلیل یہ ہے کہ خلفائے اربعہ کا انتخاب اُن اہل حل و عقد نے کیا جو مدینہ میں موجود تھے یہ زیرِ غور رہے کہ اگر مملکت کے گوشے گوشے سے تمام اہل رائے کو جمع کرنے کی کوشش کی جائے تو بڑی دشواری پیش ہوگی، کیونکہ سفر کے حالات آسان نہیں ہوتے، اور اگر اس میں تاخیر روا رکھی جائے تو حاکم اعلیٰ جیسے اہم منصب کے انتخاب میں خلل واقع ہو سکتا ہے۔ "الاحکام السلطانیہ" کا مصنف، الامار دوی اس رائے کا حامل ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے تمام منطوقوں اور علاقوں کے ارباب حل و عقد کو شریک ہونا چاہیے کیونکہ پہلی رائے کے حق میں کوئی وسنت سے کوئی سند نہیں ملتی اور "الفصل فی الملل والاعباد والنحل" کے مصنف، ابن حزم نے اس کی سخت مخالفت کی ہے کہ اس میں ہرگز کوئی خوبی یا فائدہ نہیں۔

ہماری رائے میں صدر اول کے مسلمانوں کے مقابلے میں ہمارے زمانے کے حالات بدل چکے ہیں اور جو بات اُن کے لیے دشوار تھی اب شاید اتنی دشوار نہیں رہی، مثلاً سفر میں اب خاصی سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں، اور اب ایسا نظام بالعموم رائج ہو چکا ہے جس "ارباب حل و عقد" سال میں کئی بار دارالحکومت میں جمع ہوتے ہیں۔ اس لیے اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ مملکت کے سب لوگ انتخاب خلیفہ (یا حاکم) میں شریک ہوں۔ البتہ اگر حالات اجازت نہ دیتے ہوں تو اور پوری مملکت سے ارباب حل و عقد کا اجتماع مشکل ہو جائے تو پھر دارالحکومت میں موجود افراد ہی پیکر لے کر جانیں جہاں تک خلیفہ سابق کی طرف سے اپنے جانشین کی نامزدگی کا تعلق ہے، جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ نے کیا تھا تو اس بارے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت عمرؓ کو نامزد کرتے وقت ابو بکرؓ نے صرف اپنی رائے سے کام نہیں لیا تھا بلکہ انہوں نے صحابہؓ سے مشورہ کیا اور اہل حل و عقد کی اکثریت کی رائے معلوم کی جب انہیں یقین ہو گیا کہ سب کی رائے یہی ہے کہ عمرؓ سب مسلمانوں سے زیادہ خلافت کے حق دار ہیں (چند ایک نے عمرؓ کی سخت مزاجی کا تذکرہ ضرور کیا تو ابو بکرؓ نے عمرؓ کو خلیفہ نامزد کر دیا بعد میں عمرؓ کی سخت مزاجی سے خوفزدہ ہونے والوں کو بھی یقین ہو گیا کہ یہ سختی حضرت ابو بکرؓ کی نرمی کے سبب تھی۔

ابن حزم کے خیال میں حاکم اعلیٰ کے انتخاب کا یہ طریقہ سب سے بہتر ہے کہ اس سے حکومت میں فصل یا وقفہ نہیں آتا اور اہل رائے کا مشورہ بھی شامل ہوتا ہے۔

اگر کسی ایسا ہو کہ ارباب حل و عقد خلافت کے لیے کسی کا انتخاب نہ کریں اور خلیفہ سابق بھی اپنے بعد کسی کو نامزد نہ کرے، تو ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ کوئی ایسا شخص، جو خلافت کی شرائط پر پورا اترتا ہو، اپنے آپ کو پیش کرے اور اگر مسلمانوں کے اسباب حل و عقد کی اکثریت اس کی تائید کرے اور اس کی بیعت کر لے تو وہ مملکت کا حاکم اعلیٰ بن جائے گا۔

یہاں اس بات کا اشارہ ضروری ہے کہ زید یہ کی اکثریت (جو یعنی شیعوں کا اعتدال پسند گروہ ہے) اس طریقے پر عمل کرتی ہے۔ اُن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ "نص کی رو سے" امامت تو علی، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کا حق تھی مگر ان کے بعد جو بھی امامت کا مستحق ہو، اس کا دعویٰ ہو سکتا ہے۔

خلیفہ سابق یہ بھی کر سکتا ہے کہ وہ اپنے بعد کسی خاص شخص کو نامزد کرنے کی بجائے انتخاب کا طریقہ متعین کر جائے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے کیا کر انہوں نے اصحاب شوریٰ مقرر کر دیئے اور ان پر چھوڑ دیا کہ اپنے میں سے کسی ایک کو، مسلمانوں سے مشورے کے بعد، منتخب کر لیں۔ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، کہ عبدالرحمن بن عوفؓ نے خلافت کی امیدواری سے دستبردار ہونے کے بعد، کس طرح مسلمانوں کے خیالات معلوم کیے اور اُن سے مشورہ کیا، اور جب انہیں معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کی اکثریت عثمانؓ اور علیؓ میں سے کسی ایک کے حق میں ہے تو انہوں نے دونوں امیدواروں کو بلا کر عہد لینا چاہا کہ وہ قرآن و سنت اور شیخین کی سیرت پر عمل کریں گے۔ عثمانؓ نے تو بلا تردد مان لیا مگر علیؓ نے تذبذب کا اظہار کیا، جس پر عبدالرحمنؓ نے فوراً عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور تمام مسلمانوں نے (جن میں حضرت علیؓ شامل تھے) ان کی پروا کی حضرت عبدالرحمنؓ کی بیعت ایک لحاظ سے "نامزدگی" تھی، اور جملہ مسلمانوں کی بیعت، انتخاب کی حیثیت رکھتی تھی۔

ہمارے خیال میں یہ تمام طریقے اہل حل و عقد کی موافقت پر مبنی ہیں۔ بعض علما نے وراثت کو بھی خلیفہ کے انتخاب کا طریقہ ٹھہرایا ہے اس طریقے کے مطابق کسی دور یا ملک میں راج نظام وراثت کے تحت حکومت بیٹے، بھائی یا کسی اور کو منتقل ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں میں اس طریقے کی حمایت سب سے پہلے ابن خلدون نے کی۔ اس کے ہم خیال علما، کے نزدیک ایک طرح سے سابق خلیفہ کی طرف سے ولی عہد نامزد کرنے کے مشابہ ہے اور استقر حکومت اور ملک میں امن و سلامتی کا ضامن ہے، ہم یہ کہنے میں باک نہیں کہ خلفائے بنو امیہ، نظام وراثت کے حامی ہونے کے ساتھ ساتھ، اپنے نامزد ولی عہد کو اپنے بعد خلیفہ مقرر کرنے پر

بیعت لینے میں بہت شدت سے کام لیتے تھے۔ جب ان کا نامزد منصبِ خلافت سلیمان تھا تو عامۃ المسلمین سے دوبارہ بیعت لی جاتی تھی۔ اس طرح یہ نامزدگی اور "انتخاب" بھرا ہوتا تھا اور عوام اس میں مجبوراً حصہ لیتے تھے۔

بعض فقہائے احناف نے "قہر و غلبہ" کے طریقے کی حمایت کی ہے کہ یہ بھی مسلمان حاکم اعلیٰ کی تقرری کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنے قبیلے یا خاندان یا دوسرے حامیوں کی مدد سے حکومت پر قابض ہو جائے تو وہ فی الامر حاکم ہو جاتا ہے شاید اس طرح فقہائے احناف اس اقدام کی تائید کر رہے ہیں جو معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کی خاطر اٹھایا اور اس وقت بعض مسلمانوں نے اس کی بیعت کرنے کی پس دہش کی۔ ممکن ہے اس طرح استقرار حکومت کا مقصد تو حاصل ہو جائے مگر اس طریقے کی حمایت سے اقتدار اعلیٰ کے ہر جو شخص کے لیے آسان ہو جائے گا کہ وہ قوت اور رعب سے مسند اقتدار پر قابض ہو جائے، خواہ وہ اس کا اہل ہو یا نہ ہو۔ اس طرح مسلمانوں کے لیے اتنے بڑے فتنے کا دروازہ کھل جائے گا جسے بند کرنا ممکن نہ ہو گا۔

آخر میں یہ بات کہنا ضروری ہے کہ شیعوں کے بعض فرقے کہتے ہیں کہ امام کے انتخاب میں نص کا اعتبار افضلیت رکھتا ہے۔ (امامیہ) حضرت علیؓ کے فرقے کی رائے میں قرآن اور سنت، رسول اللہؐ کے بعد، حضرت علیؓ کی امامت پر دلالت کرتے ہیں۔ علیؓ، حضرت حسنؓ پر نص ہیں۔ حضرت حسینؓ، حضرت حسینؓ پر اور حسینؓ اپنے بعد علیؓ (زین العابدین) پر نص ہیں، اور اسی طرح یہ سلسلہ آگے چلتا رہا۔ امامیہ نے آیات اور احادیث کی ایسی تاویلیں کی ہیں جو تکلف محض نظر آتی ہیں اور جن کی حمایت عربی زبان کرتی ہے، ان تاریخی واقعات۔ مثلاً "قرآن مجید میں آتا ہے:

انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین امنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتوا الزکاۃ  
وہم ذاکون (المائدہ (۵) : ۵۵)

تیسرا اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ "نماز قائم کرنے والے، زکوٰۃ دیتے والے اور رکوع کرنے والے" سے مراد دراصل علیؓ ابن ابی طالب ہیں۔ اس تاویل میں عربی لغت اور حقیقت سے بہت بڑا انحراف ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں آیا ہے:

"وان تطاہروا علیہ فان اللہ مولدہ وجبریل وصالح المؤمنین" (الاحزیم (۶۶) : ۴)

تیسرا "صالح المؤمنین" سے مراد حضرت علیؓ لیتے ہیں۔ اسی طرح اور کئی مقامات ہیں، جو حضرت علیؓ کی امامت

پر انتہائی کمزور حجت ہیں۔

## مملکت میں اختیار اور قیادت کا منبع

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ حاکم (یا عمومی لحاظ سے "حکومت") شہریوں پر اختیار اور قیادت کا حق دار اس لیے ہوتا ہے کہ وہ مملکت کا سربراہ ہوتا ہے۔ یہ سربراہی قیام مملکت کے لیے لازمی شرط ہے، جس سے عوام کے مختلف طبقوں میں ربط اور یک جہتی پیدا ہوتی ہے، بلکہ کے تمام خطوں میں تعلق پیدا ہوتا ہے اور نظام حکومت ایک مرکز پر چلتا ہے۔ اسی لیے حکومت کے پاس اختیار ضروری ہے۔

سربراہ مملکت کو اختیار حاصل ہے کہ وہ مناسب حد تک عوام کی آزادیوں پر پابندیاں عائد کرے ٹیکس لگائے اور مختلف قوانین پر عمل درآمد کرانے، اس غرض سے حکم کو اپنے اختیارات کے استعمال کا حق حاصل ہے تاکہ نظم و ضبط پیدا ہو، مملکت کو استقرار ملے، شہریوں کے حقوق محفوظ ہوں اور فتنہ و فساد کا قلع قمع ہو سکے۔

حاکم کے ان اختیارات کا سرچشمہ کیا ہے؟ کیا محض اپنی شخصیت کے بل بوتے پر اسے اختیارات حاصل ہوتے ہیں، یا حاکم اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے؟

اس کے بارے میں کئی نظریات ہیں مگر ہم دو پر اکتفا کرتے ہیں:

۱۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ حاکم ہو خدا سے حکومت کا حق ملتا ہے۔  
۲۔ اس کے حامل افراد کے نزدیک وہ اللہ تعالیٰ کا نائب اور زمین پر اس کا خلیفہ ہے اس لیے اسے اختیارات کا سرچشمہ خدا ہے۔  
۳۔ ماضی میں یہ نظریہ بہت عام رہا اور قرون وسطیٰ تک رائج تھا۔ بعض اوقات تو حاکم اپنے آپ کو خدا کا نائب نہیں بلکہ خود خدا اور "خدا کی اولاد" سمجھنے لگتا تھا۔ ورنہ کم سے کم وہ یہ ضرور سمجھتا تھا کہ وہ خاندان، خون اور عزت کے لحاظ سے جملہ شہریوں سے ممتاز ہے۔

اس نظریے کے نتیجے میں کئی ایسے حاکم پیدا ہوئے جو آمر تھے یا مطلق العنان حکمران تھے، اور عوام کو ان پر تنقید یا جرح یا حکومت کی غلطیوں کی نشاندہی کا کوئی حق نہیں تھا۔ حکمرانوں کا کہنا تھا کہ وہ اللہ کے سوا کسی کے سامنے اپنے اعمال کے لیے جوابدہ نہیں، جس نے انہیں لوگوں پر حکومت کرنے کا حق تفویض کیا ہے اور ان کی جان و مال پر تصرف عطا کیا ہے۔

اس نظریے کے حامی استبدادی نظام حکومت کی تائید کرتے ہیں، اور اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ خود اپنے لیے ظلم پسند کرتا ہے، نہ اپنے بندوں میں سے کسی کو اس کی اجازت دیتا ہے۔

۲۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ حاکم، امت کے دوسرے افراد کی طرح ایک فرد ہے، اور جو بھاری ذمہ داری وہ اٹھاتا ہے وہی اسے عام لوگوں سے منفرد بناتی ہیں۔ ان کی رائے میں امت کا ارادہ ہی اختیارات کا سرچشمہ ہے، اور یہ ارادہ قانون کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ امت ہی حکام کے اعمال پر نظر رکھتی ہے اور وہی انہیں اختیار، سربراہی اور حکومت کرنے کا حق دیتی ہے، یہ نظریہ فرانسسیسی مفکر روسو کے ”معاہدہ عمرانی“ میں پوری طرح واضح کیا گیا ہے۔

یہ کتنا ضروری ہے کہ یہ نظریہ بھی استبداد اور مطلق العنانی کا راستہ نہ روک سکا، بلکہ بعض اوقات تو حکمران، اقتدار پر پوری طرح قابض ہو گئے اور یہ دلیل دی کہ وہ عوام کے ارادے کے منظر میں، اور عوام کی رائے بہر حال مقدس ہے!

اس مسئلے پر اسلامی نظام کیا موقف رکھتا ہے؟ ہم نے دیکھا ہے کہ اسلام بلحاظ روح و نفس، ”تفویض الہی“ کے نظریے کو قبول نہیں کرتا، بلکہ اسے اختیار پر قبضے اور حکومت میں مطلق العنانی کا زینہ سمجھتا ہے۔ جو لوگ یہ نختے ہیں کہ حاکم زمین پر خدا کا خلیفہ ہے انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام روئے زمین کے تمام انسانوں کو اللہ کا خلیفہ سمجھتا ہے، جو اپنی عقل اور ہدایت قبول کرنے کی استعداد کے اعتبار سے، اشرف المخلوقات ہیں اس لیے کسی انسان کے لیے جائز نہیں کہ باقی تمام انسانوں کو چھوڑ کر تنہا ”خلیفۃ اللہ“ قرار پائے۔ یہ کہنا کہ حاکم خدا کی مرضی سے اختیارات کا مالک بنتا ہے تو اس صحیح بات سے غلط مطلب اخذ کیا جانا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ دنیا کی ہر چیز، اللہ ہی کے ارادے اور قدرت سے انجام پذیر ہوتی ہے، اور صرف حاکم ہی اختیار کے استعمال کے معاملات میں منفرد نہیں کسی کو یہ منزاوار نہیں کہ وہ یہ دعوے کرے کہ اُسے خدا یا انبیاء کی جانب سے حکومت کرنے کا اختیار ملا ہوا ہے۔

مسلمان علماء میں سے بعض اس نظریے کے حامی ہیں اور وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس قول سے حجت لاتے ہیں کہ ”میں اس لباس کو کس طرح اتار دوں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے پہنانا ہے“

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس قول کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ حالات اور واقعات پیش نظر



جن میں انہیں ایسا کتنا پڑا یہ بات سب کو معلوم ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے اواخر میں مسلمانوں میں فتنہ پھوٹ پڑا تھا، اور بعض شریکوں اور فتنہ پروروں نے چاہا کہ وہ سادہ لوح لوگوں کا استحصال کر کے خوں ریزی برپا کریں۔ ان سازشیوں کا سرغنہ عبداللہ بن سبا (یہودی) تھا، جس نے عوام اور سادہ لوح لوگوں کو گمراہ کیا۔ انہوں نے چلتی چھڑی بانوں سے جھوٹ کو پھینکا دکھایا اور ان افراد کو اسلام کے دشمنوں نے بڑھا چڑھا کر پھیلایا۔ انہوں نے مدینے کا محاصرہ کر لیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مطلع کیا کہ یا تو وہ خلافت سے دستبردار ہو جائیں ورنہ قتل کر دیئے جائیں گے۔

قدرتی طور پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف سخت موقف اختیار کیا کہ وہ خود خلافت سے کس

طرح دستبردار ہو سکتے ہیں کیونکہ انہیں مطالبہ کرنے والوں میں کوئی بڑے بڑے صحابہ یا اصحابِ رائے و مشورہ نظر نہ آئے۔ اگر ہر شرعی حاکم (یعنی جو جائز طور پر اقتدار میں آیا ہو) سازشیوں، باغیوں اور اطاعت شکنوں کے مطالبات ماننے لگے، جو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتے ہوں تو حکومت کو قرار حاصل ہوگا کہ نظام حکومت میں انصاف کا عمل دخل ہوگا۔ ہماری رائے میں اگر عثمان رضی اللہ عنہ مطالبہ کرنے والوں میں صحابہ یا اہل رائے و مشورہ کو پاتے تو دوسرا موقف اختیار کرتے اور ان کی رائے پر عمل کرتے ہوئے بخوشی خلافت سے دستبردار ہو جاتے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ کبھی غلط مشورہ نہیں دیں گے۔

ہمارے اس موقف کی تائید میں کہ حاکم اعلیٰ کا اختیار شخصی نہیں اُس کے لیے مناسب ہے

کہ مطلق العنان بن جائے، رسول اللہ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے کئی اشارے اور مواقف ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی حاکم کا اختیار رسول اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے بالاتر نہیں۔ روایت ہے کہ کوئی شخص رسول کریم کے سامنے آیا تو آپ کے رعب سے گھبرا گیا اور زبان لڑکھڑانے لگی۔ آپ نے فرمایا: ”ڈرو نہیں، میں بادشاہ ہوں نہ جاہر حکمران“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لوگوں کو احساس تھا کہ وہ سخت مزاج اور حق کے اظہار میں صاف گو

ہیں، مگر عمر رضی اللہ عنہ سے کہتے: ”خدا کی قسم! میں بادشاہ نہیں کہ میں نہیں غلام بنا لوں اور تم پر بھیر حکومت کروں۔ میں تو تم جیسا اور تمہی میں سے ہوں۔ میرا مقام ہے وہ ہے جو کسی یتیم کے ولی کا اس کے مال کے معاملے سے ہوتا ہے“ یعنی وہ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ وہ مسلمانوں میں سے ایک فرد ہیں، اور ان کے معاملات کی نگرانی اسی طرح کرتے ہیں، جس طرح کسی یتیم کا ولی حسن و خوبی و نیکی سے یتیم کی مصلحت کا خیال رکھتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک والی سے کہا: ”اے ابو موسیٰ! میں اور تم لوگوں کو تو زمین سے

ہیں، سوائے اس کے اللہ تعالیٰ نے ہمارا بوجھ بھاری کر دیا ہے۔ کسی شاعر نے اس معنی میں ان کی مدح کی، جسے حضرت عمرؓ نے قبول کیا اور اگر وہ اس کے اشعار میں خلاف طبع کوئی بات پاتے تو ضرور اُسے ڈانٹتے۔

أنت ألامام الذی من بعد صاحبہ

ألقي إلیک مقالید النہی البشر

(تو یہی وہ امام ہے جسے، اس کے رفیق کے بعد، لوگوں نے اپنی عقل کی کنجیاں سونپ دی ہیں)

لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ امت یا عوام اختیار کا منبع ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ بات نظام اسلامی پر منطبق نہیں ہوتی کیونکہ عوام کو اختیارات کا منبع تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ساری کی ساری قانون سازی عوام یا ان کے نمائندے کریں۔ اسلام نے امت کی مزبور اسی اور ریادت تسلیم نہیں اسے اہل خلافت یا حامل خلافت کہلے جس طرح خلیفہ اپنے اختیارات میں شریعت کا پابند ہے اور وہ تو زمین پر خدا کا سایہ ہے نہ اسے کوئی "خداوندی حق" حاصل ہے، اس طرح حاکم اعلیٰ خدا اور اس کے رسولؐ کی شریعت کے مطابق، امت کے امور دین اور ان کے دوسرے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے گویا "وکیل" یا ایجنٹ ہے اور امت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ حاکم اعلیٰ کو نیک مشورہ دے، اس کی رہنمائی کرے اور اگر وہ غلط چلے تو شبیہ کرے بلکہ اگر وہ دین سے انحراف کرے تو اسے معزول کرنے کا حق بھی ہے۔ وکالت کا یہ "معاہدہ" اس بیعت سے واضح ہوتا ہے جو امت اپنے مسلمان حاکم کے ہاتھ پر کرتی ہے۔

فقہاء کی کثیر تعداد اور مسلمانوں میں سے علم سیاست کے پرانے اور نئے ماہرین بھی رائے رکھتے ہیں اس سے یہ استدلال بھی کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جماعت مسلمین کو عام معاملات میں من حیث الجماعۃ خطاب کرتا ہے نہ کہ کسی فرد واحد کو،

مثلاً "قرآن مجید میں آیا ہے:

"یا ایہا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط..... فلا تتبعوا الهویٰ ان

تعدلوا"۔ (النساء : ۱۳۵)

اور مزید فرمایا:

”يا ايها الذين آمنوا اوفوا بالعقود“۔ (المائدہ: ۱)

اور یہ بھی کہا:

”وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان“ (المائدہ: ۲)

پوری کی پوری امتِ اسلامیہ کا فرض ہے کہ وہ حدودِ اللہ کی پاسداری کرے اور اللہ تعالیٰ کے حکام کی پیروی کرے۔ اُسے حاکمِ اعلیٰ کے انتخاب اور حکام پر نظر رکھنے کا حق دیا گیا ہے۔ رسول اللہ کا قول بھی اسی معنی میں ہے کہ: ”میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعائ مانگی کہ میری امت کبھی گمراہی پر مجتمع نہ ہو، تو وہ قبول ہوئی۔“ اس کا سادہ سا مفہوم یہ ہے کہ جب امت کسی رائے پر متفق ہو جائے تو وہی حق ہوتا ہے اور اس پر عمل درآمد واجب ہو جاتا ہے کیونکہ اس رائے کا استعمال انسان نے صاحبِ خلافت اور حاملِ خلافت کی حیثیت سے کیا ہے۔

اس حیثیت سے امت اپنے حقوق کا استعمال پتے نامزد نمائندوں کی وساطت سے کرتی ہے، جن کو قرآن مجید ”اولوالامر“ کہتا ہے۔ فقہاء اور علماء ان کی صفات اور تعداد کے بارے میں مختلف رائے رکھتے ہیں، لیکن بالعموم ان کا کہنا یہ ہے کہ ان میں بھی وہی صفات ہونی چاہئیں جو مسلمان حاکم کے لیے ضروری ہیں (سوائے شرطِ نسب کے، اور وہ بھی جو اہم کے لیے ضروری سمجھتے ہیں)۔

مادردی کی رائے میں اہم صفات یہ ہیں: انصاف پروری، علم، صائب الرائے ہونا اور دانائی، کون لوگ ”اولوالامر“ ہونے کے مستحق ہیں تو بعض علماء ان میں صرف امرا اور اعلیٰ سول و فوجی حکام کو شمار کرتے ہیں، بعض دیگر علماء ان میں امرا اور حکام کے علاوہ علماء، فوجی افسر اور وہ تمام افسر اور حکام شامل کرتے ہیں جن کے پاس لوگ حاجت روائی کے لیے جاتے ہوں یا عام معاملات کی تکمیل کے لیے

## رئیس مملکت کے حقوق و فرائض

اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق حاکمِ اول امت کے افراد میں سے ایک فرد ہے۔ اس میں اور دوسرے افراد میں صرف یہ فرق ہے کہ اس پر بوجھ زیادہ ہوتا ہے اور اس کی ذمہ داری بھی سب سے بڑی ہے۔ اُس کو کوئی ایسی خصوصی اہمیت حاصل نہیں کہ وہ مشورے اور ہدایات سے بے نیاز ہو یا فرائض کی ادائیگی اُسے معاف ہو۔ امتِ مسلمہ میں اُسے ایسا کوئی ”تقدس“ بھی حاصل نہیں جیسا کہ بعض حکام دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ تو محض امت کا نمائندہ اور کارندہ ہے، جسے مملکت کے امور کو چلانے اور عوام کے

مفادات کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

رئیس اعلیٰ خدا کا خلیفہ بھی نہیں، جیسا کہ بعض لوگوں کا گمان ہے، وہ تو محض "خلیفۃ رسول اللہ" ہے۔ قرآن کے نزدیک تو انسان، بحیثیت انسان، خدا کا خلیفہ ہے۔ اسلام خلیفہ یا "رئیس اول" کو "عصمت مطلقہ" (کامل برتیت) عطا نہیں کرتا، کیونکہ وہ صرف خدا کے واحد کی صفت ہے۔

اُس کی اطاعت بھی اسی حد تک کی جاسکتی ہے کہ اس کے اعمال و احکام کس حد تک اسلام کے صحیح اصولوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اگر وہ اس رشتے سے ہٹ جانے اور کج رہی اختیار کرے تو لوگوں کا حق ہے کہ اُسے تنبیہ کریں کیونکہ امت کو اُسے سیدھا کرتے، تنبیہ کرنے اور اس کے اعمال پر نظر رکھنے کا حق حاصل ہے کیونکہ امت ہی نے اُسے وہ مقام عطا کیا ہے اور کسی جبر و اکراہ کے بغیر نیک عہد سے بیعت کر کے اُسے اپنے امور سونپے ہیں۔ نبی کریم اور آپ کے صحابہؓ کی زندگی میں حاکم اعلیٰ اور امت کے درمیان کامل مساوات دیکھنے میں آتی تھی اور وہ اس اعلیٰ اصول کی سختی سے پیروی کرتے تھے۔ اپنی ائیر نے اپنی کتاب "اکامل" میں روایت کی ہے کہ حضورؐ مرض الموت میں فضل بن عباسؓ اور علیؓ بن ابی طالب کا سہارا لیے ہوئے اپنے گھر سے نکلے اور منبر پر آکر بیٹھ گئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا:

"اے لوگو! اگر میں نے کسی کی پیٹھ پر (ظلم کیا) کوڑے لگائے ہوں، تو میری پیٹھ حاضر ہے، وہ اپنا بدلہ لے لے، جس کسی کی عزت پر میں نے (غلطی سے حملہ کیا ہو وہ بھی مجھ سے بدلہ لے لے، اگر کسی کا مجھ پر قرض ہو تو وہ بھی مجھ سے وصول کر لے۔ مجھ سے یہ توقع نہ رکھو کہ میں تم سے ناراض ہوں گا، کیونکہ یہ میرا رتبہ نہیں۔ میرے نزدیک تم سب سے زیادہ پسندیدہ شخص وہ ہے جو مجھ سے اپنا حق لے لے، اگر کوئی نکلتا ہو یا مجھے معاف کر دے تاکہ جب میں اپنے رب سے ملوں تو پاک اور صاف ہوں۔"

خلفائے راشدین کا طرز عمل بھی اس سے مختلف نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے آپ کو کئی بار بدلہ لینے کے لیے پیش کیا۔ جب اُن سے اُس کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا:

"میں نے رسول اللہ کو یہی کرتے دیکھا ہے اور ابوبکرؓ کو بھی۔ میں انہیں کی پیروی کر رہا ہوں۔"

مسلمان حاکم ہمیشہ یہ ذہن نشین رکھتے تھے کہ اسلام اس میں اور محکوموں میں فرق نہیں کرتا، حتیٰ کہ عقوبت اور قصاص میں بھی سب برابر ہیں۔

اسلام نے اس پر لازم کر دیا ہے کہ وہ اُمت کی حسبِ منشا، اور ان کے نمائندے کی حیثیت سے، اپنے فرائض کمالِ تندہی اور دیانتداری سے ادا کرے، اسی طرح اُمت پر بھی اسلام نے کچھ فرائض ادا کیے ہیں۔ حاکم کے فرائض، اُمت کے حقوق ہیں اور اُمت کے فرائض حاکم کے حقوق ہیں۔ یہ ایک ہی کے دو رخ ہیں:

## حاکم کے فرائض

حاکم کے فرائض پر سیاسیات کے علمائے مختصراً و طویل دونوں طرح سے بحث کی ہے للہا وری نے دس فرائض گنوائے ہیں جو حاکم کے لیے ادا کرنا لازم ہیں: اور علماء کی اکثریت نے اس سے اتفاق کیا ہے۔

۱۔ قاضی ابوالعین ان فرائض کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”امام پر، اُمت کے معاملات میں دس باتیں فرض ہیں:

- ۱۔ اُن اصولوں پر دین کی حفاظت جن پر سلفِ اُمت کا اجماع ہے، اگر وہ کج روی اختیار کرے، اور اُس پر ذاتِ پرستہ ہو جائے تو اس پر حجت قائم ہو جائے گی اور اُسے صحیح راستہ دکھانا لازم ہوگا اور حقوقِ حدود بتانا ہوں گی تاکہ دینِ خلیل سے اور اُمتِ لغزش سے بچ جائے۔
- ۲۔ متنازع فریقوں کے درمیان احکام کا نفاذ اور جھگڑے کا خاتمہ تاکہ انصاف قائم ہو اور کوئی ظالم حد سے نہ بڑھے اور کوئی مظلوم اپنے آپ کو کمزور نہ سمجھے۔
- ۳۔ ملک و سلطنت کی سرحدوں اور لوگوں کے جان و مال کی حفاظت، تاکہ لوگ اطمینان سے اپنے کاروبار کر سکیں۔ اور ان کے سفر محفوظ ہوں۔
- ۴۔ شرعی حدود کا نفاذ، تاکہ اللہ تعالیٰ کی حرمت کی خلاف ورزی نہ ہو اور لوگوں کے حقوق ضائع اور تباہ ہونے سے محفوظ رہیں۔
- ۵۔ پوری قوت اور طاقت سے سرحدوں کی حفاظت، تاکہ دشمن کو آٹھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہو اور کسی مسلمان یا معاہدہ کی عزت اور جان پامال نہ ہو۔
- ۶۔ اسلام کے دشمنوں کو دعوت دینے کے بعد جہاد تاکہ وہ مسلمان ہو جائیں یا اہل ذمہ بن جائیں۔
- ۷۔ کسی جبر کے بغیر ان ٹیکسوں کا نفاذ، جس کی نص نے وضاحت کی ہے اور انہیں فرض قرار

دیا ہے۔

- ۸۔ بیت المال سے (فضول خرچی کے بغیر) مستحقین کی مدد، جس میں کسی سے زیادتی ہو نہ کسی کے حق میں کمی آئے، اور کسی پس و پیش اور وقت کے زیاں کے بغیر جاری ہو۔
- ۹۔ عاملین حکومت اور مشیروں کی جانچ پڑتال اور محاسبہ، تاکہ وہ اپنے کام میں غفلت نہ کریں اور لوگوں کے جان و مال محفوظ رہیں۔

- ۱۰۔ وہ بذاتِ خود، امور و احوال کا جائزہ لیتا رہے تاکہ اُمت کے مفادات کی نگرانی میں کوتاہی نہ ہو اور ملت کی حفاظت ہو سکے اور عیش و عشرت یا کثرتِ عبادت میں مشغول ہو کر اپنے فرائض سے غافل نہ ہو کیونکہ بعض اوقات دیانتدار لوگ خیانت کرتے ہیں اور قابلِ اعتماد افراد دھوکہ دے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ”اے داؤد! ہم نے تمہیں پر زمین پر خلیفہ بنایا ہے سو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرو“ (ص ۳۸: ۲۶)

اللہ تعالیٰ نے خلیفہ کو ذاتی طور پر فرائض سونپے ہیں اور اُسے جواب دہ بتایا ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا: ”تم میں سے ہر ایک راہی (چرواہا) ہے اور ہر ایک اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے“ ابو یعلیٰ نے بات ختم کرنے ہوئے کہا ہے:

”جب امام، اُمت کے حقوق کا خیال رکھے تو اُمت پر بھی دو فرض عائد ہوتے ہیں۔ اطاعت اور تعاون، جب تک امام سے ایسی کوئی حرکت نہ ہو جو اُسے امامت سے خارج کر دے“

موجودہ دور کے حالات کے مطابق، حاکم کے فرائض یوں ہوں گے:

۱۔ ایسے مسلم معاشرے کا قیام جو اسلام کے مطابق زندگی گزارے اور اپنے تمام معاملات، مسائل اور اداروں یا نظاموں میں اسلام ہی کی پیروی کرے، خواہ وہ معاملات فکر و عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں یا مالی و اقتصادی، اخلاقی و قانونی مسائل ہوں۔

۲۔ ہر اسلام دشمن سے وطن کی حفاظت اور ہر سازش کی، جو اس کی سر زمین کو لپیٹ میں لے، بیخ کنی حاکم کا فرض ہے کہ وہ ہر ممکن وسائل سے سازشوں کا قلع قمع کرے اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ اس مقصد کے لیے اُس سے جو قربانی طلب کی جائے اُسے پیش کرنے میں دریغ نہ کرے۔

۳۔ اسلام کی نشر و اشاعت اور تبلیغ کے لیے گوشش تاکہ اُمت کے دلوں میں اس کے اصول راسخ

ہو جائیں اور اقطار عالم میں تمام انسانوں پر اسلام کی فقہیت واضح ہو۔ امت مسلمہ عقیدے رسالت کی امت ہے۔ بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں اسلام کی تبلیغ اس دور کے حکام کے فرائض سے متعارض نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں بھی تقریباً ہر حکومت، مختلف ذرائع ابلاغ سے اپنے عقائد کو نشر کرتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ روس اور دوسری اشتراکی حکومتیں بھی کسی سے پیچھے نہیں اور اپنے عقیدے کی اشاعت پر بے باخارج کرتی ہیں۔ یہی حال امریکہ وغیرہ کا ہے (اور بھارت جو اپنے آپ کو "لاڈنی" ملک کہتا ہے، ہندومت کی تبلیغ میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا) پھر اسلامی مملکتیں اس فریضے کی ادائیگی سے کیوں شرمائیں اور کیوں جھجکیں۔

۴۔ امت میں عدل و انصاف کا قیام، مظلومین کی دادرسی، ظلم و تعدی کے خلاف قانون کا نفاذ اور کمزور عوام کو دوسروں کے جبر اور بندگی اور جیلہ گری سے آزادی دلانے کی کوشش کسی بھی حاکم کے لیے اپنی مملکت کی حدود میں اور امت اور شہریوں کے لیے انصاف کا قیام سب سے بڑا فرض ہے اور مملکت کی حدود سے باہر مظلوم اقوام کی مدد و نصرت بھی حاکم کا اہم فریضہ ہے کیونکہ اسلام کسی بھی انسان پر ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو اسی لیے مبعوث کیا کہ سب انسانوں کو انصاف ملے اور خاتم الانبیاء کو اس لیے بھیجا کہ لوگوں کو اپنے ہی جیسے انسانوں کی بندگی سے نجات دلا کر صرف اللہ کی بندگی کا سبق دیں، اور دنیا جن پر تنگ ہو گئی ہو انہیں فراخی اور کشادگی اور کئی مذاہب و ادیان کی بجائے صرف اسلام کی انصاف پروری کی چھاؤں فراہم کریں۔

## حاکمِ علی کے حقوق

جب حاکم اپنے مفوضہ فرائض کو پورا کرے اور حکومت کی امانت کا حق ادا کرے، مسلمانوں کے لیے تخلص ہو اور ان میں عدل و مساوات قائم کرے تو عوام کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ حاکم کے حقوق کی پاسداری کریں۔ الماوردی اور دوسرے علمائے سیاست نے امت کے دو فرض بیان کیے ہیں:

- ۱۔ ایسے کاموں اور احکام میں اطاعت، جن میں معصیت نہ ہو۔
- ۲۔ حاکم کی مدد و نصرت، پشت پناہی اور اخلاص۔

## اطاعت

جب حکومت عدل و شوریٰ پر قائم ہو، تو عوام کے لیے لازم ہے کہ وہ حاکم اعلیٰ کی اطاعت کریں۔ اس کے احکام بجا لائیں اور اس سے کشتی نہ کریں۔ جب تک حاکم اسلام کے اصولوں کی پیروی کرتا ہے اور شریعت کی پابندی کرے تو مسلمان شہریوں کے لیے اس کی اطاعت دینی فریضہ بن جاتی ہے۔ یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ حاکم اعلیٰ اور امت کے حقوق پورے کر رہا ہو، پھر بھی اس کی بات نہ مانی جائے، نہ اس کی اطاعت کی جائے۔

قرآن مجید نے اس بات کی تاکید فرمائی ہے:

”لے ایمان والو، اللہ کی اس کے رسول اور اپنے میں سے اولوالامر کی اطاعت کرو“ (النساء: ۵۹)

حاکم اعلیٰ، ان اولوالامر میں سے ہے جن کی اطاعت اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر فرض کی ہے۔ احادیث رسول اللہؐ بھی اس پر زور دیتی ہیں، مثلاً ”صحیح مسلم میں آتا ہے:

”تم پر ہر حال میں، تنگی ہو یا آسانی، پسند ہو یا نہ پسند، یا تمہاری خود غرضی شامل ہو

(حاکم کی بات) سننا اور اسے ماننا لازم ہے۔“

متفق علیہ احادیث میں نبی کریمؐ کا قول ہے:

”ہر مسلمان پر سننا اور اس کی کونافرض ہے، خواہ اسے پسند ہو یا نہ پسند، جب تک

اسے مجبور نہ کر دیا جائے، لیکن اگر اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو اس پر سننا اور

اطاعت کرنا لازم نہیں۔“

گویا اطاعت حتمی فریضہ ہے اور صرف ایک بات اس فرض کی ادائیگی کو معاف کرتی ہے کہ حاکم واضح

طور پر شریعت کے احکام سے انحراف کرے اور اسلام کے اصولوں سے بغاوت کر دے۔ کیونکہ خدا کی نافرمانی

میں مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے خلیفہ بنتے ہی فرمایا:

”اے لوگو! میں تمہارا والی بنا یا گیا ہوں مگر میں تم سے بہتر نہیں۔ اگر تم مجھے حق پر پاؤ

تو میری مدد کرو اور اگر باطل پر پاؤ تو مجھے روک دو۔ جب تک میں اللہ کی اطاعت

کروں تو میری اطاعت کرو اور اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت

لازم نہیں۔“



اگر کسی حاکم سے معمولی غلطی سرزد ہو جائے یا اس کا اجتہاد صحیح ثابت نہ ہو تو اس سے بغاوت درست نہیں کیونکہ وحدتِ امت سب سے اعلیٰ اور اہم ہے رسول اللہ سے مروی ہے کہ:

”حالات میں کئی تبدیلیاں آئیں گی، اگر کوئی شخص اس امت میں تفرقہ ڈالے حالانکہ وہ جماعت ہو تو جس کے بس میں ہو اس کی گردن مار دے۔“

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ:

”جو شخص بغاوت کر کے میری امت میں تفرقہ ڈالے اس کی گردن مار دو۔“

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ:

”جو شخص تمہارے پاس آئے اور کسی ایسے شخص کی اطاعت پر سب کو مجبور کرے جو

تمہاری جمیعت کو پارہ پارہ کر دے یا جماعت میں تفرقہ ڈالے تو اسے قتل کر دو۔“

اب سوال یہ ہے کہ اگر حاکم سیاسی خطا سرزد نہ ہو جماعت کو بغاوت کا جواز فراہم کرے تو کیا کرنا چاہیے؟ اسلام نے خطا کی تصحیح اور انحراف سے بچنے کا طریقہ بتایا کہ حکومت کو شوریٰ کے تابع کر دیا ہے اہل رائے کا فرض ہے کہ وہ بحث و تمحیص کے بعد حاکم اعلیٰ کو خلوص سے مشورہ دیں اس کے لیے پہلے وہ خط و کتابت اور بات چیت سے انرمی کے ساتھ، غلطی کی نشاندہی کریں، اور پھر واضح انحراف پر احتجاج کریں۔ اگر اس سے کام نہ چلے تو بڑی گمراہی اور کج روی کو اعلانِ حق کے ساتھ مسترد کر دیں، خواہ اس کے نتائج کچھ بھی ہوں، نبی کریم نے فرمایا کہ:

”سب سے عمدہ جہاد جابر و ظالم سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے۔“

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ:

”جو تم میں سے کسی بُرائی کو دیکھے تو ہاتھ سے اسے زوک دے، اگر اس کی طاقت نہ ہو، تو

زبان سے ہٹائے اور اگر یہ مقدور بھی نہ ہو تو دل میں اسے بُرا سمجھے اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔“

اطاعت کا عہد توڑنے اور حاکم اعلیٰ کے خلاف بغاوت کرنے کے بارے میں ہم بعد میں ذکر کریں گے علامہ محمد اسد نے اپنی کتاب ”منہاج الاسلام فی الحکم“ میں جو اس موضوع پر آیات و احادیث کا مجموعہ ہے، چار باتیں پیش کی ہیں:

۱۔ جو حکمران مملکت میں شرعی حکومت کا نمائندہ ہو، وہ تمام شہریوں سے اطاعت کا حق تو دار ہے

قطع نظر اس بات سے کہ ان میں سے کوئی فریق یا فرد اسے پسند نہ کرتا ہو یا حکومت چلانے کی

سیاست سے اختلاف رکھتا ہو۔

ب۔ اگر حکومت ایسے قوانین یا احکام جاری کرے جن سے شریعت کی صریح معصیت واقع ہوتی ہو، تو شہریوں پر ان قوانین و احکام کا ماننا اور ان پر عمل کرنا واجب نہیں۔

ج۔ جب حکومت کوئی ایسا موقف اختیار کرے جو صریحاً نص قرآنی سے متعارض ہو، اور اگر یہ موقف واضح طور پر کفر کا اظہار کرتا ہو تو لازم ہے کہ اختیار اس سے چھین لیا جائے اور ایسی حکومت کو ہٹا دیا جائے۔

د۔ جب اختیار ایسی حکومت سے چھینا جائے تو یہ لازم ہے کہ عوام کی اقلیت کی طرف سے مسلح انقلاب نہ لایا جائے۔ کیونکہ رسول اللہ نے اس طریقے کا استعمال منع فرمایا ہے اور کہا ہے:

”جو ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم سے سے نہیں“

اور یہ بھی فرمایا کہ:

”جو ہم پر تلوار سونت لے وہ ہم میں سے نہیں“

## ۲۔ حاکم کی مدد و نصرت

اگر حاکم اپنے فرائض دیانت داری سے ادا کر رہا ہو، رعیت میں عدل و انصاف قائم ہو، شوریٰ پر عمل ہو، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ضمانت ہو اور جملہ مبادیٰ اسلام نافذ ہوں تو اُمت پر فرض ہے کہ اس کی اطاعت کرے، اس سے تعاون کرے۔ اور اس کی پشت پناہ ہو، بالخصوص اس وقت جب کوئی شخص حکومت کے خلاف بغاوت کرے، اطاعت سے منحرف ہو اور مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا چاہتا ہو جس سے دولت اسلامیہ کی تباہی و بربادی کا امکان ہو، اسلام کے نزدیک جو کسی وجہ کے بغیر اطاعت سے انحراف کرے، مفسدہ پرداز ہے اور خدا، رسول اور مسلمانوں کا دشمن ہے۔ حاکم کے لیے لازم ہے کہ وہ ایسے شخص کو راہ راست پر لائے اور اُمت پر بھی فرض ہے کہ ایسے کام میں حاکم کی مدد کرے۔

جب حاکم اور عوام کے درمیان مضبوط رشتہ پیدا ہو جائے، اور ان میں کامل ہم آہنگی ہو، حکومت میں مشورہ اور ہدایت کو اہمیت حاصل ہو کہ اللہ کا قانون نافذ ہو جائے اور لوگوں میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو، تو اسلام نے عوام پر فرض کیا ہے کہ اگر وہ اجتہاد میں غلطی کرے تو اسے صحیح مشورہ دیں یا اسلام کے اصولوں کی مخالفت کا اظہار ہو تو اس کی اصلاح کر دیں۔ انسان کا مرتبہ اور قدر و قیمت کیسی ہی

کیوں نہ ہو، اس کا علم کتنا ہی پختہ کیوں نہ ہو اور اسے معاملات سے نمٹنے کا کتنا ہی سلیقہ کیوں نہ ہو، کبھی نہ کبھی غلطی اور لغزش کا امکان ضرور ہے۔ عیب کی بات یہ نہیں کہ انسان غلطی کرے۔ عیب کی بات یہ ہے کہ تلبیہ اور توجیہ کے بعد بھی غلطی کا اعادہ کرے۔ اسلام نے اسی لیے غور و فکر اور جرح و تشدید کی آزادی پر زور دیا ہے کہ مسلمان اس اہم فریضے سے غافل نہ ہو، یعنی حکمرانوں کے لیے صحیح مشورہ اور تلبیہ۔ اگر مسلمان اس فرض کو کا حق ادا کرنے میں نہیں تو حکومت پائیدار ہوگی اور مملکت مضبوط اور انسان کو اپنے بنیادی حقوق کا تحفظ حاصل ہوگا اور اسے اپنے فرائض سے بھی آگاہی ہوگی۔ حدیث میں آیا ہے کہ: "وین نصیحت اور خیر خواہی کا نام ہے۔" آپ سے سوال کیا گیا کہ: "خیر خواہی کس کے لیے؟" آپ نے فرمایا: "اللہ، اس کے رسول، اس کی کتاب، مسلمانوں کے حکمرانوں اور عوام کے لیے۔"

خیر خواہی سے مراد یہ نہیں کہ ہر گناہ صغیرہ یا بھڑائی چھوٹی غلطی پر حاکم کے خلاف بغاوت کر دی جائے۔ اسلام اس قسم کے سخت قدم کی اجازت صرف اس صورت میں دیتا ہے جب مسلمان حکمران کو راہ راست پر لانے اور غلطی کی اصلاح کے تمام ذرائع مسدود ہو چکے ہوں، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انتہا کو پہنچ چکی ہو، کیونکہ رسول اللہ نے فرمایا:

"ظالم سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔"

اور یہ اسی وقت مناسب ہے جب نرمی اور حسن سلوک سے اصلاح ممکن نہ رہی ہو۔

ہماری تاریخ میں ایسے جرات آمیز واقعات کی کمی نہیں جب مسلمانوں اور علمائے باعمل نے کسی حکمران کو اس راہ سے بھٹکتے ہوئے دیکھا جو اسلام نے بتایا ہے تو اسے واضح طور پر تلبیہ کی اور اس کے سامنے حق بات کہنے سے قطعاً دریغ نہ کیا۔

## حاکم اعلیٰ کے عہدے کی مدت

قدیم و جدید نظام ہائے سیاست، حاکم اعلیٰ کے عہدے کی مدت کے بارے میں دو رائے رکھتے ہیں: اول وہ جو اسے ایک مقررہ مدت کے لیے منتخب کرنے کے حق میں ہیں (خواہ وہ مدت قلیل ہو طویل) اور دوسرے وہ ہیں جو حاکم اعلیٰ کو اس کی زندگی تک کے لیے مقرر کرنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک اسلامی نظام کا تعلق ہے جو قرآن و سنت میں اس کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں آئی اس کا اختیار مسلمانوں کو سونپ دیا گیا ہے کہ وہ حالات و ضروریات، ماحول، معاشرے کی پستد اور امور عامہ

سے اس کی دل چسپی کے مطابق فیصلہ کریں۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے ابتدائے خلافت سے سلطنت عثمانیہ کی انتہا تک دوسری بارے یعنی مدت العمر کے لیے انتخاب یا تقرری کو اپنا یا، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا اسلامی نظام میں کسی گڑبڑ کے بغیر حاکم کو ہٹانے کا کوئی طریقہ ہے؟ کیا مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ظالم حاکم کا ظلم برداشت کرنے چلے جائیں۔ یا وہ دیوانہ ہو تو اس کی دیوانگی پر کچھ نہ کریں؟ کیا حکمران کے لیے بھی پابندی ہے کہ وہ حکمرانی سے خود ہی دامن چھڑانا چاہتا ہو تو ہٹ نہ سکے؟ اس سلسلے میں تین سوال پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ کیا حاکم اعلیٰ خود اپنے عہدے سے ہٹ سکتا ہے یا مستعفی ہو سکتا ہے؟

۲۔ کیا امت کو اجازت ہے کہ وہ کسی حکمران کو ہٹا دے یا معزول کر دے؟

۳۔ اگر ایسا ہو تو امت کو کن حالات میں اس کی اجازت ہوگی؟

جہاں تک حکمران کے خود مستعفی ہونے کا تعلق ہے تو علم سیاست کے ماہرین اس کے بارے میں بھی دو رائیں رکھتے ہیں: بعض حاکم اعلیٰ کو اس کی اجازت دیتے ہیں اور بعض دوسرے اس کی اجازت نہیں دیتے۔ دونوں فریق تاریخ اسلامی سے استدلال دیتے ہیں۔

جو لوگ حکمران کو مستعفی ہونے کی اجازت دیتے ہیں وہ حسن بن علیؓ کی مثال دیتے ہیں جنہوں نے معاویہؓ بن ابوسفیان کے حق میں خلافت چھوڑ دی تھی حضرت حسنؓ نے بڑی دانائی سے حالات کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ ان کے ارد گرد جتنے امراء اور سرداران لشکر تھے، ان کی مدد کرنے سے قاصر تھے اور ان کی اطاعت نہ لیتی جس پر وہ بھروسہ کر سکتے۔ وہ سب لوگ متردد اور بائیں بنانے والے تھے، عمل کے لحاظ سے کورسے تھے۔ پھر انہوں نے معاویہؓ کے دربار پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ اس کے اہالی موالی، سختی و نرمی میں ان پر جان فدا کرنے پر آمادہ تھے۔ وہ معاویہؓ کے کسی حکم سے روگردانی نہ کرتے اور جو کچھ ان سے کہا جاتا اس پر بھرت نہ کرتے۔ حسنؓ کے ارد گرد لوگ گروہوں اور قرقوں میں بٹے ہوئے تھے جبکہ معاویہؓ کے ماتحت ایک جان تھے۔ جب معاویہؓ نے حضرت حسنؓ سے کہا کہ مسلمانوں کی نحوں ریزی سے بچتے اور ان کی گم شدہ جمعیت دوحضرت کو واپس لانے کے لیے حسنؓ خلافت سے دستبردار ہو جائیں تو انہوں نے مان لیا اور لشکر میں خلافت سے الگ ہو گئے۔ اس سال کو تاریخ اسلامی میں "عام الجماعة" (جمعیت کا سال) کہا جاتا ہے۔

جو لوگ حکمران کے دستبردار ہونے کے خلاف ہیں وہ حضرتؓ کے موقف کو پیش کرتے ہیں کہ جب

ان سے مدیترہ پر قابض لشکریوں نے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ ہم اس حادثے کے اسباب بیان کرتے ہوئے پہلے کہہ چکے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے یہ موقف اس لیے اختیار کیا کہ سازشی اور غارتگر افراد شریعی حکومت کو ختم کرنے کے عادی نہ ہو جائیں، اس لیے اس حادثہ کا حصہ کوان لوگوں کی رائے کے لیے حجت نہیں مانا جاسکتا۔

ہماری رائے میں حاکم اعلیٰ کوئی بھی سیاسی موقف اختیار کرنے میں آزاد ہے، اگر وہ محسوس کرے کہ وہ حکومت کا بوجھ اٹھانے پر قادر نہیں تو اسے حکومت کرتے رہنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے، بلکہ مصلحت یہی ہے کہ ہم اسے مجبور نہ کرے کیونکہ جو انسان اتنے اعلیٰ مقام پر پہنچا ہو وہ کسی خاص سبب ہی سے یہ موقف اختیار کرے گا۔

مسلمان علماء نے غیر صالح حکمران کو معزول کرنے کے بارے میں بھی بحث کی ہے، اور کہا ہے کہ بعض حالات میں اسے معزول کرنا جائز ہے، حاکم اعلیٰ بننے کے لیے چند شرائط ضروری ہیں، اگر حاکم اعلیٰ کسی وقت بھی ان شرائط سے، یا کسی ایک اہم شرط سے انحراف کرے تو اسے معزول کیا جاسکتا ہے۔  
الماءوردی اور قاضی ابوالعلاء الفراء نے کہا ہے کہ دو باتیں حکمران کی معزولی کو جائز بناتی ہیں: اس کا انصاف مجروح ہو چکا ہو (یعنی وہ انصاف سے عاری ہو اور اس میں کوئی جسمانی نقص پیدا ہو جائے) انصاف سے عاری ہونے یا فسق و فجور میں مبتلا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عملاً شہوات میں پڑ جائے یا شریعت کی حرام کی ہوئی باتوں کا عادی ہو جائے یا ان کا حکم دے اور اعتقاداً حق اور اسلام کے بنیادی اصولوں اور اس کے نظام کی مخالفت کا اظہار کرے۔

جسمانی نقص سے مراد یہ ہے کہ اس کے جو اس و اعضاء میں ایسی خرابی پیدا ہو جائے جو اس کے حکومت کرنے میں حائل ہو، مثلاً وہ دیوانہ ہو جائے یا اس کے جو اس کام کرنا چھوڑ دیں۔  
جب حکمران معزولی کا مستحق ہو جائے تو اسے معزول کرنے کے وجوب کے بارے میں بھی مسلمان علماء سیاست کی مختلف رائیں ہیں۔ وہ اس بات پر تو متفق ہیں کہ معزولی کے مستحق حکمران کو جب بھی ممکن ہو ہٹا دینا چاہیے مگر ان کے مد نظر یہ بھی ہے کہ وحدتِ امت پارہ پارہ نہ ہو اور فتنہ و فساد پیدا نہ ہو۔ اسلام میں بنیادی اصول امام کی اطاعت ہے۔ اختلاف اس بات پر ہے کہ کسی غیر صالح حکمران کے خلاف بغاوت جائز ہے یا نہیں اور اگر حالات کا تقاضا ہو تو اس کے خلاف طاعت کا استعمال یا ہتھیار اٹھانا مناسب ہے، یا محض اسے سمجھانا کافی ہے یا اسے نرمی سے سیدھے راستے پر ڈالنا چاہیے یا

اُس کی برائیوں اور سختیوں پر صبر کرنا چاہیے

شاید اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ نبی کریمؐ سے جو صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں صبر کی تلقین کی گئی اور حکمرانوں یا اماموں سے اختلاف سے منع فرمایا گیا ہے، سوائے اس کے کہ وہ صریح کفر اختیار کر لیں۔ تاریخ میں البتہ شواہد موجود ہیں کہ بعض مسلمانوں نے اموی خلفاء کے خلاف بغاوت کر دی مگر اس وقت بھی بعض دوسرے مسلمانوں نے بغاوت سے روکا اور فتنہ و فساد سے الگ رہے کیونکہ ان کے نزدیک وحدتِ امت کا لحاظ ضروری تھا اور کم تر خرابی یا نقصان کو اختیار کیا۔

اسی طرح بعض مسلمان علمائے معزولی کے مستحق امام کے خلاف بغاوت کو جائز قرار دیا اور بعض دوسروں نے اس سے منع کیا ہے۔ جن لوگوں نے بغاوت کو جائز نہیں سمجھا انہوں نے ان احادیثِ رسول پر اعتماد کیا ہے جن میں صبر و اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور سوائے کفر صریح کی حالت کے بغاوت سے منع کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے:

”جس نے اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا تو قیامت کے دن وہ اللہ سے اس حالت میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی عذر نہ ہوگا“

یہ بھی مروی ہے کہ:

”جو اپنے امیر میں کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو اُسے اس پر صبر کرنا چاہیے کیونکہ اگر اُس نے سلطان سے بالشت بھر مخالفت بھی کی اور اسی حالت میں مر گیا تو گویا جاہلیت کی موت مرا“

جن لوگوں نے معزولی کے مستحق حاکم کے خلاف بغاوت کو واجب قرار دیا ہے کہ اس کی زیادتیوں پر صبر کو گناہ بتایا ہے تو انہوں نے ان آیات و احادیث سے من حیث الكل استنباط کیا ہے جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید کی گئی ہے اور گناہ اور زیادتی پر عدم تعاون کا حکم دیا گیا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

”ولتكن منكم امة..... وينهون عن المنكر“ (آل عمران - ۳: ۱۰۴) یا

”وتعاونوا على البر..... على الاثم والعدوان“ (المائدہ - ۵: ۲)

ہر مسلمان جانتا ہے کہ کسی مسلمان کا یا ذاتی کا مال چھینا یا بے سبب اُسے مارنا یا اللہ نے جس بات کا حکم نہیں دیا، اُس کا حکم دیا، گناہ اور زیادتی ہے جسے دور کرتا اور اس کے خلاف ٹوٹ جانا قریضہ ہے۔

احادیث میں آیا ہے:  
 ”جو شخص کسی بے مانی کو دیکھے تو اُسے ہاتھ سے روکے، اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان  
 سے روکے اور اگر اس کی استطاعت بھی نہ ہو تو اُسے دل سے بُرا جانے مگر یہ کمزور ترین  
 ایمان ہے۔“

یہ بھی وارد ہوا ہے کہ:

”معصیتِ خداوندی میں اطاعت لازم نہیں۔“

یا آپ نے فرمایا:

”جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتا ہو امارا گیا وہ شہید ہے، جو اپنے دین کے دفاع  
 میں مارا گیا وہ شہید ہے، جو کسی ظلم کے خلاف کے آواز اٹھانے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے۔“

اور آپ نے یہ بھی فرمایا:

”ظالم سلطان کے سامنے کلمہ حق کہتا سب سے بڑا جہاد ہے۔“

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں کئی احادیث صحیحہ ایسی ملتی ہیں جن میں صبر کی تلقین کی گئی ہے۔  
 اور بغاوت سے منع فرمایا گیا ہے۔ اور کچھ ایسی ہیں جس میں ظالم حاکم کا مؤاخذہ کرنے اور اس  
 کے خلاف آواز بلند کرنے کا حکم بھی ہے۔ کیا اسے تناقص سمجھا جائے اور ہم اس بظاہر تعارض سے  
 کیسے نکل سکتے ہیں؟ امام ابن حزم نے واضح کیا ہے کہ ان احادیث میں ناسخ و منسوخ ہیں، یعنی ان کے نزدیک  
 جن احادیث میں ظلم کو روکنے اور ظالم حاکم کے خلاف بغاوت کرنے کا حکم ہے، وہ پہلی حدیث سے بعد کی  
 ہیں اور اس لیے ان کی ناسخ ہیں، یعنی صبر کرنے اور ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھانے کی احادیث منسوخ ہیں۔  
 اس طرح ان احادیث میں کوئی تعارض یا تناقض نہیں رہتا۔

درحقیقت یہی رٹے زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہ رائے امتِ اسلامیہ کی فطرت سے مناسبت رکھتی  
 ہے جس کے بارے میں کتاب اللہ نے بھی یہی کہا کہ یہ بہترین اُمت ہے کیونکہ نبی کا حکم دیتی ہے اور  
 بُرائی سے روکتی ہے۔ اسلام، جس کی کتاب کہتی ہے کہ ”تمام عزت اللہ اور اس کے رسول کی ہے“، اس  
 بات کو گوارا نہیں کرتا کہ مسلمان ذلت کی زندگی گزاریں یا ظلم کے سامنے گردن جھکا دیں، خواہ یہ ظلم ان میں سے  
 اپنے حاکم کریں یا اجنبی حاکم۔

لازم یہ ہے کہ حاکم کو پہلے نصیحت، مواعظت اور تہذیب سے راہِ راست پر لایا جائے، پھر یہ یقین کیا جائے

کہ ظالم حاکم خلاف کے خلاف بغاوت سے کوئی بڑا نقصان یافتہ برپا نہ ہوگا کیونکہ اہل حق کا ساتھ چند لوگ ہی دیتے ہیں۔ یہ بھی جان لینا چاہیے کہ پیش آئندہ معرکہ برابر کا نہیں ہوگا اور اس سے مسلمانوں میں بڑی خوں ریزی یا اختلاف پیدا ہو سکتا ہے۔ اہمیت کے لیے بغاوت کا فیصلہ اسی وقت صحیح ہوگا جب اُسے ظالم حاکم کے خلاف کامیابی کا پورا یقین ہو، یا لگان غالب ہو کہ وہ اُسے ہٹانے پر قادر ہے۔

## بین الاقوامی تعلقات اور شہریوں و غیر شہریوں کے حقوق

اسلام میں سیاسی تنظیم کی صورت واضح کرنے کے لیے ان دو معاملات پر اظہار خیال بھی ضروری ہے۔ اسلام سے پہلے، بین الاقوامی تعلقات بالعموم مختصرت اور مخالفت پر مبنی تھے اور ان میں جنگ کا قانون رائج تھا کہ جو جو طاقتور ہو وہ کمزور پر قوت اور غلبہ پالے۔ اسلام نے تمام انسانیت کی فلاح کے لیے قوانین طے کیے جو تمام غیر مذہب قوانین کی جگہ نافذ ہوئے اور اسی سلسلے میں بین الاقوامی تعلقات بھی نئی بنیادوں پر استوار ہوئے۔

اسلام نے جو بنیادی اصول مقرر کیے وہ انسان کے انفرادی اور اجتماعی دونوں تعلقات کے بارے میں تھے۔ ان میں سے اہم یہ تھے: تکریم انسانیت، انصاف، مساوات، حریت، وقار، عہد، برابر کا معاملہ درگزر، تعاون اور فتنہ و فساد کی روک تھام۔ اسلام نے امن و صلح کو بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد بنایا، جنگ کو نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ... خطوات الشيطان (البقرہ: ۲۰۸)

اور فَإِنِ اعْتَدَوْكُمْ... فَمَا حَبَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَيِّئًا. (النساء: ۹۰)

اس سلسلے میں ضروری ہے کہ اس بہتان اور افتراء کو دور کیا جائے جو بالعموم دشمنان اسلام پر لگانے ہیں اور جسے بعض کم عقل دہراتے رہتے ہیں، یعنی یہ کہ ”اسلام تلوار کے زور پر پھیلا“ اور یہ کہ ”اسلام سوانے آسن و آتش کے بین الاقوامی تعلقات میں اور کوئی راستہ نہیں سمجھاتا“۔

یہ سب لغو باتیں ہیں۔ اسلام صرف تلوار ہی سے نہیں پھیلا، نہ اس نے دوسروں کے خلاف محض ظلم کی خاطر ہتھیار اٹھائے۔ اسلام میں جنگ کرنے کے اسباب شرع نے بیان کر دیئے ہیں، جو تین سے زیادہ نہیں ہیں۔



۱۔ مملکت اسلامی اور مسلمانوں کے خلاف حقیقت میں واقع ہونے والی محاذ آرائی کو روکنا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

وقاتلو فی سبیل اللہ.... المعتدین ۵..... وقاتلوہم حتی لا یبقوا قتلۃ

..... ان اللہ مع المتقین ۵ (البقرہ: ۱۹۰، ۱۹۳، ۱۹۴)

اور: واخذن للذین یقاتلون.... علی نصرہم لقتیلہ (الحج: ۳۹)

اس قسم کی جنگیں تو تمام قزاقین اور تمام معاشرہ میں جائز ہیں۔

۲۔ مملکت کو متوقع محاذ آرائی اور حملے سے بچانے کے لیے جنگ۔ یہ اس صورت میں جب مسلمانوں کو پورا یقین ہو جائے کہ کوئی دوسرا یا دوسرے ملک مل کر مملکت اسلامی کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں ایسی حالت میں مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ ہاتھ باندھے بیٹھے رہیں اور دشمن انہیں اچکے لے کر ان کے لیے واجب ہے کہ وہ دشمن کا سر اسی کے بل میں کچل دیں جو قوم اپنے ہی ملک میں لڑتی ہے وہ خوار و زلیل ہوتی ہے۔ یہ عمل ہر اس قوم کا ہے جسے اپنے خلاف جنگ کا خطرہ ہوتا ہے۔

۳۔ ان غیر اسلامی حکومتوں کے مسلمانوں کے عقیدے پر حملے کو روکنے کے لیے جنگ جو ان کے اپنے ہی ملک میں قائم ہو جائیں، اور اسلام کی نشر و اشاعت پر پابندیاں عائد کر دیں۔ مملکت اسلامی، اپنی رعایا، میں سے غیر مسلموں کو اپنے طریقے پر عبادت کرنے اور عقائد کی پابندی کرنے سے منع نہیں کرتی اسلامی تاریخ

میں، ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ غیر مذاہب اپنے مذہب پر کاربند رہنے سے روکا گیا ہو کیونکہ اسلامی معاشرہ اعتقاد اور مذہب کی آزادی کا علمبردار ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو دوسری حکومتوں کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ مسلمانوں سے برابر کا سلوک کریں اور ان کے عقیدے، دین اور تبلیغ اسلام کے رستے میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔ اگر دوسری حکومتیں ایسا کریں گی تو گویا وہ بین الاقوامی معاہدات کی خلاف ورزی کریں گی۔ اس صورت میں مسلمانوں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ عقیدے پر ہونے والے حملے کو روکیں۔

تغواہ اس کے لیے ہتھیار ہی کیوں نہ اٹھانے پڑیں۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ دین کو ملتے سے اور عقیدے کو فنا ہونے سے بچایا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دعوت الی اللہ دینے کی آزادی بااخلاص داعیوں کو پوری طرح بہم پہنچائی جائے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اس کے پاس ساری انسانیت کی ہدایت کے لیے پیغام ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ اس پیغام کو لوگوں تک پہنچائے اور لوگوں کو اس کی طرف بلائے اس کی تائید اسلامی تاریخ سے بخوبی ہوتی ہے۔ اگر نبی کریم کے تمام عنوات و سرایا پر نظر ڈالی جائے تو واضح

ہونا ہے کہ حضورؐ کے کسی پرزیدنی نہیں کی بلکہ آپؐ پر زیادتی کی جاتی رہی۔ مثلاً غزوہ بدر کا اصل ہدف جنگ نہ تھا بلکہ بعض مسلمانوں کے ان اموال کو چھڑانا تھا جو قریش نے غصب کر رکھے تھے اتفاق سے وہ قافلہ بچ نکلا جو مال لے کر جا رہا تھا۔ مشرکین کے امکان میں تھا کہ اس نجات پر قناعت کرتے اور جنگ کے لیے نہ اُجھارتے، مگر انہوں نے بڑی دھرمی دکھائی، دھوم دھڑلے سے بدر پر پہنچے، خوب شراب پی اور مسلمانوں کو لٹکارا۔ اس لحاظ سے غزوہ بدر مسلمانوں پر زبردستی عائد کر دیا گیا۔ جہاں تک غزوہ احد کا تعلق ہے، تو یہ بات واضح ہے کہ اس کا مقصد اس جنگ کو روکنا تھا جو مشرکین نے جبراً مسلمانوں کے خلاف شروع کی تھی۔ وہ ٹھٹھ کے ٹھٹھ باندھ کر مینے پر چڑھ آئے تھے اور نہ صرف بدر کے مفتولین کا بلکہ لینا چاہتے تھے بلکہ نئی قائم شدہ اسلامی مملکت کو ابتداء ہی میں کھیل دینا چاہتے تھے۔ مسلمانوں نے ان کے حملے کو روکنے کے لیے لشکر کشی کی۔ اسی طرح غزوہ خندق میں ہوا۔ جہاں تک اُن سرایا کا تعلق ہے جو نبی اکرمؐ نے رومی سلطنت کے خلاف روانہ کیے تو وہ اس لیے تھے کہ غسانی اور رومی جزیرہ العرب کے شمال میں بسنے والے ان قبائل کو پریشان کر رہے تھے جو مسلمان ہو گئے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا کہ وہ سب کے سب مشرکین کے ساتھ جنگ کریں جس طرح وہ سب کے سب مسلمانوں سے جنگ کرتے ہیں اور اُن کے صلح کے تمام ذرائع، مثلاً صلح حدیبیہ، مسدود ہو چکے تھے۔ بیان پر عمل نہ ہوا تھا۔ مشرکین نے ہر طرح سے مسلمانوں کو تنگ کرتے اور ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے، حالانکہ مسلمان اس حال میں نہ تھے کہ وہ مشرکین کے خلاف اعلان جنگ کریں۔ سلطنت فارس اور سلطنت روم اور مسلمانوں کے درمیان جنگیں بھی اسی بنا پر شروع ہوئیں کہ عیسائی وغیرہ مسلمانوں کو یکسر مٹا دینے پر آمادہ تھے۔

ان ممالک میں مسلمان طاقت سے اسلام پھیلانے کے لیے داخل نہیں ہوئے تھے۔ یہ بات تاریخی طور پر بھی اور موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے بھی صحیح ہے۔ مسلمانوں کے کسی شخص کو مجبور نہیں کیا کہ وہ اپنا دین ترک کر کے اسلام قبول کر لے۔ نہ انہوں نے غیر مسلموں کے معبدوں کو تباہ کیا۔ اس بات پر وہ معاہدے شامد ہیں جو مسلمان خلفاء اور ان کے سرداروں نے بلادِ مفتوحہ کے ساکنین کے ساتھ کیے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مسلمان جن جن ممالک میں داخل ہوئے ان میں اب بھی غیر مسلم کثرت سے ہیں۔ مسلمان جب اعلیٰ کلمۃ اللہ کے لیے اور خدا کی راہ میں جہاد کرتے تھے تو ان کا مقصد ایسا ماحول پیدا کرنا ہوتا تھا۔ جہاں دعوتِ اسلامی کی اجازت ہو اور ان کا راستہ نہ روکا جائے۔ جہاں

ہمک عقیدے کا تعلق ہے تو اس پر جبر و اکراہ سے عمل نہیں کرایا جاسکتا۔

”انک لاتلہدی من احببت“ (اُپ جیسے چاہیں اُسے ہدایت نہیں دے سکتے)

(القصص ۲۸: ۵۶)

علماء اور فقہائے اسلام نے آیت قرآنی:

”لا اکراہ فی الدین“ (دین میں کوئی جبر نہیں، ہدایت گمراہی

سے الگ اور واضح ہو چکی ہے۔) (البقرہ ۲: ۲۵۶)

کے حوالے سے تین نظریے پیش کیے ہیں:

۱۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے کیونکہ نبی کریمؐ جزیرہ عرب میں اسلام کے سوا کوئی دین پسند نہ کرتے تھے۔

۲۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ منسوخ نہیں ہوئی بلکہ یہ اہل کتاب سے مخصوص ہے جبکہ رسول اللہؐ کے اہل یمین کے نام مکتوب سے واضح ہے کہ ”یہودیوں یا نصرا نیوں میں سے جس کو اسلام قبول کرنے کے لیے مجبور کیا گیا تو وہ اپنے ہی دین پر رہا۔“

۳۔ پندرہم اگر وہ یہ کہتا ہے کہ یہ آیت نہ منسوخ ہے نہ مخصوص۔ اس رائے کے حامی امام رازی، (تفسیر)، ابن تیمیہ (رسالۃ التفتال)، ابن کثیر، طبری، آلوسی، حصّاص، البوہیان وغیرہ ہیں۔

## دنیا کی ”دارالاسلام“، ”دارالحرب“ اور ”دارالعمد“ میں تقسیم

فقہاء نے دنیا کو تین قسم کی مملکتوں میں تقسیم کیا ہے:

- ۱۔ دارالاسلام (اسلامی مملکتیں)
- ۲۔ دارالحرب (اسلام دشمن مملکتیں)
- ۳۔ دارالعمد (مسلمانوں کی حلیف مملکتیں)

یہ تقسیم قرآن، سنت میں وارد نہیں ہوئی، بلکہ مسلمان علماء نے اُن حالات کو عملاً دیکھتے ہوئے کی جن میں مسلمان زندگی گزار رہے ہیں۔ اس لیے اس میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔ یہ تقسیم اختلاف مذاہب کا بناء پر نہیں بلکہ اس کا تعلق حالت امن یا حالت خوف سے ہے جو مسلمانوں کو کسی مملکت یا مملکتوں کو درپیش ہوا ہے۔

جہاں تک دارالاسلام کا تعلق ہے تو اس میں وہ تمام ممالک و بلا و داخل ہیں جو اسلام کے اقتدار کے ماتحت ہیں، جن میں اس کے احکام نافذ ہوتے ہیں اور حد و وقائم ہوتی ہیں۔ مسلمانوں پر اس کا دفاع فرض کفایہ یا فرض عین کی حیثیت سے واجب ہے۔ کسی اسلامی مملکت پر غیر ملکی قبضے سے اس کے دفاع کی خاطر جہاد و سافظ نہیں ہو جاتا خواہ اس میں کتنا ہی عرصہ گزر جائے (جس طرح مثلاً فلسطین اور افغانستان) دارالاسلام کو "دارالعدل" بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ بات فرض کر لی جائے گی کہ اس مملکت کی اساس عدل پر قائم ہوگی۔ اس طرح "دارالتوحید" کے مقابل "دارالشک" ہے۔

اور دارالحرب وہ ممالک ہیں جن میں اسلام کے احکام و نبی و سیاسی نافذ نہیں ہوتے اور جو اسلامی اقتدار سے خارج ہیں۔ یہ وہ ممالک ہیں جن کے حکمران مسلمان نہیں اور نہ ان میں احکام شریعت چلتے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ صرف یہی وجہ امتیاز ان ممالک کو ایسے بلا و نہیں قرار دیتی جو مسلمانوں سے آماجہ پیکار ہوں۔ بعض مسلمان فقہانے کسی مملکت کو "دارالحرب" قرار دینے کے لیے تین شرائط مقرر کی ہیں:

۱۔ مذکورہ بالا اختلاف نظام حکومت و شریعت

۲۔ دارالاسلام سے ہمسائیگی (کہ سرحدیں ملتی ہوں)

۳۔ یہ کہ وہاں کے مسلمان باشندوں کی جان و مال، عزت اور دین محفوظ نہ ہوں۔

جو مملکت تیسری شرط پر بالخصوص پوری اترتی ہو، تو وہ لے شک و شبہ دولت اسلامیہ کی دشمن محارب مملکت سمجھی جائے گی۔ جہاں تک مجاورت یا ہمسائیگی کا تعلق ہے کہ عصر حاضر میں یہ لازمی نہیں رہی کیونکہ حقوق مشترک نہ ہونے کے باوجود عداوت ہو سکتی ہے کیونکہ لب و مسائل حرب اور تباہ کن آلات میں خاصی پیش رفت ہو چکی ہے۔

"دارالعمد" میں وہ مملکتیں ہیں جہاں مسلمانوں نے قبضہ نہ کیا ہو مگر انہوں نے وہاں کی حکومت اور باشندوں سے معاہدہ صلح کر رکھا ہو، اس معاہدے کی اہم شرط یہ ہوتی ہے کہ معاہدہ مملکت، مسلمان حکومت کو سالانہ تاوان ادا کرے گی، جسے "خراج" کہا جاتا ہے۔ اس شرط کو خذف بھی کیا جاسکتا ہے مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ وہ معاہدہ مملکت کا دفاع کریں جس طرح معاہدہ بن ابی سفیان کے عہد میں

آرمینیا کے ساتھ معاہدے میں درج تھا۔ ”دارالہند“ کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اسلامی قوانین و شریعت کا یا بند ہو، اور اُسے اپنی حکومت اور اپنا اقتدار برقرار رکھنے کی آزادی ہوتی ہے بشرطیکہ وہ مسلمانوں اور مملکت اسلامی کے مفادات کو ضرر نہ پہنچائے۔

مسلمان فقہانے جب دنیا کی ان تین منطوقوں میں تقسیم کی تھی تو وہ اپنے دور کے حالات سے مجبور ہو گئے تھے کیونکہ بعض قرون میں ساری کی ساری دنیا ہی مسلمانوں کے ساتھ آمادہ جنگ تھی۔ بہر حال اس تقسیم کا اسلام کے اعلیٰ مثالوں پر کوئی اثر واقع نہیں ہوتا اور نہ اس بات پر کہ اسلام کے نزدیک بین الاقوامی تعلقات کا بنیادی اصول امن ہے، جنگ نہیں۔

### دولتِ اسلام میں شہریوں اور غیر ملکوں کے حقوق

اسلام سے قبل، اس وقت کی مشہور سلطنتوں میں کسی غیر ملکی کو کوئی حقوق حاصل نہ تھے کیونکہ ہر مملکت اپنے شہریوں کے سوا ہر ایک کو مخالف اور دشمن سمجھتی تھی اور اس لیے غیر ملکوں کو دشمن سمجھا جاتا تھا اور ان سے وہی سلوک ہوتا تھا۔ اسلام نے جس طرح بین الاقوامی معاملات میں انسانیت اور امن کو فروغ دیا، اسی طرح اسلامی مملکت کے افراد کے ساتھ مراسم کو بھی انہیں اصولوں کے تابع کیا جو وہ وہ افراد اس کے اپنے شہری ہوں یا غیر ملکی، مسلمان ہوں یا غیر مسلمان، اسلام نے درگزر میں ایسی رفعت پائی کہ کوئی ”مشرک حربی“ بھی دارالسلام میں داخل ہو جاتا تو مسلمان کو اجازت نہ تھی کہ اس سے بُرا سلوک کریں، بلکہ اسلام کا بنیادی اصول یہ تھا کہ حاکم اعلیٰ (یا اس کے نائب) کا فرض ہے کہ وہ اس مشرک حربی کی حفاظت کرے تا آنکہ وہ محفوظ جگہ پہنچ جائے۔ قرآن مجید کا حکم ہے:

”ان احد من المشركين استجدادك فاجره حتى يبيع كلام الله ثم ابلغه مأمنا“  
(اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ کا طلبگار ہو تو اسے پناہ دو یہاں تک کہ وہ کلام اللہ

سن لے اور پھر اُسے اس کی محفوظ جگہ پر پہنچا دو۔ النورہ ۹: ۷)

اس لیے ضروری ہے کہ ہم شہریوں اور غیر ملکوں کے احوال پر ایک اجمالی نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ انہیں دولتِ اسلامیہ کی حدود میں کیا فوائد حاصل ہیں:

مسلمان فقہانے دولتِ اسلامیہ کے باشندوں کو تین انواع میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ مسلمان

۲۔ ذمی

۳۔ امان کے طلبگار (المستامنون)

ان میں سے مسلمانوں اور ذمیوں کو دولت اسلامیہ کی رعایا یا شہری شمار کیا جاتا ہے کیونکہ وہ اس میں مستقل سکونت رکھتے ہیں۔ "مستامن" غیر ملکی ہیں کیونکہ وہ دارالاسلام میں محدود مدت کے لیے آتے ہیں۔ ان نینوں طبقوں کے حقوق و فرائض بیان کرنے سے پہلے ہم واضح کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی مملکت اپنے تمام شہریوں پر یکساں سیادت رکھتی ہے، اور ان لوگوں پر یہ بھی جو اس کی حدود میں مقیم ہوں اس لیے یہ صحیح نہیں کہ اس معاملے میں کسی فرد یا گروہ کو مردوبہ قانون یا ضوابط سے مستثنیٰ قرار دیا جائے، ورنہ اسے یا تو لوگوں کے درمیان امتیازی سلوک قرار دیا جائے گا یا حکومت کا اختیار اقتدار ناقص شمار ہوگا۔ جب کوئی مملکت اپنی حدود میں مقیم افراد یا طبقوں کے مذاہب اور اختلافِ شریعت کو معتبر مان لے تو پھر ان میں کسی قسم کا امتیاز روا نہیں کیونکہ یہ مملکت کے اقتدار کے منافی ہے۔

## مسلمان رعایا

کسی دولت اسلامیہ میں رہنے والے مسلمان وہ افراد ہیں جو اسلام کو بطور دین و نظام تسلیم کرتے ہوں۔ ان افراد کا اپنی مملکت سے اشتراکِ وطن و عقیدہ ہوتا ہے۔ مسلمان کسی بھی اسلامی مملکت میں رہے وہیں کی رعایا شمار ہوگا، خواہ اس کا وطن کچھ بھی ہو اور اس کی راہ میں رکاوٹیں اور پابندیاں عائد کرنا مناسب نہیں۔ بلکہ اُسے مسلمانوں کے تمام علاقوں میں نقل و حرکت اور کاروبار کی آزادی حاصل ہے۔

عضر حاضر میں جو پابندیاں مسلمانوں پر عائد کی جاتی ہیں اسلام میں ان کی کوئی حیثیت و مقام نہیں۔ مسلمان، مسلمان کا وارث ہوتا ہے، خواہ وہ کہیں کا شہری ہو۔ یہ بعینہ ایسا ہی ہے جسے وہ دارالاسلام سے باہر کوئی جرم کرے مگر اسے سزا اسلامی قانون کے مطابق ہی ملے گی۔ دراصل اسلام تو دنیا بھر کے مسلمانوں کا وطن گردانا جاتا ہے۔

ذمی

یہ وہ لوگ ہیں جو ذمہ کے معاہدے کے تحت مسلمانوں کے درمیان مستقل اقامت رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مسلمانوں کی رعایا اور دولت اسلامیہ کے شہری ہیں۔ مسلمانوں کا اپنی مملکت کے ساتھ

شہریت اور دین کی وجہ سے ربط ہے جبکہ ذمیوں کا ربط محض شہریت اور وطنیت کی وجہ سے ہے۔ ذمی دراصل وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں کے باشندے تھے اور چونکہ انہوں نے اپنے علاقے میں اور اپنے دین پر قائم رہنا پسند کیا اس لیے وہ مسلمانوں کا "ذمہ" بن گئے یا ان کی پناہ میں آ گئے۔ جب کوئی قوم ذمی بننا پسند کرے تو اس کے لیے ہے کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے معمولی سامانی بوجھ برداشت کرے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دولت اسلامیہ مالی احکامات اور تعزیرات کو قبول کرے۔ اس قوم کو ایسے عام قانون کی پابندی سے جس میں شادی، طلاق، وراثت کے شخصی معاملات آتے ہیں، معاف کر دیا جاتا ہے کیونکہ یہ ان کے دینی امور ہیں جس میں جبر نہیں کیا جاسکتا۔

دولت اسلامیہ میں ذمیوں کی موجودگی پر لمبی چوڑی بحثیں کی گئی ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف افترا پردازی کی گئی ہے۔ سب سے زیادہ اعتراض "جزیہ" پر کیا جاتا ہے۔ جو دولت اسلامیہ کے سامنے میں آنے والے ہر ذمی پر واجب ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے مخالف اس مشہور طریقے پر عمل کرتے ہیں کہ "حملہ کرنا ہی بہترین دفاع ہے"۔ پہلے تو وہ مسلمانوں پر نہمت دھرتے ہیں کہ وہ غیر مسلموں کے خلاف تلوار استعمال کرتے ہیں اور پھر اسلام پر "نظر کرم" کرتے ہوئے اُسے "تلوار کا مذہب" قرار دیتے ہیں اس طرح مسلمان اس نہمت کے جواب میں مصروف ہو جاتے ہیں اور دفاعی جواب دیتے رہتے ہیں۔ اگر مسلمان انہیں یا دولائیں کہ ان کا اپنا سلوک ان مسلمانوں کے کشاکشاؤنا ہے اور ان پر کتنے مظالم ہوتے ہیں جو ان کی مملکت میں ہیں تو غیر مسلم فوراً مسلمانوں پر نہمت لگا دیتے ہیں اور الزام دھرتے ہیں کہ مسلمان غیر مسلموں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کی مثال کے طور پر جزیرہ کو پیش کرتے ہیں۔ اس معاملے میں حقیقت کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

فاقلوا الذین لا یؤمنون ..... حتی یعطوا الجزیة عن یدٍ وہم صاغرون (التوبہ: ۲۹)

بعض مفسرین کے نزدیک اس آیت میں "عن ید" سے مراد ہے "آسانی سے" اور بچے ہو تے ہیں اور بوڑھے جو ادا نہیں کر سکتے، اس سے خارج ہیں اور "وہم صاغرون" سے مراد یہ ہے کہ وہ دولت اسلامیہ کی اطاعت اور اس کے قوانین کی پابندی کریں۔

جزیہ اس خدمت کا صلہ یا معاوضہ ہے جو مسلمانوں پر ذمیوں کی حفاظت کے سلسلے میں عائد ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس معافی کا بدلہ بھی ہے جو انہیں دولت اسلامیہ کے بقا اور اس کے شہر پر

کے دفاع کے لیے لڑنے سے مل جاتی ہے۔ تاریخ میں وارد ہے کہ جب بھی مسلمان ذمیوں کی حفاظت سے قاصر رہتے تھے، وہ جزیرہ کی رقم غیر مسلموں یا ذمیوں کو لوٹا دینے تھے۔ مثلاً ابو عبیدہ بن الجراح شام کے تمام شہریوں سے وصول کی ہوئی جزیرہ کی رقم اس وقت واپس کرنے کا حکم دیا جب انہیں معلوم ہوا کہ شمال میں رومی لشکر نے دولت اسلامیہ کی حدود کا محاصرہ کر لیا ہے اور انہیں احساس ہوا کہ وہ ذمیوں کی حفاظت نہیں کر سکیں گے۔ انہوں نے اپنے سرداران کو لکھا کہ وہ ذمیوں کو بتادیں ہم نے اموال اس لیے واپس کیے ہیں کہ ہم جو کر سکتے تھے کر چکے اور تم نے ہمارے اوپر بشرط عائد کی تھی کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے، مگر اب ہم اس سے قاصر ہیں۔ ان کے اموال واقعی واپس کر دیے گئے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس حسن سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہروں کے ذمیوں نے کہا: "خدا تمہیں جلد واپس لائے اور ان پر فتح دے (یعنی رومیوں پر) حالانکہ وہ ان کے ہم مذہب تھے (کیونکہ اگر وہ تمہاری جگہ ہوتے تو ہرگز ایک کورٹی بھی واپس نہ کرتے بلکہ ہمارا پچا کھچا مال بھی چھین لیتے)۔ ان کے بعد صلاح الدین ایوبی کے ساتھ بھی بیعت یہی واقعہ پیش آیا جب اس نے شام کو خالی کرتے وقت وہاں کے نصاریٰ کا جوہر واپس کر دیا۔ مشہور مستشرق آرتلڈ نے اپنی کتاب "الدعوة الى الاسلام" میں یہ واقعہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے: "غیر مسلموں کو اسلامی حکومت پر اتنا اعتماد تھا کہ (جب صلاح الدین ایوبی رخصت ہونے لگا تو وہ اُسے اوداع کہہ رہے تھے مگر اس کے لوٹ آنے کی دعا بھی مانگ رہے تھے کیونکہ مسلمان حکمران اپنی قدیم عادت کے مطابق دوسری قوموں سے درگزر اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے تھے۔" گویا جزیرہ محض حفاظت کی قیمت تھی اور اس کی مقدار اس سے کہیں کم تھی جو مسلمان زکوٰۃ، عشر وغیرہ کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔ یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ جزیرہ کی اختراع اسلام نے نہیں کی، بلکہ اس سے پہلے یونان، روم اور فارس میں اس پر عمل ہوتا تھا مگر اسلام نے جب اسے عائد کیا تو ایسی صورت میں کیا کہ کسی معاشرے نے اس سے پہلے اتنی فراخ دلی اور انصاف کا مشاہدہ نہ کیا ہوگا اور اس نے غیر مسلموں کے کوائف اور احوال کو مد نظر رکھ کر کیا۔

اسلام نے ذمیوں کو اپنی عبادات اور عقائد میں مکمل آزادی عطا کی ہے اور انہیں اجازت دی ہے کہ ان کو تجارت، کاروبار، نقل و حرکت وغیرہ کے وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو ہیں۔ بلکہ بعض معاملات میں انہیں وہ حقوق بھی حاصل ہیں جو مسلمانوں کو نہیں، اور بے شمار فقہانے کہا ہے کہ نصاریٰ کو شراب اور خنزیر کا کھاروبار کرنے کی اجازت ہے کیونکہ ان کے دین میں حرام نہیں



حالانکہ کسی مسلمان کو یہ کاروبار کرنے کی قطعاً اجازت نہیں۔

اسلام نے ذمیوں کی حفاظت فرض قرار دی ہے اور ان کا خون اور مال دونوں محفوظ ہیں۔ ان کی آزادی اور عزت محترم ہیں۔ رسول کریم نے متعدد احادیث میں اس کی تاکید فرمائی ہے:

”جس نے کسی ذمی کو تکلیف دی تو قیامت کے دن میں اس کا دشمن ہوگا اور جس کی نجات میں کروں گا اس کا کوئی حمایتی نہ ہوگا“

حضرت عمرؓ اپنے دورِ خلافت میں اپنے عمال سے سب سے پہلے ذمیوں کے بارے میں پوچھتے تھے آپ کو یاد ہوگا کہ انہوں نے عمرو بن العاص، والی مصر کے بیٹے کو اس لیے کوڑے لگوائے کہ اس نے کسی ذمی سے بدسلوکی کی تھی اور حضرت عمرؓ نے اس وقت اپنا معروف قول کہا تھا: ”تم نے لوگوں کو کیسے غلام بنا لیا حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا“

دولتِ اسلامیہ میں ذمیوں کا اس قدر خیال رکھا جاتا تھا کہ اگر ان کی مالی حالت ہوتی تو بیت المال سے ان کی مدد کی جاتی، حالانکہ وہ مسلمانوں کا ادارہ تھا۔ خالد بن ولید نے اہل حیرہ کے بارے میں حکم دیا تھا کہ ان میں سے اگر کوئی ایسا بوڑھا ہو جو کام سے مندرجہ ہو یا اس پر کوئی مصیبت آئی ہو، یا امیر تھا، مگر فاتحے کرنے لگا کہ اس کے ہم مذہب اُسے حدِ قدر خیرات دینے لگے، تو ان کا جزیرہ معاف کر دیا گیا اور جیت تک وہ دارالسلام میں رہنا چاہتے مسلمانوں کے بیت المال سے ان کی اور ان کے اہل خانہ کی امداد جاری رہتی۔

## منا منین (غیر ملکی)

بہرہ لوگ میں جو اسلامی علاقوں میں محدود مدت کے لیے داخل ہوں اور ان کی نیت مستقل قیام کی نہ ہو۔ اگر مستقل قیام کا ارادہ ہو تو ان سے ذمیوں کی طرح سلوک کیا جائے گا۔ سب سے پہلے اسلام ہی نے غیر ملکیوں کے حقوق تسلیم کیے جبکہ انسانیت نے ان حقوق کی پابندی کے لیے بیسویں صدی عیسوی میں قوانین وضع کیے۔

غیر ملکیوں کو دولتِ اسلامیہ میں عارضی قیام اور نقل و حرکت کی آزادی ہے۔ انہیں تجارت اور کاروبار کا حق بھی حاصل ہے اور عام ضرورت کی تمام سہولتوں سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ دولتِ اسلامیہ کے نظام و قوانین کے تابع رہیں۔ یعنی مملکت میں امن و امان قائم رکھیں، قانون شکنی

نہ کریں، مسلمانوں کے عقائد اور رسم و رواج کا احترام کریں اور ہر اس فعل سے باز رہیں جس سے مسلمانوں کی توہین کا پہلو نکلتا ہو۔

فقہانے بغیر بلکیوں کے لیے کئی باتیں کہی ہیں جن میں سے اہم یہ ہیں:

۱۔ کسی غیر ملکی کا اس مال پر حق زائل نہیں ہوتا جو اس نے دارالاسلام میں کمایا ہو، خواہ وہ دارالحرب کو لوٹ جائے یا مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اہی کیوں نہ اٹھالے۔

۲۔ اگر دارالاسلام میں اس کی وفات ہو جائے تو اس کا مال و اسباب اس کے وارثوں کو پہنچا دیا جائے اور اگر وہ دارالحرب میں پہنچ کر بھی مر جائے تو اس کا دارالاسلام میں مال اس کے وارثوں کو منتقل کر دیا جائے گا، خواہ وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کرتا ہو اہی کیوں نہ مارا گیا ہو، لیکن اگر وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ آزما ہو اور فیری بنا لیا جائے، جس کے بعد اسے

چھوڑ بھی دیا جائے تو اس کا اپنی ملکیت پر حق زائل ہو جائے گا۔

۳۔ جہاں تک تعزیرات کا تعلق ہے تو ان پر بھی وہی نافذ ہوں گی جو باقی سب لوگوں پر ہوتی ہیں۔

اگر وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا نہ کریں تو جمہور فقہانہ انہیں سزا دیتے کے حق میں ہیں، صرف امام ابوحنیفہؒ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔

## حواشی

۱۔ النساء : ۵۹

۲۔ النساء : ۸۳

۳۔ آل عمران : ۱۵۹

۴۔ المائدہ : ۴۹

۵۔ اس نقطہ نظر کے سربراہ علی عبدالرازق ہیں جو اپنی کتاب ”اسلام اور اصول حکومت“ میں کہتے ہیں: ”محمد ربی دعوت کے لیے بھیجے گئے تھے جو خالصتاً دین کے لیے تھی جس میں ملک و سلطنت کی آمیزش نہ تھی کیونکہ نبی کریم ﷺ ملک و سلطنت قائم کرنے نہیں آئے تھے، اور آپ نے اس معنی میں کسی مملکت کو قائم نہیں کیا جس معنی میں علم سیاست میں معروف ہے آپ اپنے سے پہلے انبیاء کی طرح رسول تھے، بادشاہ نہیں، نہ کسی سلطنت کے بانی نہ حکومت کے دعویدار۔“

مؤلف مذکور جب حقیقت کا سامنا کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اللہ کی طرف دعوت دیتے ہوئے مسلمانوں کے تمام امور کے مالک تھے جن و ہمد و عزوات، جنگ کے بعد انتظام مثلاً معاہدے اور حدود کا قیام وغیرہ شامل تھے تو یہی کہتے ہیں کہ ان تمام امور کو آپ دین اور دعوت دین کے حصے کے طور پر سہرا بنام دیتے تھے۔ وہ کہتے ہیں: ”بعض اوقات سیرت نبویؐ میں ایسے اعمال بھی نظر آتے ہیں جو حکومت کا عمل یا ملک و سلطنت کا مظہر معلوم ہوتے ہیں، مگر ان سے شک میں نہ پڑیں کیونکہ یہ تمام معاملات و افعال دین کے قیام اور دعوت کی تائید کے وسائل تھے۔“

۶۔ ڈاکٹر فطر جبر اللہ کہتے ہیں:

”اسلام صرف دین ہی نہیں بلکہ نظام سیاسی بھی ہے۔ مسلمانوں میں بعض افراد ایسے ہیں جو اپنے آپ کو ”روشن خیال“ کہتے ہیں اور یہ اصرار کرتے ہیں کہ اسلام میں دین و سیاست

الگ الگ ہیں، مگر فکرِ اسلامی نے واضح کر دیا ہے کہ اسلام میں دونوں متلازم ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔  
پروفیسر نالینو کہتے ہیں:

”محمد نے دین اور ریاست کی بیک وقت اساس رکھی اور دونوں کی حدیں آپ کی زندگی میں ایک دوسرے سے منسلک تھیں۔“  
ڈاکٹر شافٹ کہتے ہیں:

”اسلام کا بیشتر حصہ دین ہے مگر اس میں نظریاتِ قانونی و سیاسی بھی داخل ہیں اور حقیقت یہ ایسا مکمل نظام ہے جو دین و ریاست دونوں پر محیط ہے۔“  
پروفیسر مسٹر وٹمان کہتے ہیں:

”اسلام بیک وقت دین بھی ہے اور سیاست بھی، کیونکہ اس کا بانی نبیؐ بھی تھا اور حاکم بھی جو حکومت کے کاروبار سے واقف تھا۔“

۷۔ محمد اسد: منہاج الاسلام فی الحکم

۸۔ ایضاً

۹۔ طبری: گیا رہویں سن ہجری کے واقعات

۱۰۔ اس موضوع پر مفصل بحث کیے دیکھئے: مولانا مودودی: ”اسلام کا سیاسی نظریہ“

۱۱۔ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ: ”نظام الحکم فی الاسلام“

۱۲۔ استاذ محمد ابو زہرہ: العلاقات الدولیة فی الاسلام

۱۳۔ ان میں، مثلاً، وہ معاہدہ امان ہے جو حضرت عمرؓ نے اہل ایلیاد کے ساتھ جس کی رو سے ان کی جانیں، اموال، صلیبیں، بیمار اور صحت مند افراد اور ان کی قوم کے تمام لوگوں کو پناہ دی گئی تھی اور عہد کیا گیا تھا کہ ان کے معبدوں پر قبضہ نہیں کیا جائے، نہ ان سے کچھ غنیمت کیا جائے گا، نہ ان پر ان کے دین کی وجہ سے سختی کی جائے گی اور نہ ان میں کسی کو آزار پہنچایا جائے گا۔

۱۴۔ استاذ محمد ابو زہرہ: العلاقات الدولیة فی الاسلام

۱۵۔ عمرو بن العاصؓ نے مصر کے لوگوں کو امان دینے ہوئے کہا تھا کہ ان کے جان و مال، دین و مذہب

گریجے، صلیبیں سب محفوظ رہیں گی۔ اور ان کو خشکی و تیزی دونوں جگہ امان ہے۔ ان کے ان حقوق میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جائے گی۔ روم اور بلادِ افریقہ کے جو لوگ ان سے صلح کریں گے ان کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے اور وہی فرائض عائد ہوں گے، جو اسے پسند نہ کرے اور لوٹ جانا چاہے تو جب تک وہ اپنی پناہ گاہ میں نہیں پہنچ جاتا، امون ہے یا وہ ہمارے حیطہ اقتدار سے نکل جائے۔ جو لوگ رہنا چاہیں انہیں درآمدِ برآمد کی تجارت سے منع نہیں کیا جائے گا۔

## اقتصادی نظام

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اسلام، زندگی کا جامع نظام ہے، اور اس کا ایک رُخ، یعنی اسلام کا سیاسی نظام ہم پیش کر چکے ہیں۔ اب ہم چند ایک وہ اصول بیان کرتے ہیں جن پر اسلام کے اقتصادی نظام کی اساس ہے۔ اس سلسلے میں ہم انسان کی ان سرگرمیوں کا جائزہ بھی لیں گے جن میں وہ اپنی مادی ضروریات پورا کرتے کے لیے مصروف ہوتا ہے۔ ”اقتصادی تنظیم سے مراد عموماً یہ لی جاتی ہے کہ یہ انسان کی ان کوششوں کے لیے ضوابط ہیں جو وہ ضروری حاجات یا آسائشوں کے حصول کے لیے کرتا ہے، یا دولت کی پیداوار گردش اور تقسیم کے لیے کرتا ہے اور افراد کے اقتصادی حقوق اور جماعت کے مفاد کے مقابل ان کے مفاد کی حدود طے کرتا ہے۔

یہ دہرانا ضروری ہے کہ اسلامی اقتصادی نظام باقی سب اقتصادی نظاموں سے مختلف ہے کیونکہ یہ مستقل اور ممتاز ہے۔ اگر کہیں کہیں اس کے اصول دوسرے نظاموں سے مشابہ نظر آئیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے کسی دوسرے نظام کی خوشنہ چینی کی ہے یا ان نظاموں سے مکمل مطلقیت رکھتا ہے۔

اس وقت دنیا میں دو بڑے بڑے اقتصادی نظام رائج ہیں: ان میں سے ایک آزاد و اقتصادی نظام اور دوسرے کواشتر کی نظام کہا جاسکتا ہے۔ آزاد اقتصادی نظام دولت کی پیداوار اور افزائش میں ذاتی مفاد اور انفرادی آزادی کو ملحوظ رکھتا ہے اور حکومت کی دخل اندازی کو ناپسند کرتا ہے۔ جبکہ کواشتر کی نظام اس کے برعکس اجتماعی مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح دیتا ہے

اور حکومت کو ہر چیز کا مالک قرار دیتا ہے اور پورا اقتصادی نظام حکومت کے اختیار میں دے دیتا ہے۔ ان کے مقابلے میں اسلامی نظام دونوں مفادات یعنی اجتماعی اور انفرادی کا یکساں خیال رکھتا ہے کیونکہ وہ فرد کی اقتصادی آزادی پر اس حد تک پابندی ضرور لگاتا ہے جو اجتماعی مفاد کے لیے ضروری ہو۔ اس طرح وہ مختلف طبقوں اور افراد میں توازن پیدا کر کے درمیانی راستہ اختیار کرتا ہے

## اسلامی اقتصادیات کا ہدف اور اس کے وسائل (مقاصد و ذرائع)

جس طرح اسلام کا سیاسی نظام، لوگوں میں انصاف، اور ان کے حقوقی و فرائض میں مساوات قائم کرتا ہے، اسی طرح اقتصادی نظام، اجتماعی اور معاشرتی انصاف قائم کرتا ہے یعنی ہر انسان کے لیے کم سے کم مادی حد کی ضمانت جو اس کی عزت نفس کو برقرار رکھ سکے اور اس مرتبہ عالیہ سے ہم آہنگ ہو جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے چاہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، وہ ان تمام مواقع سے بہرہ اندوز ہو جو اس کی حاجت روائی کے لیے حاصل ہوں بشرطیکہ اس کی عزت اور انسانیت پر حرف نہ آئے۔ اسلام یہ مقصد اس لیے حاصل کرنا چاہتا ہے کہ ایک ایسی صاف ستھری اور پاکیزہ قضا پیدا کی جائے جس میں انسان اپنے تمام وسائل کو کام میں لاتے ہوئے صحیح دسالم انسانی فطرت کے مطابق، اپنی خواہشات پوری کر سکے۔ اسلام اس بات کو نظر انداز نہیں کرتا کہ وہ انسان کی جزوی مشکلات کا حل پیش کرتا ہے کیونکہ اس کے پیش نظر زندگی کے اربع مقاصد ہیں۔

اس غرض سے اسلام دو بنیادی ذرائع استعمال کرتا ہے، شریعت اور تربیت۔ بیشتر اقتصادی نظام، اپنے مقاصد کے حصول کے لیے صرف قانون کا سہارا لیتے ہیں، جبکہ اسلام کامل معاشرہ بنانے کے لیے جہاں مقاصد کے عملی حصول کے لیے قانون سازی کا سہارا لیتا ہے وہیں وہ انسان کی تربیت کا بندوبست بھی کرتا ہے جس سے وہ مادی ضروریات پوری کرنے سے بلند ہو کر، زندگی کا اعلیٰ نصیب العین حاصل کرتا ہے

اس کی مثال شریعت میں نظام زکوٰۃ اور اس کے ضوابط ہیں جو اجتماعی کفالت کی بنیاد ہیں۔ اسلام نے نہ صرف اسے فرض قرار دیا بلکہ اس سے انحراف کرنے والوں کے خلاف جنگ کا اعلان بھی کیا اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے مسلمانوں کو اپنے مال میں سے صدقہ و خیرات کے لیے بھی ابھارا اور اس میں اضافی مالی قربانی سے اس کی غرض و غایت یہ ہے کہ انسان مال و دولت کی ہوس سے بالاتر ہو جائے

جس طرح اسلام نے عام طور پر جاہلی زندگی کا نقشہ بدل دیا، اسی طرح اس کے اقتصادی نظام نے بوسیدہ مالی نظام میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس تغیر حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقرا و مال و دولت سے مستفید ہونے لگے اور امداد اپنا مال اُن پر خرچ کرنے لگے۔ اسلام سے پہلے عوام تمام ”گھٹیا“ کاموں کے لیے وقف تھے اور ان کا کام صرف فرائض ادا کرنا تھا۔ افراد کی کفالت اور اجتماعی انصاف میں بھی حکومت جاہلداروں سے کام لیتی تھی اور عوام کے برخلاف، صرف بااثر کا ساتھ دیتی تھی۔ رسول کریم کی وفات کے بعد ”حروبِ رتہ“ وہ پہلی جنگ تھی جو مسلمانوں نے محض اس لیے کی کہ اجتماعی انصاف اور زکوٰۃ کی وصولی کا مقصد حاصل ہو سکے اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حکومت اور دولت الگ الگ ہیں ماب صرف وہی شخص حکمران ہو سکتا تھا جو لوگوں کے مفادات کا خیال رکھے اور حق کو قائم کرے جبکہ ماضی میں حکمران وہ ہوتا جو مال و دولت اور طاقت میں سب سے بڑھ کر ہوتا تھا۔

یہاں ہم اقتصادی نظام کے مختلف اجزا بیان نہیں کر سکتے، لیکن بعض اہم موضوعات کا ذکر کرتا ضروری ہے، مثلاً:

- ۱۔ ملکیت کے بارے میں اسلام کا موقف۔
- ۲۔ ملکیت اور پیداوار کے وسائل پر قبو۔
- ۳۔ منافع
- ۴۔ بنک
- ۵۔ اجتماعی کفالت اور زکوٰۃ

### ملکیت کے بارے میں اسلام کا موقف

ملکیت کے بارے میں تمام اقتصادی نظام مختلف نظریات رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض ہر قسم کی انفرادی، اجتماعی، عام اور خاص ملکیت کی اجازت دیتے ہیں اور بعض صرف اجتماعی ملکیت، بالخصوص پیداوار کے وسائل کی اجازت دیتے ہیں۔

اسلام انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے مگر اجتماعی مقاصد حاصل کرنے کے لیے اُسے جماعت کے مفادات سے ہم آہنگ دیکھنا چاہتا ہے اور ایک ایسے اقتصادی نظریے کا حامی ہے جو فرد اور جماعت دونوں کے مفادات کا بخوبی نگہبان ہو، اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام



میں ملکیت خاص، اجتماعی فرد ادا کرتی ہے۔

قرآن مجید میں کئی عادات ایسی ہیں جو مال و دولت کو اللہ تعالیٰ سے منسوب کرتی ہیں اور حیدر آیات اُسے انسان سے منسوب کرتی ہیں مثلاً:

”وَأَتَوْهُمْ مِنْ مَالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ“ (النور: ۶۳)

”وَالْفُقَوَاءُ جَعَلَكُمْ سَخْلَفِينَ فِيهِ“ (الحديد: ۷)

”إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ“ (۱۵)

”الَّذِينَ يَنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ“ (البقرہ: ۲۷۲)

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف مال کی نسبت سے مقصود یہ ہے کہ جماعت کو اس کے نمائندوں کو اس کا حق دیا جائے گا کہ وہ اس مال سے مناسب فائدہ حاصل کرنے کی تنظیم کی نگرانی کریں اور اس کا استعمال غلط جگہ پر نہ ہو یا ایسے مصارف ہوں جو اجتماعی مفادات کے خلاف ہوں اسلام نے انفرادی حق ملکیت کو اس لیے تسلیم کیا ہے کہ یہ انسان کی طبیعت اور فطرت کے مطابق ہے۔ کوئی انسان بالعموم اس وقت تک کوئی کام نہیں کرتا جب تک اُسے اس سے ذاتی فائدہ حاصل نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کا حق ملکیت، جو اس کے عمل کا ثمرہ ہے اور تمام انسانی سرگرمیوں کا محرک ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو ملکیتیں صرف حکومت کو ملکیت کا حق دیتی ہیں۔ وہ بھی پیداوار کی جو صلہ افزائی کرنے کے لیے انفرادی محرکات کی تلاش میں رہتی ہیں اور بالآخر انہیں کسی نہ کسی قسم کی انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ قرآن مجید انسان کی مال و ملکیت سے محبت کو جانتے ہوئے کہتا ہے:

”وَإِنَّهُ مَحَبُّ الْغَيْبِ لِشَدِيدٍ“ (العاديات ۱۰۰: ۸)

”وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا حَيًّا“ (الفجر ۸۹: ۲۰۰)

”ذِينَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْوَالِدَاتِ وَالْأَقْرَابِ الْمَقْطُورَةِ“

”مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِئَةِ“ (آل عمران ۳۶: ۱۴)

انفرادی ملکیت کے اثبات کے لیے وہ آیات پیش کی جاسکتی ہیں جن میں مال و دولت کی انسان کی طرف نسبت کی گئی ہے، اور اسی طرح احادیث رسول ﷺ اور گزشتہ تمام صدیوں میں مسلمانوں کا طریق کار بھی اس کی شہادت دیتا ہے۔

اسلام اس بات میں کوئی خرابی نہیں پاتا کہ فرد کو حق ملکیت دیا جائے جب تک صاحب مال اپنا حق ادا کرتا ہے اور اس کی دولت صرف تو نکلے، ہی میں گردش نہ کرتی رہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

”واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق“ (المعل، ۷۱)

”اللہ یسط الرزق لمن یشاء ولقد“ (الرعد: ۲۶)

”نحن قسمنا بینہم معیشتهم فی الحیاة الدنیا ورفعنا بعضہم فوق بعض درجات“ (الزخرف: ۳۲)

حقیقت تو یہ ہے کہ لوگوں میں تفاوت کے بے شمار اسباب ہیں۔ مثلاً ”ہر فرد کی خلقت، اس ذہانت، اس کی طاقت، اس کا کام وغیرہ۔ یہ بات معقولیت سے بعید کہ کسی ذہن عالم کو کسی غبی جاہل کا ہم پلہ قرار دیا جائے یا کسی بے کار، سست انسان کو محنتی کارکن کے برابر سمجھا جائے ان اسباب سے ہم کسی بھی معاشرے کو اپنے افراد کے درمیان مختلف انواع کے اختلافات سے خالی نہیں پاتے۔

اسلام اگر انفرادی ملکیت کی حمایت کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تنگ دست فقر اور بد مست امیر کے وجود کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام حکومت کو انفرادی ملکیت میں دخل اندازی کی اجازت تو نہیں دیتا مگر مقادرات عامہ سے تعارض بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن یہ دخل اندازی بھی انفرادی ملکیت کو بالکل ختم کرنے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ انفرادی ملکیت اور مفاد عامہ کے درمیان مدافعت پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہے اور یہ بات اسلامی شریعت کی اساس شمار ہوتی ہے اور اس ملکیت کے استعمال کو منظم کرنے کے لیے لازمی پابندیاں عائد کرتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ معاشرے پر ظلم محض انفرادی ملکیت کا حق دینے سے نہیں ہوتا بلکہ اس ملکیت کے غلط استعمال سے ہوتا ہے۔

جب اسلام انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے تو یہ بھی لازمی قرار دیتا ہے کہ اس حق کے تحت اس کے تمام حقوق بھی ادا کیے جائیں تاکہ یہ دوسروں کی ضرورسانی کا باعث نہ بن جائے۔ مملکت اسلامی ہر فرد کو اپنی ملکیت میں تصرف کا حق دیتی ہے کہ وہ اسے بیچ دے، ہبہ کر دے یا کرانے پر اٹھادے بشرطیکہ اس کا عمل شرعی حدود کے اندر ہو۔ اس طرح فرد اپنی ملکیت کی

وصیت کر سکتا ہے اور قانون کے تحت اس کے مرنے پر اس کے وارثوں کو اس کی جائیداد منتقل ہو سکتی ہے۔

## ملکیت کی حدود اور پیداوار کے ذرائع

بنیادی طور پر اسلام میں مال و دولت اللہ کا مال ہے اور انسان محض اس کا نائب ہے یا اس مال پر کا مدتہ ہے۔ کسی بھی کارندے کا فرض ہے کہ وہ ملازمت کی شرائط سے انحراف نہ کرے یعنی اس کا مال پر تصرف ان حدود میں ہونا چاہیے جو اسلام نے مقرر کی ہیں:

حق ملکیت پر اسلام نے کئی پابندیاں عائد کی ہیں، اور اس طرح دولت کی پیداوار کے ذرائع قیود سے مبرا نہیں۔ ہر فرد کے مال پر معاشرے کا حق عائد کیا گیا ہے۔ حق ملکیت پر درج ذیل پابندیاں ہیں:

- ۱۔ دولت کا حصول شرعی طریقے سے ہو۔
- ۲۔ دولت کو جمع کر کے نہ رکھا جائے کیونکہ جمع کرنے سے دولت معطل ہو کر رہ جاتی ہے اور فرد و جماعت کی خدمت میں استعمال نہیں ہو سکتی۔
- ۳۔ دولت کو معقول طریقے سے اور حدود میں استعمال کیا جائے کہ اس میں نہ اسراف، سونہ بخل، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ“ (الانعام: ۱۴۱)

”وَالَّذِينَ إِذَا انْفَقُوا مِمَّا كَسَبُوا لَمْ يَفْقَرُوا وَكَانَ بَيْنَ يَدَيْهِمْ خَزَائِنُ مَالٍ“ (الفرقان: ۲۵، ۲۶)

مکن ہے کوئی مسرف (فضول خرچ) اپنے اموال کے استعمال سے روک دیا جائے۔ اس صورت میں وہ اس کے وصی یا وارث کے ہاتھ لگیں گے، جو انہیں مفت کی کمائی سمجھ کر خوب خرچ کرے گا اور اس طرح اسراف اسلامی معاشرے میں، جو تعاون پر مبنی ہے، کئی بیماریاں پیدا کرنے کا باعث بنے گا۔

- ۴۔ یہ مناسب نہیں کہ دولت کسی چھوٹے سے طبقے کے ہاتھ میں محدود رہے اور انہیں میں گردش کرتی رہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

”مَّا آتَاكُمُ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولٍ مِّنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلْيَنسِبْهُ إِلَىٰ قَوْمِ بَنِي أَدْنَىٰ مِّنْ قَوْمِكُمْ وَلَا يَنْسِبْهُ إِلَىٰ غَيْرِهِمْ“ (التوبة: ۳۴)

والیتنا علیٰ واللمساکین وایمن السبیل کی لامکون ووننة بین الاعنیاء منکم" (المشر ۱۵۹) اس آیت کا نشان نزول یہ ہے کہ جب رسول اللہ کو بنی نضیر کے یہودیوں کا مال عنیت اتھوگا تو آپ نے اسے تمام مسلمانوں پر تقسیم نہ کیا بلکہ صرف مہاجرین کو عطا کیا اور عرب انصار کو بھی نہ دیا کیونکہ انصار کے مادی حالات مستحکم اور باڈار تھے جس کے برعکس مہاجرین اپنے اموال مکہ میں چھوڑ آئے تھے ان اموال کی تقسیم رسول اللہ نے قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق کی۔

۵۔ وہ ملکیتیں جو عام مسلمانوں کے مفاد سے متعلق ہیں، اجتماعی ملکیت رہتی ہیں اور مملکت ان کی نگران ہوتی ہے۔ مثلاً پانی، چراگاہ، آگ جو حدیث رسول میں مذکور ہیں۔ ان پر دوسری ملکیتوں کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک دولت کے ذرائع پیداوار کا تعلق ہے، اسلام شرعی حدود کے اندر رہنے ہوئے اس کی اجازت دیتا ہے۔ صاف ستھرے ذرائع یقیناً وہ ہیں جو ہر ماٹے کو برے راستوں سے نہیں بڑھاتے۔

اسلام میں جو ذرائع "حرام" ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ دھوکا، دُرب، غبن اور ایسے تمام ذرائع جن سے اسلامی اخوت اور تعاون جو روح ہو رسول کریم نے فرمایا: "جس نے دھوکا دیا وہ ہم میں سے نہیں" آپ نے یہ بھی فرمایا: "حرام سے کمانے ہوئے مال سے گوشت نہیں بڑھتا، اس کا ٹھکانا آگ ہے۔"

۲۔ لوگوں کی ضروریات کی ذخیرہ اندوزی، جس سے ان کا استحصال ہو اور ان سے ناجائز منافع کمایا جائے۔ رسول اللہ نے فرمایا: "جس نے کسی کھانے کی چیز کو چالیس دن تک ذخیرہ کیا، تو اللہ کو اس کی ضرورت نہیں اور اُسے اللہ سے غرض نہیں" آپ نے یہ بھی فرمایا: "احلال کی روزی کمانے والا) رزق پانا ہے اور ذخیرہ اندوز ملعون ہے۔"

۳۔ سود، کیونکہ یہ کسی گوشش کے بغیر نفع ہے۔ یہ روح تعاون کو فنا کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کا لالچ پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ، اس سے امت کے مختلف طبقوں میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ اس سے کئی اقوام کو استعماریت کا بہانہ ملا اور کئی دوسری اقوام آزادی سے محروم ہو گئیں۔

انفرادی ملکیت، فرد کی بلا واسطہ منفعت کے لیے اور جماعت کی بلا واسطہ منفعت کے

لیے ہے۔ اسی لیے اگر کوئی ملک اپنی ملکیت سے نفع حاصل کرتا بند کر دے تو مملکت کے لیے جائز ہے کہ اُسے اس کا پابند بنائے۔ اس کے بارے میں کئی احادیث میں وارد ہوا ہے کہ کسی زمین کی پیداوار تین سال سے زیادہ روک دینے جائز نہیں۔

## منافع اور بیک

اس موضوع کی ہمارے دور میں خاصی اہمیت ہے۔ منافع کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ اسی طرح بنکوں کے بارے میں طویل بحث کی گئی ہے۔ یہ سوال بھی کیا جاتا ہے کہ اگر اسلامی نظام کے تحت، بنکوں کو ختم کر دیا جائے اور اس کی سودی اساس باقی نہ رہے، تو اس کا اسلامی بدل کیا ہوگا؟

### منافع (یا سود)

ربو (یا عرف عام میں "منافع") کسی کو قرض دیئے ہوئے مال پر منافع ہے جو بلا جہد حاصل ہوتا ہے سود پر قرض دینے والا، قرض پر مفزہ فیصد کے حساب سے منافع لیتا ہے اس سے اس کے مال میں کسی کوشش کے بغیر اضافہ ہوتا ہے کیونکہ وہ ہر حال میں اپنا نفع لے گا، خواہ قرض لینے والے کو نفع ہو یا نقصان۔

بلاد اسلامیہ میں بعض مفکرین نے کہا ہے کہ وہ ربو جو اسلام میں حرام ہے، وہ سود مرکب ہے سود مفرد نہیں اور وہ جو صارف کے لیے ہو پیداوار پر نہ ہو۔ صاف سے لیا جانے والا سود وہ ہے جو کسی کی روزمرہ کی حاجات کو پورا کرنے کے لیے دیئے جانے والے قرض پر لیا جائے، مثلاً کوئی شخص اپنے بیٹے کی بیماری یا بچوں کی فیس کی ادائیگی یا بیٹی کی شادی وغیرہ کے لیے قرض لے تو اس پر سود (ان مفکرین کے نزدیک) حرام ہوگا اور پیداواری سود وہ ہے جو کوئی شخص اپنے کارخانے یا دکان یا زمین میں وسعت کے لیے یا پیداوار بڑھانے کے لیے حاصل کیے ہوئے قرض پر ادا کرے۔

سود مفرد سے مراد قلیل سود ہے اور قرض پر دیئے جانے والے مال کے مقابلے میں اس کا تناسب قلیل ہو۔ سود مرکب وہ سود ہے جو تھوڑی مدت میں ناقابل برداشت حد تک بڑھ جائے یعنی سود پر بھی سود لیا جائے۔

بعض مفکرین نے اسی سود مرکب اور صارف سے لے جانے والے سود کو حرام کہا ہے کیونکہ

اس میں واضح استحصال ہے کیونکہ لوگوں کی ان جائز ضروریات کو پورا کر کے استعمال کرتا ہے جن کو پورا کیے بغیر چارہ نہیں۔ اس کے علاوہ اقتصادی اور معاشرتی طور پر اس کے نتائج ہولناک ہوتے ہیں۔ ان مفکرین کے نزدیک صارف سے لیا جانے والا سود نزولِ قرآن اور بقیۃ رسول کے ایام میں بھی رائج تھا۔ اور پیداواری سود چونکہ اس زمانے میں تھا ہی نہیں، اس لیے وہ حرام نہیں۔ سود مرکب کی حرمت کی دلیل وہ قرآن سے لاتے ہیں کہ

”یا ایہا الذین آمنوا لا تأکلوا الربا اضعافاً مضاعفة“ (آل عمران ۳: ۱۳۰)

ان کی یہ دلیل کئی وجوہ کی بنا پر ناقص ہے :

۱۔ قرآن و سنت کی نصوص : ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنی آیات اور احادیث دونوں مطلقاً سود کو حرام قرار دیتی ہیں، خواہ وہ کسی نوع کا ہو۔

قرآن مجید میں آیا ہے :

”الذین یا کلون الربا..... وحرّم الربا“ (البقرہ ۲: ۲۷۵)

”یا ایہا الذین آمنوا..... لا تظلمون ولا تُظلمون“ (البقرہ ۲: ۲۷۸-۲۷۹)

”یا ایہا الذین آمنوا..... لعنکم تغلحون“ (آل عمران ۳: ۱۳۰)

رسول کریم نے فرمایا :

”ہر وہ قرض جو نفع حاصل کرے وہ ربا ہے“

ان سے واضح ہے کہ ربا کسی قسم کا ہو، حرام ہے۔ اور سورہ آل عمران کی مندرجہ بالا آیت میں ”اصفاً مضاعفة“ کی ترکیب محض تاکید کے لیے ہے کیونکہ اس میں ذلت آمیز استحصال ہے اور اخلاقی لحاظ سے بھی مکروہ ہے۔

۲۔ بعض لوگ تاریخی دلائل لاتے ہیں لیکن یہ دلیل خود ان کے خلاف جاتی ہے۔ عربوں میں، ایام جاہلیت میں وہ جو سودی قرضے دیئے جاتے تھے وہ پیداواری سود کی قسم میں سے تھے۔ یہ بات ہر واقف تاریخ جانتا ہے کہ اسلام سے قبل عرب تجارت کرتے تھے اور شام، حجاز، یمن، فارس کو مال برآمد کرتے اور وہاں سے درآمد بھی کرتے۔ تجارت اور کاروبار کے لیے وافر مال کی ضرورت ہوتی ہے۔ عرب تجارت اپنا اور دوسروں کا مال اس میں لگاتے تھے اور غالباً جو لوگ انہیں قرض دیتے تھے وہ منافع کا کچھ فیصد طلب کرتے تھے۔ اہل طائف زراعت پیشتہ تھے۔ وہ مکہ کے اہل ثروت اور طائف

کے یہودیوں سے، جو اس وقت وہاں آباد تھے، قرض لیتے تھے اور اس قرض کو سود کے ساتھ واپس کرتے تھے۔ اس سے صاف نظر آتا ہے کہ عربوں میں بالعموم پیداواری سود کا رواج تھا۔ ہم سود کی حاجت کرنے والوں سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا دور جاہلیت کے عربوں کو اشیائے صرف کے لیے سود پر قرض لینے کی حاجت تھی؟ یعنی اپنے اور اپنے اہل و عیال کے نان نفقے کے لیے قرض پر سود لیا جاتا تھا؟ اس معاشرے میں اشیائے صرف کے لیے قرض نادریات تھی کیونکہ ان کی ضروریات سادہ اور محدود تھیں۔ اس لیے صاف ظاہر ہے کہ اس دور میں اشیائے صرف کے قرض پر سود لینے کی بجائے پیداواری سود رائج تھا، مگر حرمت دونوں کے لیے برابر ہے۔

۳۔ اسلامی اقتصادی نظام، منفرد اور ممتاز نظام تھا۔ اپنے دور کے جملہ نظاموں سے یہ اس لیے منفرد اور ممتاز تھا کہ اس نے سودی معاملات کی کسی صورت و شکل میں حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اشیائے صرف کے لیے حاصل کیے جانے والے قرض پر سود تو ویسے ہی انتہائی غیر انسانی ہے کیونکہ ہر انسان کو اپنے معاش کے لیے ضروری اسباب کی حاجت ہے اور اگر کوئی معاشرہ مل جل کر اور ایک دوسرے کی دستگیری کر کے باہمی ضروریات کو پورا نہیں کرتا تو وہ معاشرہ بنیادی اخلاق سے خالی ہے۔

پیداواری قرض پر سود کی تخریم کو شاید ہم پوری طرح واضح نہ کر سکیں مگر ہم وہ بُرے نتائج ضرور پیش کرتے ہیں جو یہ سود اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ یہ نتائج سود لینے والے اور ہر پیداوار کے مالک، کارخانہ دار یا صارف کے حوالے سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ پیداواری سود گزشتہ تین صدیوں میں وسیع ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ بنکوں میں اضافہ ہوا ہے۔ بنک صرف اپنے مالکوں کے پیسے سے نہیں چلتے بلکہ ان رقم رقوم جمع کرانے والوں کا پیسہ بھی شامل ہوتا ہے۔ بالعموم ابتدا میں ہر بنک بہت تھوڑے سرمائے سے کام شروع کرتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس میں رقم جمع کرانے والوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، جن سے بنک کثیر منافع کماتا ہے۔ اس میں سے وہ رقم جمع کرانے والوں کو بہت تھوڑا حصہ دیتا ہے اور جو لوگ بنک سے قرض لیتے ہیں ان سے بہت زیادہ وصول کرتا ہے اس طرح دراصل رقم جمع کرانے والوں کے مال سے منافع کم کر بنک زیادہ مالدار ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے دنیا بھر کے بنک "مرکزیت" کی طرف مائل ہیں، یعنی ایسے بنک چند ایک ہیں جو مقررہ طریقہ دنیا کے زرمبادلہ کی منڈیوں پر چھائے ہوئے ہیں، اور اسی تسلط کی وجہ سے سیاست اور اقتصادیات

یکجا ہو گئی ہیں اور دنیا کے بے شمار معاملات میں ان کا عمل دخل ہے۔ اندازہ ہے کہ بڑے بڑے بنکوں میں زیادہ تعداد یہودی مالکوں کی ہے۔

جہاں تک کارخانہ دار وغیرہ کا تعلق ہے، وہ حیب بھی کسی مقصد کے لیے قرض لیتا ہے تو اسے اشیائے پیداوار کے اخراجات میں شامل کر لیتا ہے اور قیمت بڑھا دیتا ہے مثلاً اگر اُسے دس فیصد سود دینا ہو تو وہ اسی قدر قیمت میں اضافہ کر دے گا اور اس کا سارا بوجھ صارف پر ڈال دے گا۔

اگر پیداوار بڑھ جائے (جو پیداواری قرضوں کے آسانی سے ملنے کے باعث ہو سکتی ہے) اور مارکیٹ میں طلب کم ہو جائے تو اشیاء کی فراوانی ہو جائے گی اور اس کے نتیجے میں کساد بازاری پیدا ہوگی اور اقتصادی بحران آجائے گا۔ کارخانہ دار پیداوار میں کمی پر مجبور ہوگا اور اپنے اخراجات کم کرے گا، جس کے لیے اُسے یا تو اجرتیں کم کرنی پڑیں گی یا کارکنوں کی چھٹی کرنا ہوگی جس سے بیروزگاری بڑھے گی۔ دونوں حالتوں میں اس بحران کے اثرات مزدوروں اور متوسط طبقے کے لوگوں پر پڑیں گے، جن کی قوت خرید کم ہو جائے گی اور اس کے بعد اقتصادی بحران شدید ہو جائے گا۔

پیداوار کا ہر مالک چاہے گا کہ خام مال کی قیمتوں میں کمی ہو جو اکثر حالات میں ترقی پذیر ممالک سے درآمد کیا جاتا ہے، جو اپنی اقتصادی حالت کو اس خام مال کی برآمد سے بہتر بنا چاہتے ہیں اور پھر اس کی آمدنی سے وہ اشیاء درآمد کرنا چاہتے ہیں جو ان کی معاشیات کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ یہ سب معروضات، ان اثرات بد کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو پیداواری قرض پر سود کے لین دین کا نتیجہ ہیں۔

سوال کیا جاسکتا ہے کہ جب اسلام سود کی ہر قسم کو مکمل طور پر حرام قرار دیتا ہے تو کیا سولہ نظام سے بچنے کا کوئی راستہ ہے؟ اور اشیائے صرف پر سود ہو یا پیداوار پر؟ کیا اسلام کے پاس اس کا کوئی متبادل ہے؟ ہم بتظر اختصار پہلے بنکوں کے فرائض وغیرہ کو دیکھیں گے اور پھر اصل موضوع کی طرف آئیں گے۔

عصر حاضر میں بنک بہت اہمیت حاصل کر گئے ہیں اور کئی اہم فرائض ادا کر رہے ہیں۔ مثلاً زر مبادلہ کی آسانی، پیداوار میں سہولت اور سرمائے کی طاقت میں اضافہ۔ اسی لیے اسباب اقتصاد کے



نزدیک بنکوں کا وجود لازمی ہو گیا ہے۔ بالخصوص ان ممالک میں جہاں آزاد معیشت ہے کیونکہ وہاں پیداواری سرگرمیاں افراد اور خاص اداروں کے ہاتھ میں ہیں۔ ان کے برعکس اشتراکی ممالک میں تمام پیداواری سرگرمیاں حکومت کے ہاتھ میں ہیں۔

عام لین دین میں بنک نقدی کا تبادلہ آسان بنا دیتے ہیں، یا قرض دیتے ہیں جس پر حق خدمت وصول کرتے ہیں۔ بنکوں کے ذریعے ادائیگی کے کئی طریقے ہیں:

۱۔ چیک: کوئی کھاد دار اپنے بنک کو اس کے ذریعے بنک کو پیغام دیتا ہے کہ اس کے جمع شدہ سرمائے میں سے کسی معین شخص کو یا اس چیک کے حامل کو اتنی رقم ادا کر دے۔

۲۔ کریڈٹ کھونا: جو بنک کسی کھاتہ دار کو دیتا ہے۔ اس کے ذریعے بنک کسی کھاتہ دار کے نام معینہ رقم رکھ دیتا ہے جس سے وہ کھاتہ دار اپنی سہولت اور ضرورت کے مطابق

قسط وار پیسہ نکال سکتا ہے۔ یہ قرض کی ایک صورت ہے جس پر بنک سود وصول کرتا ہے۔ ڈرافٹ: اس کے ذریعے بنک کسی اور بنک کو یا کسی اور ملک میں اپنی شاخ کو کسی

کھاتہ دار کے بارے میں ہدایت دیتا ہے کہ اُسے فلاں فلاں مطلوبہ رقم دے دی جائے اس کام کے لیے بنک معمولی سائیکیشن وصول کرتا ہے اور اس خدمت کے لیے سود نہیں لیتا۔

۲۔ پرامیسری نوٹ (درستی ہنڈی): یہ وہ تحریری دستاویز ہے جو اس نوٹ کا جاری کرنے

والا، اس غیر مشروط ضمانت کے ساتھ دیتا ہے کہ عندالطلب یا کسی معین مدت کے بعد کسی مخصوص شخص کو یا اس نوٹ کے حامل کو مقررہ رقم ادا کر دے گا۔ اگر کوئی شخص چاہے تو تاریخ مقررہ سے قبل ہی رقم وصول کر سکتا ہے اور اس کے لیے وہ بنک کو مقررہ شرح سے سود ادا کرتا ہے۔

۵۔ بل آف ایکسیپنچ (ہنڈی): یہ بھی تحریری معاہدہ ہے جس کا جاری کرنے والا غیر مشروط

طور پر کسی شخص کو حکم دیتا ہے کہ معینہ مدت کے بعد یا عندالطلب اس معاہدے کے حامل کو مقررہ رقم ادا کرے اس پر بھی بنک سود وصول کرتا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی کئی خدمات ہیں جو بنک ادا کرتا ہے، مگر چند معروف طریقے یہی ہیں

ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ چیک اور ڈرافٹ کے سوا، باقی سب خدمات کا معاوضہ سود کی شکل میں وصول کیا جاتا ہے۔

جہاں تک پیداوار میں مدد دینے کا تعلق ہے تو بنک اس کے لیے بلا سود قرض نہیں دیتا اس میں شک نہیں کہ اس میدان میں بنک جو خدمات سرانجام دے رہے ہیں، ان کا افزائش پیداوار سے گہرا تعلق ہے، لیکن سود کے لین دین کی وجہ سے اس کے نتائج برعکس ثابت ہو رہے ہیں۔

اسی طرح بنک سرمائے کی طاقت مضبوط کرتے ہیں جو پیداواری اداروں میں مستعمل ہے۔ اس سے پیداوار بڑھانے میں مدد ملتی ہے اور صاحب پیداوار کا بوجھ بھی کم ہوتا ہے مگر سود کا لین دین اس کو آلودہ کر دیتا ہے۔ بنک اپنے کھاتہ داروں یا قرض مانگنے والوں کو جمع شدہ سرمائے ہی سے قرض دیتے ہیں کیونکہ بنک کے مالکوں کا اپنا ذاتی سرمایہ اس نسبت سے بہت کم ہوتا ہے۔ بنک انہی کھاتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور انہیں کوئی بوجھ برداشت نہیں کرنا پڑتا۔ وہ تو اپنا منافع پورا لے لیں گے خواہ قرض مانگنے والا فائدہ اٹھائے یا نقصان۔ لوگ اپنا زائد یا فالتو سرمایہ بنک میں جمع کرواتے ہیں اور بنک ان رقوم سے قرض دے کر سود وصول کرتا ہے، جس سے مصنوعی قوت خرید پیدا ہوتی ہے یا نقدی کی قیمت گر جاتی ہے۔ بنکوں کی بدولت کئی نقصانات پہنچ رہے ہیں، مثلاً مقررہ اور پیشگی طے شدہ فوائد کے حصول کی وجہ سے بنک قرض لینے والوں سے غیر قانونی طور پر دولت جمع کر رہے ہیں اور ان قرض لینے والوں کے بڑے پھلے میں شریک نہیں ہوتے کساد بازاری کے زمانے میں بنک نہ صرف قرضوں کی ادائیگی کم کر دیتے ہیں بلکہ بعض اوقات بالکل ہاتھ روک لیتے ہیں۔ یہ "بسط و قبض" (دینا اور روک لینا) خود بنکوں کے مالکوں کے اختیار میں بھی نہیں رہتا، جس سے معاشی صورت حال میں اضطراب پیدا ہوتا ہے اور کئی مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔

## سودی کاروبار کے مقابلے میں اسلامی متبادل

اب ہم ایسے بنکوں اور کاروباری اداروں کا تذکرہ کرتے ہیں، جن کی بنیاد اسلامی ہے، جو سودی معاملات سے پاک ہیں اور وہی خدمات سرانجام دیتے ہیں یعنی اقتصادی سرگرمیوں میں اضافہ اور ملک میں اقتصادی بنیاد فراہم کرنے کے لیے مشارکت، جو دوسرے بنک دیتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ بنک دو طرح کے ہیں: ایک عام کھاتہ داروں کے بنک اور دوسرے طویل منصوبوں یا صنعتی پیداوار کے لیے بنک۔ کھاتہ داروں کے بنک تو ہم "مضاربہ" کے معاہدے پر قائم کر سکتے ہیں اور صنعتی بنک مال میں شرکت کے معاہدے پر۔ دونوں معاہدوں کو شریعت اسلامیہ

جائزہ قرار دیتی ہے اور ان کے لیے ایسی تنظیم قائم کرتی ہے جو ہمارا ہدف پورا کر سکتی ہے۔  
عقد مضاربہ کے ضروری احکام یہ ہیں:

۱۔ یہ عقد یا معاہدہ طرفین میں ہوگا ان میں سے ایک مال فراہم کرے گا اور دوسرا خدمات اور اسے  
”مضارب“ کہیں گے۔

۲۔ معاہدہ کرنے والے مقررہ تناسب سے نفع میں شریک ہوں گے، اس شرط کے ساتھ کہ ان  
میں سے ہر ایک کا نفع برابر ہوگا۔

۳۔ اگر فریقین میں سے کوئی اپنے لیے منافع کی مقدار مقرر کر لے تو مضارب بن ختم ہو جائے گی کیونکہ  
اس بات کا احتمال ہے کہ دوسرے یا باقی فریقوں کا منافع اس حد تک نہ پہنچ سکے۔

۴۔ مضارب کے لیے صرف نفع میں حصہ ہے اور سرمائے میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اسی  
طرح مضارب کو خسارے کا متحمل بنانا غلط ہوگا۔

۵۔ مضارب سرمائے کا امین ہوگا اور اسے اپنے پاس امانت خیال کرے گا۔ وہ اس کے تصرف  
میں صرف رب المال کی طرف سے کاروبار کے لیے ہوگا۔ اگر کاروبار میں نفع ہوگا تو وہ اس  
میں شریک ہوگا اور اگر اس میں خسارہ ہو تو اسے کچھ نہ ملے گا۔

اگر اسے دور حاضر کے بنکوں کی نظر سے دیکھا جائے تو کھاتا دار سب کے سب ”رب المال“  
سمجھے جائیں گے اور جو بنک سرمایہ فراہم کرے گا وہ ”مضارب“ ہوگا سوائے اس کے کہ بنک کے لیے  
نفع کی مقدار مقرر ہوگی۔

بنک اس سرمائے کو کاروبار وغیرہ میں لگائے گا اور کاروبار کرنے والوں کو قرض دے گا اسے  
تخریب میں لاکر اس سے بہتر نتائج حاصل کرے گا۔ اس قسم کا بنک سودی بنکوں سے زیادہ اس بات  
کا کوشاں ہوگا کہ کاروبار میں منافع حاصل ہو کیونکہ منافع میں اس کا بھی حصہ ہے، اور آنکھ لیکر دوسرے  
بنک ہر حالت میں نفع چاہیں گے اور انہیں کاروبار کی ترقی سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔

وہ کاروبار جن میں ہمارا بخیریز کردہ بنک شریک ہوگا، ایسے منفعت بخش بھی ہو سکتے ہیں اوسط  
درجے کے بھی اور خسارے میں جانے والے بھی، اگرچہ ایسے زیادہ نہیں ہوں گے، کیونکہ بنک تو  
صرف اسی کاروبار میں شرکت کرے گا جو نفع دے گا۔ سال کے آخر میں یا چھ ماہ بعد (جیسا کہ طے کر  
لیا جائے)، بنک نفع نقصان کا حساب لگائے گا جس میں اس نے سرمایہ لگا رکھا ہوگا اور یہ سرمایہ

کھاتہ داروں یا دوسرے شراکت داروں کا ہوگا۔ اس حساب کتاب کے بعد، بنک اپنے عمومی اخراجات جن میں تنخواہیں اور دوسرے اخراجات شامل ہیں، وضع کرے گا، جن کی اجازت قانون دیتا ہے، اور باقی ماندہ منافع کو تمام کھاتہ داروں اور شرکار میں طے شدہ معاہدے کے مطابق، برابر برابر تقسیم کرے گا۔

## بنک اور بار آور شراکتوں کے مالکوں میں رابطے کی صورت

کھاتے داروں سے نسبت کے لحاظ سے ہم نے بنک کو "شریک مضارب" تصور کیا، لیکن کاروباری اداروں سے اس کی نسبت "رب المال" کی ہوگی اور کاروباری اداروں کے مالک مضارب شمار ہوں گے اور اس "رب المال" اور مضارب دونوں کے حقوق و فرائض وہی ہوں گے جو ہم نے پہلے اس سلسلے میں بیان کیے ہیں۔ کاروبار وغیرہ سے جو منافع حاصل ہوگا اس کی حد بنک کے لیے باہمی اتفاق رائے سے مقرر کی جائے گی۔ اگر کسی کاروبار کو خسارہ ہوگا تو اسے ہمت دی جائے گی اگر یہ خسارہ مالکوں کی کسی غفلت یا بد نیتی کے سبب نہ ہو تو بنک کو خسارہ برداشت نہیں کرتا پڑے گا لیکن اگر غفلت وغیرہ ثابت ہو جائے تو اسے فریق جارج سمجھا جائے گا اور اس پر ضمانت لازم آئے گی۔

صنعتی بنکوں میں بھی مضارب کا طریق اپنایا جائے گا بشرطیکہ سارا سرمایہ بنک نے فراہم کیا ہو اور کاروبار کا مالک اس میں قطعی حصہ دار نہ ہو۔ اس لحاظ سے بنک کو "رب المال" اور کاروبار کے مالک کو شریک مضارب سمجھا جائے گا۔

صنعتوں میں سرمایہ کاری کے معاملے میں کاروبار کا مالک (شریک مضارب) صرف محنت نہیں دے گا بلکہ سرمائے کا حصہ بھی فراہم کرے گا۔ اس طرح یہاں "شرکت" کا معاہدہ طے پائے گا اور منافع کی تقسیم بنک اور کارخانے داروں کے فراہم کردہ سرمائے کے، اور کارخانہ دار کی محنت کی قیمت کے تناسب سے ہوگی۔ اس طرح منافع تین حصوں میں تقسیم ہوگا جس کا تناسب بالفاق رائے مقرر ہو سکتا ہے۔ بعض فقہانے مال اور مال و محنت کے اشتمال کی اجازت دی ہے۔

عملی صورت میں اس نئے نظام کے نفاذ میں کچھ پیچیدگیاں ضرور پیدا ہوں گی کیونکہ جدید بنکاری کا نظام، نفاذ کے لحاظ سے آسان ہے، لیکن یہ الجھنیں بنڈیچ دور بھی ہو سکتی ہیں، جس طرح موجودہ

بنکاری نظام میں ہوا اور لوگ اس سے مالوس ہو گئے، البتہ یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ پیچیدگیوں کے ڈر سے سود اور اس کی حرمت کو حلال سمجھتے رہیں۔

صارفین کے لیے دیئے جانے والے قرضوں پر سود کا متبادل اسلام میں آسان ہے اگر کسی مملکت اسلامی میں زکوٰۃ کا حصول اور اس کی تقسیم کے لیے حکومت اور سے مقرر کر دے تو صارفین میں سے زکوٰۃ کے مستحق اس سے اپنا حصہ لے کر حاجات پوری کر سکتے ہیں۔ غیر مستحقین کو زکوٰۃ کے فنڈ میں سے کم مدت کے لیے قرض حسنہ دیا جاسکتا ہے اور اس کے لیے ان سے باقاعدہ ضمانت لی جاسکتی ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اسلام نے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے تعاون اور ایک دوسرے کی دستگیری کی ترغیب دی ہے کیونکہ ان میں اخوت، وحدت، فکر اور وحدت عقیدہ کا رشتہ ہے۔ اس تعاون کا سب سے بڑا مظہر قرض حسن ہے جو دینے والا، لینے والے کو، محض خدا کی خوشنودی کے لیے دیتا ہے۔

## حواشی

۱- سید قطب: العوالم الاجتماعیة فی الاسلام

۲- آنحضرتؐ سے مروی ہے:

”ہر مسلمان کا خون، مال اور آبرو دوسرے پر حرام ہے۔“

مختور نے معاذ بن جبلؓ کو یمن روانہ کرنے ہوئے فرمایا تھا:

”اگر وہ لوگ تمہاری اطاعت کریں تو انہیں بنا دو کہ اللہ نے ان پر صدقہ فرما دیا ہے جو

ان کے امیروں سے لے کر فقرا کو دیا جائے گا۔ اگر وہ اس بات کو قبول کر لیں تو خیر دار! ان

کے پاکیزہ مال کو مت چھوٹا۔“

## امدادِ باہمی

اسلام نے جس امدادِ باہمی کی حمایت کی ہے، وہ معاصر نظاموں سے بنیادی اختلاف رکھتی ہے۔ دورِ حاضر کے معاشرہ میں (خواہ وہ فرد کی آزادی پر قائم ہوں جہاں حکومت کو مت کو شعاع سمجھتی ہے یا ہر چیز حکومت کے کنٹرول میں ہو) امدادِ باہمی کے ادارے تشکیل دیئے گئے ہیں۔ ان میں اور اسلامی طریقہ امدادِ باہمی میں کئی نمایاں فرق ہیں:

(۱) جدید نظامائے حکومت میں، امدادِ باہمی کے ادارے صرف مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہیں۔ وہ اپنے شہریوں کے لیے ایک قسم کی ضمانت مہیا کرتے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی کو ایسی دشواری پیش آجائے جو اس کے اہل خانہ کی زندگی یا صحت پر اثر انداز ہو تو اسے دور کیا جاسکے۔ اس کے عکس، اسلام میں امدادِ باہمی، اس مادی صورت سے کہیں زیادہ وسیع اور کشادہ ہے، اور مادی ضروریات کے ساتھ ساتھ نیکی، فرد کی بھلائی اور معاشرے کے مفاد کا بھی خیال رکھتی ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

”تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان“ (المائدہ: ۲)

اس مفہوم میں امدادِ باہمی کا مطلب یہ ہے کہ نیکی کی دعوت، منکرات کے ازالے، ضعیفوں کی حمایت اور فقراء اور بے دست و پا افراد کی ان کے حسبِ ضرورت مدد میں ایک دوسرے سے تعاون کیا جائے۔ امت کے ہر فرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہ نازک احساس رکھتا ہو کہ اجتماعی طور پر کیا چیز بُری ہے اور امت کا مصلح نظر کیا ہے اور اس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

(۲) غیر اسلامی معاصر نظاموں میں امدادِ باہمی صرف ایک ہی حلقے یعنی فرد اور جماعت کے دائرے میں محصور ہے جبکہ اسلام میں یہ سب حلقوں اور دائروں کو محیط ہے، یعنی فرد اور اس کی ذات فرد اور اس کے اہل خانہ، فرد اور جماعت امتِ اسلامیہ اور دوسری اقوام، موجودہ نسل اور آنے والی نسلوں کے مفادات کو پیش نظر رکھنا، فریضہ ہے۔

فرد کا اپنی ذات سے تعاون یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کی تطہیر و تزکیہ کرے، خواہشات سے اُسے روکے، اُسے نیکی کے راستے کی طرف مائل کرے، اور اس کے سامنے اتنی گنجائش رکھے کہ وہ ان حدود کے اندر زندگی سے متمتع ہو جو اس کی فطرت میں بگاڑ پیدا نہ کرے۔ اپنے اہل خانہ سے تعاون اس لیے ضروری ہے کہ یہ معاشرے کی عمارت کی خشتِ اول ہے اور فرد اپنے خاندان کے زیرِ سایہ اور اس کی حفاظت ہی رہ سکتا ہے۔ اسلام نے ایک ہی خاندان کے افراد میں مضبوط رشتوں کی تاکید کی ہے اور مودت اور باہمی ہمدردی قائم کرنے کی مادی اور معنوی ضمانت دیا کرنے کو کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

”ووصینا الانسان لوالديه حملته امه وهن ورضاله

فی عامین ان اشکری و لو الدیء۔“ (لقمان: ۳۱: ۱۲)

اس کے بعد فرمایا:

”واولوا لرحام بعضهم اولی ببعض فی کتاب اللہ“ (الاحزاب: ۳۳: ۶)

ایک ہی خاندان کے افراد میں امدادِ باہمی اور تعاون کو فروغ دینے کے لیے اسلام نے دو بہت بڑے اور انقلابی اعلان کیے: وراثت اور نفقہ۔ ان دونوں کے بارے میں کئی احکام صادر ہوئے اور کئی فرائض عائد کیے گئے، وراثت کے ذریعے ترکے کی تقسیم اور فرد کے لیے نان نفقہ کی ضمانت سے معاشرے کو اس ہدف کے حاصل کرنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے، جو اسلام کا ان قوانین سے مقصود تھا۔

فرد اور جماعت کا تعاون زکوٰۃ کے نظام سے حاصل ہوتا ہے جس پر ہم تھوڑی دیر بعد گفتگو کریں گے۔

(۳) تیسرا فرق یہ ہے کہ معاصر معاشرہ نے امدادِ باہمی کے احکام افراد کی اور ان کی جماعتوں کی طرف سے برہمابری کے مطالبات اور ہڑتالوں وغیرہ کے بعد جاری کیے۔ اگر اثرتراکی اور



سرمایہ دارانہ نظاموں میں فکری اختلاف نہ ہونا تو شاید افراد کو اس کی رعایتیں بھی نہ ملتی اور شاید ان کا کلا ہی گھونٹ دیا جاتا، کیونکہ دونوں نظاموں پر مادی چھاپ ہے اور دونوں کا طریق کار ایک ہی ہے۔ دونوں کا مقصود مادی منفعت ہے اور ان کا رجحان انسانی مفادات کی نگہداشت سے بڑھ کر مادی مفادات کے تحفظ کی طرف ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام اس اصول کو لوگوں کے مطالبے اور شور و غوغا کے بغیر ہی تسلیم کرتا ہے، بلکہ اسلام نے تو اسے ایک قسم کی عبادت کا درجہ دے دیا ہے جس کے ذریعے انسان اپنے رب کا تقرب حاصل کر سکتا ہے۔

(۴) چونکہ فرق یہ ہے کہ معاصر نظام جب اس اصول کو تسلیم کرنے میں تو ایک ایسا مادی فریضہ بنا دیتے ہیں جس کی پابندی فرد، جماعت اور مختلف اقتصادی اداروں پر لازم ہے۔ جمہوری نظام میں حکومت اس اجتماعی رعایت پر اٹھنے والے اخراجات، ٹیکسوں اور بیمہ کی اقساط کے ذریعے پیشگی ہی وصول کر لیتی ہے۔ انٹرا کی نظام میں ٹیکسوں اور بیمہ کی اقساط کے علاوہ، حکومت، محنت اور سرمائے دونوں کی بیک وقت مالک ہوتی ہے اور ”حق خدمت“ بہ صورت وصول کر لیتی ہے۔ دونوں نظاموں میں فرد کے لیے جماعت کی امداد اور جماعت کے لیے فرد کی امداد تعاون کی اساس نہیں بلکہ جو کچھ فرد طوعاً و کرہاً دے دے یا پیشگی کٹوا دے، وہی اس کی بنیاد ہے۔ اسلامی امداد باہمی کی بنیاد اس سرمائے پر ہے جو افراد بردار و رغبت پا خدا کے حکم سے دیتے ہیں اور حکومت اُسے صرف مستحقین پر خرچ کرتی ہے۔ وہ مال جو زکوٰۃ کی صورت میں جمع ہوتا ہے۔ اور جو اسلام میں اجتماعی انصاف کی ریڑھ کی ہڈی ہے) اصل سرمایہ ہے، آمدنی نہیں جیسا کہ دوسرے ہم عصر نظاموں میں متصور ہوتا ہے۔ اس سے معاشرے کے تمام طبقوں کو مناسب مادی زندگی گزارنے کے وسائل میسر آتے ہیں۔

(۵) ہم عصر نظام، افراد کی مادی سہولتیں ہم پہنچانے کے لیے قانون کا سہارا لیتے ہیں، اسلام، قانون کے ساتھ ساتھ ضمیر انسانی کو بھی بیدار کرتا ہے اور امت کے افراد کو بے کس افراد کا خیال رکھنے اور فرائض ادا کرنے کا احساس دلاتا ہے، جس طرح مسلمانوں کے لیے دوسرے اہم معاملات میں اس کا طریقہ عمل ہے اس طرح اسلام چاہتا ہے کہ انفرادی احساس میں اضافہ ہو اور اُسے یاد رہے کہ اس پر کیا کیا فرض ہے۔ اس طرح اسلام صدقہ اور خیرات کی طرف توجہ دلاتا ہے اور ”الغنائی فی سبیل اللہ“ کو پسند کرتا ہے کہ دنیا میں اس کا اجر ہے اور آخرت میں ثواب،

اور اللہ کے عذاب اور غضب سے بچنے کی سبیل ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اجتناب نفس کو کئی آفات اور نقصانات میں ڈال دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَالْفُقَوَانِي سَبِيلَ اللَّهِ وَلَا تَلْقُوا أَمَّا يَدْفِكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ“ (البقرة ۲: ۱۹۵)

اللہ کی راہ میں جو خرچ کیا جائے، اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اسے دگنا دگنا کر دے گا۔  
”مَنْ ذَا الَّذِي يقرضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيضاعفه له وله اجرٌ كَرِيمٌ“ (الحديد ۵: ۱۱)

جو مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے اس کا ثمرہ بہشت ہے:

”وَمِثْلَ الَّذِينَ يَنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَبْتَئْتُمْ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ كَمِثْلِ جَنَّةٍ بَرْبُورَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضَعْفِينَ فَإِنْ لَمْ يَصِبْهَا أَوَابِلٌ فَطَلَّ، وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ“ (البقرة ۲: ۲۶۵)

ان ثمرات کو قرآن مجید نے بڑی وضاحت اور دلالت سے بیان کیا ہے:

”مِثْلَ الَّذِينَ يَنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمِثْلِ حَبَّةٍ أَتَيْتَ بِسَلْعٍ سِتَائِلٍ فِي كُلِّ سَنَابِلَةٍ مِائَةِ حَبَّةٍ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ“

(البقرة ۲: ۱۱۰)

اسلام میں اجتماعی انصاف کے حصول کے لیے زکوٰۃ سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے دین کا ایک رکن، اور ایمان کے فرائض میں سے ایک فرض بنایا ہے۔ صاحب نصاب افراد کے لیے یہ اللہ کا حق ہے، اور اس حق کا مطالبہ اسلامی مملکت شریعت کے حکم اور اپنی تمام طاقت سے کر سکتی ہے۔ زکوٰۃ کی اہمیت اس سے واضح ہے کہ قرآن مجید میں اس کا ذکر متعدد مقامات پر نماز کے ساتھ آیا ہے، مثلاً

”وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَادْعُوا إِلَى التَّوْحِيدِ“ (البقرة ۲: ۲۳)

”فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا وَالْحَنِيفِيَّةَ الْبَرَّةَ“ (البقرة ۲: ۱۴۳)

”الَّذِينَ آمَنُوا أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ“ (الحج ۲۲: ۲۱)

صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا باہم ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زکوٰۃ ایسی خدمات یا صدقہ نہیں جسے انسان کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ مالدار کے مال پر حق ہے جس کا ادا کرنا فرض ہے اور امام پر

واجب ہے کہ وہ مالغین زکوٰۃ کے خلاف جنگ کرے۔ ایک حدیث میں جو ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ "جب رسول اللہؐ کی وفات ہوئی اور ابو بکرؓ مسندِ خلافت پر بیٹھے تو عربوں میں سے کئی اسلام سے پھر گئے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک وہ لا الہ الا اللہ نہیں کہتے (یعنی مسلمان نہیں ہو جاتے) جس

نے یہ کہہ دیا کہ اس کا مال اور جان محفوظ رہا باقی اس کا حساب کتاب اللہ تعالیٰ پر ہے" حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا: "خدا کی قسم میں ہر اس شخص سے جنگ کروں

گا جس نے صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں فرق کیا کیونکہ زکوٰۃ حق المال ہے۔ خدا کی قسم! اگر کسی نے ایک رسی تک دینے سے انکار کیا جو وہ رسول اللہؐ کو ادا کرتا تھا تو

میں اس پر بھی جنگ سے گریز نہ کروں گا۔" خدا کی قسم! (ابو ہریرہؓ نے کہا) اللہ

ہی نے ابو بکرؓ کا سینہ جنگ کے لیے کھول دیا تھا، تو میں جان گیا کہ یہی صحیح راستہ ہے۔

بعض مصنفین نے اظہار کیا ہے کہ چونکہ زکوٰۃ کو قرآن مجید میں صدقات میں سے ایک صدقہ

کہا گیا ہے، اس لیے یہ احسان کی ایک قسم ہے، جو لازم نہیں اور لوگوں کو اس کا پابند بنانا درست

نہیں۔ یہ رائے مسترد کیے جانے کے قابل ہے۔ یہ محض مغرب کے سرمایہ دانانہ نظام اور مشرق

کے انٹرا کی نظام کی تقلید میں کہا جا رہا ہے، جو کلبستانی نظام اور قرون وسطیٰ کے قوانین پر چل رہے

ہیں (زکوٰۃ کو "صدقہ" اس لیے کہا گیا کہ یہ بھی دوسرے مالی اخراجات کی طرح ہے، مگر قرآن نے

خود ہی اسے خیرات وغیرہ سے الگ کر کے، فرض قرار دیا ہے) اس کا فرض ہونا اس سے بھی ظاہر

ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد مسلمانوں نے جو پہلی جنگ لڑی وہ ان عربوں کے خلاف تھی جنہوں نے

ادائے زکوٰۃ سے انکار کر دیا تھا (انہیں "حروبِ ردہ" کہا جاتا ہے) اسلامی حکمرانوں نے اس

شخص کے، جو کلمہ اور صلوٰۃ ترک کر دیتا ہے اور اس کے جو زکوٰۃ ترک کر دیتا ہے، مابین فرق

کرنے سے انکار کر دیا۔

زیادہ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہم زکوٰۃ کے موٹے موٹے احکام پیش کر دیتے ہیں

زکوٰۃ فریضہ مالی ہے، اور بیشتر فقہاء اس پر متفق ہیں کہ اسے مال کے مطابق عائد کیا جاتا

ہے۔ یہ اس مال پر واجب ہے جو بڑھ رہا ہو یا بڑھنے کی اہلیت رکھتا ہو، اس لیے انسان کی

اصلی ضرورتوں مثلاً بلبوسات، ذاتی، ذاتی جائے سکونت اور ذاتی سواری اس سے مستثنیٰ ہیں۔ عارضی یا کم مدت کے مال پر بھی زکوٰۃ فرض نہیں۔ مال زکوٰۃ پر ایک سال گزرنا ضروری ہے اور یہ ایسا مال ہو جو ضرورت سے زائد اور سال کے آخر میں بیچ گیا ہو۔ پھر ایک حد سے کم مال پر بھی زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی۔ سادہ سا اصول یہ ہے کہ انسان حالت فقر سے حالت تو لکڑی میں داخل ہو گیا ہو تو وہ صاحب نصاب ہو جاتا ہے۔

چار قسم کے مال پر زکوٰۃ واجب ہے: جانور، مثلاً اونٹ، گائے، بکری وغیرہ، زرعی ملکیت اور باغ، نقدی اور مال تجارت۔

جانوروں پر بھی زکوٰۃ سال گزرنے کے بعد عائد ہوتی ہے جبکہ وہ مقررہ نصاب کو پہنچ جائے (چالیس بھڑ بکریوں سے کم، تیس گائے بیلوں سے کم اور پانچ اونٹوں سے کم پر زکوٰۃ نہیں) اسی طرح نقدی پر بھی حد مقرر ہے (دو سو درہم یا بیس دینار چاندی مگر اس پر ایک سال گزرنا ضروری ہے۔ مال تجارت پر کل قیمت کا  $\frac{2}{4}$  فیصد زکوٰۃ فرض ہے اور اس پر بھی ایک سال کی مدت کا پورا ہونا شرط ہے۔ بعض فقہاء کے نزدیک زیورات پر زکوٰۃ نہیں، سوائے اس کے کہ وہ تجارت کے لیے ہوں، کھیتی باڑی اور باغات اگر چاہی زمین پر ہوں تو نصف عشر اور اگر بارانی ہوں تو عشر وصول کیا جائے گا۔

پہلے اسلامی معاشرے میں بھی چار اصناف مادی ثروت تصور ہوتے تھے، کیونکہ دیہاتی ہو یا شہری معاشرہ، بھی ثروت کی بنیادی اقسام ہیں۔ جہاں تک صنعت کاری تعلق ہے تو یہ اس دور میں فروغ پا گئی ہے اور ان چار بنیادی اقسام پر انسانی اضافہ ہے، اور تجارت ہی سے مشابہ ہے۔ اس پر اٹھنے والے اخراجات، مزدوری، خام مال کی قیمت وغیرہ خارج کر کے، تیار شدہ مال کو تجارت کا مال فرض کر کے زکوٰۃ عائد کی جائے گی۔

زکوٰۃ کی معروف انواع میں اگر کسی نوع کا ذکر نہ ہو تو اسے ان چاروں اصناف پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے ان گھوڑوں کو بھی مال زکوٰۃ میں شامل کر لیا تھا جو تجارت کے لیے رکھے جانے تھے، اور امام احمد بن حنبلؒ نے مسکئی مکانوں کے سوا دوسرے مکانوں کو شامل کر لیا تھا۔ نئی چیزوں میں قیاس کرنے ہوئے کسی سبب یا علت کو دیکھا جائے گا، مثلاً کرنسی نوٹ، چاندی اور سونے ہی میں شمار ہوں گے، یا انٹرنس جس کی قیمت کو مد نظر رکھا جائے گا۔ اسی طرح بنکوں وغیرہ

کے حصص اور سٹیفکیٹ وغیرہ ہوں گے۔

اس میں ”فطرانہ“ بھی شامل کر لینا چاہیے جو ہر سال عید الفطر کے موقع پر ہر انسان لازماً ادا کرتا ہے اور سربراہ خاندان تمام افرادِ خانہ کی طرف سے دیتا ہے۔  
 زکوٰۃ ہر اس چیز پر عائد ہوگی جو انسان خود کماتا ہے یا کاروبار وغیرہ کے ذریعے جمع کرتا ہے اگر وہ صاحبِ نہیں تو اس سے کچھ نہیں لیا جائے گا اور اگر سال کے بعد اس کے پاس زیادہ مال ہے تو اس پر دس فیصد سے لے کر طحانی فیصد تک وصول کیا جائے گا اگر اس کی وصولی اور تقسیم مناسب طریق پر ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ معاشرے سے تنگ دستی کا بھوت بھاگ جائے گا اور افراد کی طویل مدت کی یا فوری ضروریات پوری ہو سکیں گی۔ زکوٰۃ کی شرح اور نصاب جو بالعموم رائج ہے، قلیل ترین شرح ہے جو مسلمان ادا کرتے ہیں۔ آیات قرآنی تو اشارہ کرتی ہیں کہ مسلمان کے مال پر اللہ کا حق اس سے بھی زیادہ ہے :

”یس الیوان تو تو اوجو حکم..... واقام الصلوٰۃ و آتی الزکوٰۃ“ (البقرہ ۲ : ۱۷۷)  
 اگر زکوٰۃ معاشرے کی حاجات کو پوری طرح روا کرنے کی ضمانت دینے سے قاصر ہو تو اضافی اتفاق مسلمانوں پر واجب ہو جاتا ہے۔

جہاں تک زکوٰۃ کے مصارف کا تعلق ہے تو قرآن مجید نے انہیں خود ہی مقرر فرما دیا ہے۔  
 ”انما الصدقات للفقراء..... واللہ علیم حکیم“ (التوبہ ۹ : ۷۰)  
 ان مصارف کو اگر باریک بینی سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ اسلامی معاشرے میں افراد کی ضروریات پورا کرنے کے ہدف یہ ہیں: کھانے پینے کی اشیاء مانگنے کی ذلت سے بچاؤ، انسان کی حیثیت بشری حاصل کرنے اور اسے تقویت دینے کے لیے ایک دوسرے کی مدد، معاشرے کی اعلیٰ اقدار کو زوال اور بے حسی کی نذر نہ ہونے دینا اور دشمنوں کو اسلامی معاشرے کی مائل کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

فقراء اور مساکین، اور انہیں کی مانند ضعیف لوگ، بے روزگار، بیمار اور معذور اور حاجتمند غلام یا آج کے دور میں دوسری قوم کے زیر حکومت پسے والے افراد، مفروض، جو کسی طرح قرض ادا نہ کر سکیں، مشکلات میں گرفتار لوگ وغیرہ کی امداد زکوٰۃ ہی سے کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح تبلیغ دین، اسلامی اقدار کی حفاظت اور اسلامی معاشرے کا دفاع زکوٰۃ ہی سے ہو سکتا ہے

ایسے مسافر جو سفر میں مالی پریشانی میں مبتلا ہوں، زکوٰۃ کے مستحق ہیں۔ اسلام کے دشمنوں کی تالیفِ قلوب کے لیے بھی زکوٰۃ سے مالی مدد لی جاسکتی ہے۔

یاد رہے کہ زکوٰۃ کا استعمال تعلیم، صحت، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر و مرمت وغیرہ جائز نہیں کہ یہ معاشرے کو دوسرے طریقوں سے سہارا بخام دینے چاہئیں اور ان کے لیے حکومت ٹیکس وغیرہ لگا سکتی ہے۔ یہ افراد اور معاشرے کی مادی اور تمدنی ضرورتیں ہیں، جبکہ زکوٰۃ کو معاشرے کی تقویت، انسانی تعلقات استوار کرنے اور ایک دوسرے سے بھائی چارہ اور تعاون بڑھانے میں استعمال کیا جاتا ہے، اور دونوں مقاصد کے حصول کو آپس میں خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے زکوٰۃ، ارکانِ دین میں سے ہے اور دوسری تمام عبادات کی طرح ایک عبادت ہے۔

## حواشی

- ۱- سید قطب: "العدالة الاجتماعية في الاسلام" ص ۶۳، طبع ہشتم
- ۲- الدكتور محمد البهي: "الفكر الاسلامي والمجتمع المعاصر، مشكلات الأسرة والتكافل" ص ۳۲۵۔
- ۳- سید قطب: "العدالة الاجتماعية في الاسلام" ص ۸۳
- ۴- نیل الاوطار: ۱۲۶/۴
- ۵- محمد البهي: مرجع سابق، ص ۳۲۹
- ۶- زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے فرائض پر بحث کے لیے دیکھئے: "العدالة الاجتماعية في الاسلام" از سید قطب اور سیاست المال والحکم فی الاسلام از عبد القادر عودہ

## عائلی نظام

خاندان ایک اجتماعی ادارہ ہے اور زندگی کی ضروریات اور انسانی فطرت سے جنم لینا ہے جنس بشری کی بقا اور اجتماعی وجود کے دوام کے لیے یہ اہم ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ضرورت انسان کی فطرت ہی میں ودیعت کی ہے۔

در اصل خاندان ایک مرد اور ایک عورت کے یکجا ہونے، مستقل رفاقت پیدا ہونے اور مل جل کر رہنے کا نام ہے جسے معاشرہ سبذ قبول عطا کرتا ہے۔ انسانی تاریخ کا کوئی دور خاندان کے وجود سے خالی نہیں رہا اور زمین پر پہلے ہی بشری اجتماع سے وجود میں آ گیا تھا۔ انسانی معاشرے میں اس کی مستقل حیثیت رہی ہے جبکہ دوسرے اجتماعی گروہ عارضی اور منتشر ہے پس اس پر درج ذیل مہم نوات کے تحت بحث کی جاسکتی ہے:

- ۱۔ خاندان کا ارتقاء
- ۲۔ ازدواج اور اس کے فرائض
- ۳۔ اسلامی نظام میں خاندان کا قیام



## خاندان کا ارتقاء

اسی ابتداء ہی سے، خاندان کئی مراحل سے گزرا اور اس میں کئی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ یہ تبدیلیاں خود خاندان کے دائرے میں یا رشتہ داروں کے محور ہیں اور اس کے فرالکھن میں واقع ہوئیں۔ جہاں تک خاندان کے اپنے ہی دائرے میں تبدیلیوں کا تعلق ہے تو اس کے بعض قدیمی نمونے آج بھی افریقہ اور جنوبی امریکہ کے قبائل میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ نمایاں خاندان بدہے کہ قدیم خاندان میں افراد کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ خاندان کے سبب افراد اور رشتہ دار ایک ہی بت کی پوجا کرنے تھے یا ایک ہی دیوتا کو مانتے تھے جس سے ان میں ربط و اتصال پیدا ہوتا تھا۔ قدرتی طور پر اس سے خاندان میں وسعت پیدا ہوتی تھی اور خاندان کا دائرہ وسیع ہوتا تھا۔ اس کے بعد ہمیں یونان اور روم کے معاشرے نظر آتے ہیں جن میں خاندان کسی نسبت یا نسبت پیری کی بنیاد پر قائم ہونے لگے اور افراد خانہ یا رشتہ دار اپنے ہیں سے کسی کو بزرگ مان لیتے تھے یا کسی کو باپ بنا لیتے تھے۔

اسلام سے پہلے مغرب اس نظام سے قریب قریب تھا اور اس کا احوال کسی کو لے پا لک بنانے یا "ذات باہر" کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس نظام کی وجہ سے خاندان کے افراد کم ہونے لگے پھر جب اسلام آیا اور اس نے متنبی بنانے، اپنی برادری میں شامل کرنے یا اس سے خارج کرنے سے منع کر دیا تو خاندان کا حلقہ مزید تنگ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کو اپنے باپ کے سوا، کسی اور سے نسبت پیری رکھنے سے منع فرما دیا:

"ادعوا لآبائکم" (الاحزاب ۳۳: ۵۱)

اس کی وجہ سے خاندان صرف ازدواج کے رشتے تک محدود ہو گیا، اور یہی خاندان کی اصل بنیاد ہے جو توحید اور ان کی اولاد (بالخصوص وہ صغیر سن اور غیر نشاری شدہ ہوں) پر مشتمل ہوں۔ بچوں کی شادی ہو جائے تو ان کا خاندان الگ قائم ہو جائے گا۔

خاندان کے دائرے میں تبدیلیوں سے قرابت داری کے محور میں بھی تبدیلیاں آئیں پرانے زمانے میں کبھی بچوں کو کبھی باپ کو اور کبھی ماں کو کسی بت وغیرہ سے نسبت دے دی جاتی تھی پھر ایک دور آیا کہ ماں، محور قرابت بن گئی۔ کہا جاتا ہے کہ عالی نظام میں یہ خاندان کی قدیم ترین

قسم ہے۔ یہ وہ دور تھا جب لوگوں کا شکار کرنے اور پھیل جمع کرنے پر گزارہ تھا۔ اس وقت ماں استقرار کی علامت تھی کیونکہ وہ ایک ہی جگہ رہتی تھی جبکہ باپ اکثر شکار وغیرہ کے لیے گھومتا پھرتا تھا اس کے بعد وہ دور آیا جس میں باپ، سربراہ خاندان بنا اور اولاد باپ سے منسوب ہونے لگی۔ مادر سری نظام میں، خاندان پھرا ہوا رہتا تھا، جبکہ پدر سری نظام میں وہ ایک جغرافیائی حدود میں پابند ہو گیا۔ یہ وہ دور تھا جب زراعت نے ترقی کی۔

اسلام میں ماں اور باپ دونوں ہی محورِ قرابت ہیں، اگرچہ تمیز باپ کو ہے۔ یہ نیزہ نظام میراث، نان نفقہ اور خاندان کی ذمہ داریاں برداشت کرنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ مغرب کے کئی طبقوں میں اب باپ اور ماں کی تفریق نہیں رہی اور خاندان میں سبھی اور ہیں اور ان کی اولاد ساری کی ساری اس سے چچا، ماموں، پھوپھی خالہ وغیرہ اور ان کی اولاد کی نسبت رفتہ رفتہ زائل ہو گئی ہے۔

جہاں تک خاندان کے فرائض کا تعلق ہے تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہ فرائض فراخی سے تنگ دستی کی طرف تبدیل ہوئے ہیں۔ قدیم زمانے میں خاندان تمام مشترکہ فرائض خواہ وہ دیتی ہوں، اخلاقی ہوں، اقتصادی ہوں، سیاسی ہوں یا قانونی، ادا کرتا تھا۔ یونان و روم میں یہ فرائض خاندان کے سربراہ کی ذمہ داری ہے جو بیک وقت قانون ساز بھی تھا اور منصف تھا اور قوت نافذہ کا مالک بھی پھر کئی اسباب سے یہ ذمہ داریاں سکرٹائی گئیں جن میں سب سے اہم مملکتوں کا قیام تھا اور رفتہ رفتہ تمام سیاسی، قانونی، تنقیدی، اقتصادی اور آخر میں تعلیمی اور تربیتی فرائض معاشرے نے سنبھال لیے۔ اگرچہ تربیت کے معاملے میں اب بھی خاندان کا اثر ہے، بلکہ بنیادی اثر اسی کا ہے کیونکہ گھر یا ابتدائی ماحول بچے کے ذہن پر گہرا ڈالتا ہے اور اس کی زندگی اور شخصیت اسی سے تشکیل پاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ گھر میں بچے، افراد خانہ، بالخصوص والدین کی نقل کرتے ہیں، کیونکہ نقل کرنا، انسان کی جبلت میں ہے، اور یہی تقلید اکثر اوقات منتقل ہو جاتی ہے۔

## ازدواج اور اس کے فرائض

ازدواج وہ رابطہ ہے جو کسی مرد اور عورت میں قائم ہو جاتا ہے، جسے معاشرہ قبول کرے اور اس کے لیے اصول وضع کرے۔ اکثر اوقات یہ نظام خالص معاشرتی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے اور

اسے جبلی یا فطری امور سے تعلق نہیں ہونا۔

## ازدواج پر قبود

مختلف ادوار میں انسانی معاشرہ نے وہ درجے مقرر کیے جن میں ازدواج مباح یا حرام ہے۔ یہ پابندیاں اختلاف دین یا جنس یا معاشرتی اور خاندانی طبقات کی وجہ سے عائد ہوئیں۔ کئی مذاہب، غیر مذہب میں شادی کو حرام قرار دیتے ہیں۔ اسلام نے کسی مسلمان مرد کا شریک عورت سے نکاح حرام قرار دیا اور اہل کتاب عورت سے مباح کہا، لیکن مسلمان عورت کے لیے مرد مشرک ہو یا اہل کتاب، دونوں سے نکاح حرام ہے۔

اختلاف جنس یا معاشرتی طبقات کے سبب یا اس اعتقاد کے باعث کہ بعض لوگ اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز سمجھتے ہیں، جو پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ بعض معاشرہ میں انہیں سند قبول حاصل ہے۔ اسلام نے اس قسم کی پابندیوں کو تاروا قرار دیا اور اعلان کیا کہ نبی نوع انسان ایک ہی باپ اور ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔ رسول اللہ نے اپنی قریب ترین عزیزہ کی شادی اپنے غلام سے کروادی جسے آپ نے آزاد کر دیا تھا اور اسے خود ہی پالا تھا۔ بعض فقہانے جو "کفو" (برابری) کے بارے میں کہا ہے کہ یہ محض مصلحت کی خاطر ہے کیونکہ اگر میاں بیوی میں بہت بڑا تفاوت ہوگا تو جھگڑا پیدا ہوگا۔ یہ شرط اسی وقت ملحوظ رکھی جائے گی جب دو طرفہ دلہن میں سے کوئی اس بنا پر شادی سے انکار کر دے۔ قرابت کی بنا پر جو پابندیاں ہیں وہ کئی معاشرہ میں برقرار ہیں۔ مثلاً بیسائوں، ہندوؤں میں بعض نزدیکی رشتہ داروں سے شادی ممنوع ہے۔ ابتدائی معاشرہ میں بہت سے قریبی رشتہ داروں سے شادی مباح نہ تھی مگر رفتہ رفتہ یہ تعداد کم ہوتی چلی گئی۔ اسلام نے چار انواع کی شادیوں کو حرام قرار دیا ہے۔

(۱) انسان کے باپ دادا اور ماں نانی کے نسبی رشتہ دار یعنی باپ کا باپ کا باپ وغیرہ اور ماں کی ماں کی وغیرہ سے نکاح حرام ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔

”حرمت علیکم امہاتکم“ (النساء: ۲۳)

(۲) جس طرح اصول حرام ہیں، اسی طرح فروع حرام ہیں یعنی بیٹے اور بیٹیاں اور ان کی اولاد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

”ونباتکم“ (النساء: ۲۳)

(۳) والدین کے ذریعہ جہاں تک جائیں یعنی بھائی، بہنیں اور ان کی اولاد جیسا کہ قرآن میں وارد

ہوا: ”واخوانکم ونباتات الاخ ونبات الاخت“ (النساء: ۲۳)

(۴) دادا نانا کے ذریعہ مثلاً چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ۔ ان کی اولاد سے نکاح جائز ہے

یہ ان قبیلوں کے علاوہ ہیں جو مصاہرت اور رضاحت سے پیدا ہوتی ہیں۔

## ازدواج کی مختلف صورتیں

مرد اور عورت کے درمیان جنسی تعلقات کی کئی شکلیں ہیں۔

۱۔ اشتراک جنسی: اس شکل میں کسی معاشرے کی عورت، زوجیت کی پابندی کے بغیر وہاں سب مردوں کی مشترکہ ”ملکیت“ ہوتی ہیں۔ عمرانیات کے بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہ سب سے اولین نظام ازدواج تھا، مگر اسے کوئی نظام کہنا زیادتی ہوگی کیونکہ اس میں کوئی نظم و ضبط اور پابندی نہ تھی۔

۲۔ باہمی ازدواج: اس میں کئی مرد مل کر بیک وقت کئی عورتوں سے رشتہ ازدواج قائم کر لیتے تھے، جو سب کی باہمی بیویاں ہوتی تھیں۔ اس سے بھائی بہنوں میں شادی، قریبی رشتہ داروں سے شادی اور اول بدل کی شادی کرنے کے طریقے نکلے۔

۳۔ چند شوئی ازدواج: یعنی ایک عورت کے کئی شوہر ہوں۔ اس قسم کا نظام اسلام سے پہلے بھی تھا اور اب بھی کئی غیر مہذب قبائل میں ہے۔ اسلام نے اس کی قطعاً مخالفت کر دی کہ اس سے نسل کا پتہ نہیں چلتا اور نسب خلط ملط ہو جاتا ہے۔

۴۔ تعدد ازدواج: یہ نظام کئی معاشروں میں رائج ہے کہ ایک مرد کئی بیویاں رکھ سکتا ہے۔ قدیم معاشروں میں بیویوں کی کوئی حد مقرر نہ تھی اور بعض اوقات مطلقاً اور کبھی کبھی ضرورتاً کئی کئی شادیاں کر لی جاتی تھیں۔ اسلام نے بیویوں کی تعداد محدود کر کے چار کر دی۔

۵۔ ایک شوہر ایک بیوی: یہ نظام بھی قدیم و جدید تمام معاشروں میں پایا جاتا تھا، بالخصوص مسیحی معاشرے میں۔ اسلام اس کا مخالف نہیں۔

## ازدواج کے طریقے

انسانی معاشروں میں قانونی شادی کے بالعموم تین طریقے رائج ہیں :

۱۔ طریقہ نکاح: یہ عام اور مقبول طریقہ ہے کہ کسی مرد اور عورت میں، معاشرے کے معینہ اصولوں کے مطابق، عقد کروا دیا جائے۔ اس میں بعض معاشرے مرد اور عورت دونوں کی رضامندی پر زور دیتے ہیں اور بعض نکاح سے پہلے، منگیتروں کے ملنے جلنے کو بھی ناپسند نہیں کرتے۔ بعض معاشروں میں اس عقد کو پختہ کرنے کے لیے اہل دین کی اجازت لی جاتی ہے جیسا کہ بعض مسیحی فرقوں میں ہے یا ان طبقوں میں جہاں دنیاوی اور دینی معاملات الگ الگ ہیں۔ بعض معاشروں میں نکاح اس وقت تک معتبر نہیں ہوتا جب تک دنیاوی ارباب اختیار یا عدالتیں اس کی تصدیق نہ کر دیں اور ایسے معاشروں میں اہل دین کی موافقت بتانا پسندیدگی کو خاطر میں نہیں لایا جاتا۔ کچھ معاشرے ایسے ہیں جن میں دینی اور دنیاوی دونوں قوانین کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ بالعموم اسلامی ممالک میں ہے، اگرچہ اسلام دونوں میں فرق نہیں کرتا اور اگر نکاح کی تمام ضروری شرائط پوری کر لی گئی ہوں تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ نکاح کہاں پڑھا گیا اور کس نے پڑھایا۔ نکاح کی رجسٹریشن بھی جدید نظام نے عالم کی ہے۔ ورنہ صحت ازدواج کے لیے یہ ضروری شرط نہیں۔

۲۔ لونڈیاں اور غلام: اب یہ طریقہ یعنی بیوی "خریدنے" کا طریقہ دم توڑ چکا ہے اور غلامی کے نظام کے خاتمے سے اس کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے۔ عصر حاضر کے معاشروں میں غلامی مباح نہیں رہی۔ اسلام اس بارے میں واضح موقف رکھتا ہے (کہ مخصوص حالات میں اس کی اجازت تھی) اور عملاً اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے پر زور دیا۔ اب شاید ہی کوئی اسلامی ملک ایسا ہو جہاں غلامی جائز ہو۔

۳۔ زبردستی قبضہ، لوٹ مار کا یہ طریقہ اب تقریباً ناپید ہو گیا ہے اور غلامی کے دور میں اس کا رواج زیادہ تھا۔ دراصل اس کے رواج کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بعض معاشرے (جو اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز تصور کرتے تھے) بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی ماوریتے تھے، اور ایسے معاشرے کے مرد بجز اور دوسرے علاقوں سے لڑکیاں اٹھا لیتے تھے۔

## ازدواج سے متعلق حقوق و فرائض

- شادی ایک معاہدہ ہے، اللہ ہر معاہدے کی طرح اس میں بھی فریقین کے حقوق و فرائض ہیں مثلاً:
- ۱۔ حق نہر: شوہر کے لیے واجب ہے کہ وہ بیوی کو متفقہ رقم بطور نہر ادا کرے، جیسا کہ موجودہ اسلامی نظام میں ہے، یا جیسے کہ گزشتہ زمانے میں رومی قانون اور کلیسائی نظام میں تھا، عورت مرد کو رقم ادا کرتی تھی، مگر بعد دیوانی قوانین نے اسے منسوخ کر دیا۔
  - ۲۔ نان نفقہ: اسلامی نظام کے مطابق، یہ شوہر کا فرض ہے کہ خاندان کو نان نفقہ مہیا کرے اور اگر بیوی مالدار بھی ہو تو اسے گھر کا خرچ برداشت کرنے یا اس میں مشارکت پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے معاشرے جہاں میاں بیوی دونوں کام کرتے ہیں۔ مشارکت کا اصول اپنائے ہوئے ہیں۔
  - ۳۔ خاندان کی سربراہی: ہر معاشرے کی طرح، خاندان کا سربراہ ہونا بھی لازمی ہے۔ اسلامی نظام کے مطابق، شوہر خاندان کا سربراہ ہوتا ہے، اور اس میں بیوی کے حقوق ہیں، یا اس کی شخصیت اور عزت میں کوئی کمی مقصود نہیں۔ اسلام میں عورت ذی مرتبہ اور محترم ہے اور کسی اور معاشرے کی عورت کے مقابلے میں زیادہ حقوق حاصل ہیں، مگر فطرتاً شوہر کا کام زیادہ ہوتا ہے اور خاندان کے مفادات کی نگہداشت کا فرض وہ بہتر طور پر ادا کر سکتا ہے اور یہ فرض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام اس کو جواب دہ بھی قرار دیتا ہے۔
  - ۴۔ تربیتِ اولاد: میاں بیوی دونوں کا فرض ہے کہ وہ اولاد کی تربیت کی نگرانی کریں۔ یہاں تک کہ وہ بلوغت کو پہنچ جائیں۔ مدارس میں تعلیم دلوانے کے باوجود، خاندان کا تربیت کا فرض کم نہیں ہوتا۔
  - ۵۔ عقد نکاح کا احترام۔ میاں بیوی دونوں پر لازم ہے کہ وہ عقد نکاح کا احترام اور التزام کریں۔ اگر ان میں سے نکاح فسخ کر دیا جاتا ہے کئی معاشرے ایسے ہیں کہ جہاں اس قسم کی خیانت کی پروا نہیں کی جاتی۔ عیسائیوں کے فرقوں میں، دیتی ارباب اختیار (پوپ، پادری وغیرہ) کی اجازت کے بغیر نکاح قطعاً فسخ نہیں کیا جاسکتا۔ چند اور فرقے (پروٹسٹنٹ) اس کی دیوانی قوانین کے مطابق اجازت دے دیتے ہیں۔

## اسلام میں خاندان

اسلام نے خاندان پر خاص توجہ دی ہے اور اسے معاشرے کی اساس بتایا ہے۔ اسی لیے اسلام نے شادی پر توجہ دیا ہے۔ اس کے بارے میں شریعت میں منگد و نصوص وارد ہوئی ہیں جس میں شادی کی ترغیب دی گئی ہے اور جوانوں کو شادی کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اسلام نے رہبانیت اور ”چھڑے پن“ کو پسند نہیں کیا۔ سنن ابوداؤد میں عبد اللہ بن مسعود سے مروی ہے۔ انہوں نے کہا: ”میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے سنا کہ تم میں سے جسے گھر بانی کی استطاعت ہو اُسے شادی کر لینا چاہیے کیونکہ اسی سے آنکھ نیچی رہتی ہے اور شرم گاہ کی حفاظت ہو سکتی ہے اور جو تم میں سے اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو اُسے چاہیے کہ روزے لکھے کہ اس کی شہوت کو بھسم کر دے“ مستدرک حاکم میں آیا ہے کہ ابن عباس نے کہا: ”رسول اللہ نے فرمایا: ”کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جو مردوں کے لیے بہتر ہے یہ نیک عورت ہے کہ جب وہ اسے دیکھے تو خوش ہو جائے، جب وہ اس سے دور ہو تو وہ (اس کے لیے) اپنی (عصمت کی) حفاظت کرے اور جب اسے حکم دے تو اس کی اطاعت کرے“

شریعت نے اسی راہ کو اپنایا ہے جس سے وجود میں نرمی اور ملائمت پیدا ہوتی ہے اور اجتماعی زندگی گزارنے آسان ہو جاتا ہے۔ اس سے معاشرہ بھی منہب ہوتا ہے اور خاندان بھی بلند و بیک پینے کے قابل ہو جاتا ہے۔

عملی تجربوں نے ثابت کیا ہے کہ چونکہ والدین کے درمیان رہنے ہیں ان بچوں کی نسبت جو یتیم خانے وغیرہ میں پرورش پاتے ہیں، جسم اور عقل کے لحاظ سے زیادہ مضبوط اور زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس مسئلے کے مطالعے کے وسیع مواقع حاصل ہوئے کیونکہ بے شمار لاوارث بچے ملے جنہیں یتیم خانوں نے پناہ دی۔ اس سلسلے میں انا فرائیڈ نے ایک کتاب بعنوان ”بلا خاندان بچے“ لکھی جس میں وضاحت سے بیان کیا کہ چونکہ لپتے خاندان میں پلتے ہیں وہ بالعموم بات چیت، اطاعت اور تعلیم میں فوقیت رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے اسلام نے مضبوط خاندان کے قیام پر زور دیا ہے اور مسلمانوں کو، حسب استطاعت شادی کرنے کا مشورہ دیا۔

اس مضبوط خاندان کے قیام کو یقینی بنانے کے لیے اسلام نے اور مسلمان فقہاء نے تفصیلی احکام مدون کیے ہیں جو شادی کی ضروری شرائط سے لے کر اس کے اثرات کی وضاحت تک پر حاوی ہیں ان میں وہ حقوق و فرائض بھی شامل ہیں جو نسب، میراث اور نان نفقے سے تعلق رکھتے ہیں، اور شادی کے معاہدے کے اختتام (طلاق و خلع) اور اس کے نتائج تک وضاحت کی ہے

## اسلام نظام میں شادی کے بارے میں شہا کا ازالہ

۱۔ تعداد ازواج: شریعت نے مرد کو ایک سے چار تک کی شادی کی اجازت دی ہے۔ اس اجازت سے اسلام کے دشمنوں نے طرح طرح کے الزامات تراشے ہیں۔ اس بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ: (ا) اجازت کے معنی حکم نہیں ہوتا، اسلام نے چار شادیوں کی اجازت دینے ہوئے اس کا قطعی حکم نہیں دیا بلکہ اسے مشروع اس خیال سے کیا کہ اُسے انسانی فطرت کا لحاظ تھا اور وہ کئی معاشرتی مسائل کو حل کرنا چاہتا تھا جو مطلق تحریم یا پابندی سے پیدا ہو سکتے تھے۔

(ب) اسلام نے یہ شرط عائد کی ہے کہ نان نفقے کے معاملے میں بیویوں میں عدل ضروری ہے۔ جو شخص عدل نہیں کر سکتا یا اپنی ازواج میں امتیاز کرنے پر مجبور ہے تو وہ ایک سے زیادہ شادیاں کر کے گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔

(ج) مرد کے لیے واجب ہے کہ وہ اپنی ازواج اور ان کی اولاد سے یکساں سلوک کرے اور ایک جیسا خرچ ہبیا کرے۔ رسول اللہ نے جب "استطاعت" کا لفظ استعمال فرمایا تو اس کا مفہوم یہی تھا کہ بدنی اور مالی استطاعت رکھتا ہو۔

(د) یہاں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ اسلام سے قبل، تعداد ازواج معروف نظام تھا اور بعض معاشرے بلاقید و شرط تعداد کی اجازت دیتے تھے۔ اسلام نے اسے چار تک محدود کر دیا اور اس کے ساتھ عدل اور اخراجات کی قدرت کی شرط عائد کر دی۔

اسلام کی اس اجازت سے کوئی اسباب کا مداوا ہو گیا، مثلاً:

جو سکتا ہے بیوی یا بچہ ہو اور مرد اولاد اور وارث کی خواہش رکھتا ہو۔ اگر تعداد ازواج کی اجازت نہ ہوتی ایسی صورت میں مرد کے لیے ایک ہی راستہ کھلا ہے کہ وہ اس بیوی کو



طلاق دے دے اور دوسری شادی کر کے اولاد کی خواہش پوری کر کے رطلاق لے کر الگ ہو جانے اور دوسری شادی کر کے اولاد کی خواہش پوری کر کے رطلاق لے کر الگ ہو جانے اور تکلیف وہ زندگی گزارنے سے عورت کے لیے کہیں بہتر ہے کہ وہ سوکن کے باوجود اپنے گھر میں، اپنے شوہر کے ساتھ رہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ بیوی بیمار ہو اور فرائض زوجیت ادا کرنے سے قاصر ہو، ایسی حالت میں عورت کا اپنے شوہر کی نگرانی میں رہنا، اور سوکنا پر راضی ہو جانا، اس کے لیے زیادہ محفوظ اور اطمینان بخش ہوگا۔

بعض اوقات تعداد سے کسی سابقہ غلطی کی اصلاح ہو جاتی ہے جس میں کسی مرد اور عورت کے مابین غیر قانونی تعلقات ہو گئے ہوں۔ ایسے معاملے میں عورت ہی قابل آجاتی ہے اور اس کی عزت اور شہرت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ایسی صورت حال کا مداوا یہی ہے کہ وہ مرد اسی عورت سے شادی کر لے خواہ وہ اس سے پہلے شادی شدہ ہی کیوں نہ ہو۔ تعداد ازدواج اس غلطی اور نقصان سے محفوظ رکھتا ہے، یا شادی نہ ہو تو یہ نقصان زیادہ شدید ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ جنگ وغیرہ میں مردوں کی کثیر تعداد کام آجائے اور ایک مرد ایک عورت کا اصول قائم نہ رہ سکے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کئی ملکوں میں ایسا ہوا۔ اس سے واضح ہوا کہ ایسی حالت میں معائنہ کے کو یکجا رکھنے اور مرد اور عورت میں قانونی تعلقات برقرار رکھنے کے لیے تعداد ازدواج ضروری ہے، اور اسی کے باعث کوئی قوم اپنی بشری مرتبہ کو دوبارہ حاصل کر سکتی ہے۔

یہ تمام و کمالاً ساری وجوہ نہیں، یہ تو محض چند مثالیں ہیں جن سے تعدد کی ضرورت اور اجازت واضح ہوتی ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ تعداد ازدواج پر پابندی، خود عورت کے لیے مفید ہے۔ جو شخص اس کے برعکس کہتا ہے وہ صرف ظاہری بات کو دیکھتا ہے اور چند عورتوں کے دردناک قصوں سے غلط نتیجہ اخذ کر کے تمام عورتوں کے حقیقی مفاد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

## ۲۔ طلاق

یہ بھی ان موضوعات میں سے ہے جن پر بہت کچھ کہا گیا ہے۔ چونکہ اسلام نے طلاق کو مباح

قرار دیا ہے اس لیے اسلام کے بعض دشمنوں نے اس کو اسلام پر اعتراضات کا ہدف بنایا ہے ان کے خیال میں یہ اسلامی ملک میں نوجوانوں کی بے راہ رسی کا سب سے بڑا سبب ہے اور وہاں کے معاشرہ میں لوٹ پھوٹ اور افتراقی اسی کی وجہ سے ہے۔ ان کے نزدیک طلاق کی اجازت عورتوں کے حقوق کی پامالی اور ان کے شرف و کرامت اور انسانیت کی بنا ہی ہے۔

اس کے جواب میں بہت کچھ جا سکتا ہے :

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ طلاق کا رواج اسلام سے پہلے بھی تھا اور بعد میں بھی جاری رہا۔ اسلام نے اس کی اجازت دے کر اس رواج کی کئی خرابیوں کو دور کیا اور اس کو بعض معاشرتی پیچیدگیاں دور کرنے کے لیے ایسی حلال چیز قرار دیا جس کے بغیر چارہ نہیں۔

۲۔ جو مسیحی اور مغربی لوگ اسلام میں طلاق کی اجازت پر تنقید کرتے ہیں جانتے ہیں کہ تمام عیسائی مملکتیں بھی آج طلاق کے قوانین نافذ کیے ہوئے ہیں۔ حالانکہ کلیسائی نظام اس کو مکمل طور پر ممنوع قرار دیتا تھا اور اگر زوجین میں سے کوئی بے وفائی کا مرتکب بھی ہوتا تو اسے طلاق کے لیے کوئی جواز نہ سمجھتا جانا تھا۔ اس لیے زوجین میں طلاق کی اجازت کے بغیر محض "جسمانی جدائی" کر دی جاتی تھی۔ اب ان ملکوں میں طلاق کی اجازت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام بشری طبائع سے خوب واقف تھا اور اسے خوب معلوم تھا کہ اسی بشریت کی وجہ سے کئی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں جن کے حل کرنے کا یہ ایک معقول طریقہ ہے۔

۳۔ اسلام نے طلاق کی اجازت دیتے ہوئے اسے ازدواجی مسائل کا واحد حل قرار نہیں دیا، بلکہ رسول کریم نے اسے ناپسند فرمایا اور اسے اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسند کیا۔ قرآن مجید نے ازدواجی مسائل کو باجموع صلح اور افہام و تفہیم سے حل کرنے کا مشورہ دیا، اور طلاق کی اجازت دیتے ہوئے، اور اسے آخری چارہ کار سمجھنے ہوئے بھی ایساں بیوی کو غور و فکر کی مہلت دی، پھر طلاق کو "رجعی" کہا جس کے ذریعے مرد کے لیے ممکن ہے کہ وہ اپنی بیوی سے بغیر عقد جدید یا مہر جدید، پھر رجوع کر سکتا ہے اور تعلقات زن و شوئی بحال کر سکتا ہے۔ اسی طرح فقہاء کی ایک جماعت کے نزدیک حیض کے دنوں میں طلاق واقع نہیں ہوتی اور نہ اس "ظہر" (حیض کے بعد پاکیزگی) کے دنوں میں واقع ہوتی ہے جس سے زوجین نے وظیفہ زوجیت ادا کیا ہو۔ یہ سب اس بات کی کوشش ہے کہ زوجین اچھی طرح سوچ سمجھ لیں اور دردمر سے پرخ جائیں۔

۴۔ یہ کہنا کہ بعض اسلامی ممالک میں طلاق، نوجوانوں میں بے راہ روی کا باعث ہے بلا دلیل ہے طلاق کے بارے میں اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ بالعموم طلاق حاصل کرنے کی کوشش کے واقعات پہلے ہی سال میں پیش آتے ہیں اور اس کا سبب اکثر حالات میں شادی کرنے سے پہلے چھان چھپک کا نہ ہونا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں طلاق دینے سے منع کر دینا یا اس پر پابندی لگا دینا زوجین میں سے کسی کے مفاد میں نہیں ہو سکتا اور عیاں ہوئی کا یکجا رہنا گھر کو تہنم بنا دے گا۔ یہ بات بھی کہ طلاق معاشرے میں انتشار اور فساد کا باعث ہے، بڑا ملبا چوڑا دعویٰ ہے جس کے لیے دلیل کی ضرورت ہے، جو ان تدبیروں کے پاس نہیں ہے، کیونکہ ان کے پاس وہ مبالغہ آمیز یا غلط اعداد و شمار ہیں جن میں طلاق رجعی کو خاطر میں نہیں لایا گیا۔ اعداد و شمار تو یہ بتاتے ہیں کہ جب بھی خاندان کے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے، طلاق کی شرح کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً، مقصد طلاق کے واقعات کسی بچے کی پیدائش سے پہلے ہوتے ہیں اور مقصد ایک بچے کی پیدائش کے بعد اور اسی لحاظ سے خاندان کے بڑھنے پر طلاق کے واقعات کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

گویا اسلام نے طلاق کی صرف ان حالات میں مباح کہا ہے۔ جب ازدواجی زندگی گزارنا ناممکن ہو جائے، اسلام اس معالج کی طرح ہے جو جسم کی سلامتی کے لیے ٹیپوراکس عصب کو کاٹ دیتا ہے۔

## عورت کی حیثیت

مغرب میں اسلام کے خلاق یہ پروپیگنڈہ بھی کیا جاتا ہے کہ اس نے عورت کا مرتبہ کم کر دیا اس سے اس کے حقوق نہ دیئے اور اسے مرد کے مساوی درجہ بھی نہ دیا۔ دراصل یہ دعویٰ بھی بے بنیاد ہے اور معاملہ دراصل اس کے برعکس ہے اسلام ہی نے عورت کو عزت بخشی، اس کا مرتبہ بلند کیا اور اسے وہ حقوق عطا کیے جو مغرب کی عورت کو اب تک حاصل نہیں۔ اگر ہم اسلام سے قبل عورت کی خالیت پر نظر ڈالیں تو دکھائی دیتا ہے کہ حرف یہودیت حوا کو اور ان کے سبب عورت کو، انسانی بنی کا عام سبب قرار دیتی تھی کیونکہ ان کے خیال میں اس نے آدم کو جنت سے نکلوا یا اور نبی نوع انسان کو ہمیشہ کے لیے رنج و تھدیب کے حوالے کر دیا اسی لیے یہودیت میں عورت اُس وقت وارث نہیں ہوتی جب اس کا کوئی بھائی ہو

مسیحیت نے بھی یہودیت کے اسی نظریے کو اپنا یا اور عورت کو حقارت کی نظر سے دیکھا، یہاں تک کہ قرون وسطیٰ تک مسیحی معاشرے اس بحث میں اُلجھے ہوئے تھے کہ عورت "انسان" ہیں یا نہیں۔

ہندوؤں کے نزدیک عورت "سورگ" (جنت) میں داخل نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ ناپاک مخلوق ہے، گھٹیا ہے، حقیر ہے جسے کوئی حق حاصل نہیں۔ اسی لیے ان میں "ستی" کی رسم رائج تھی کہ شوہر کے مرتے ہی عورت بھی اس کے ساتھ جل کر زاہد ہو جائے۔ برطانوی حکمرانوں کو اس قبیح عادت کے ختم کرنے میں خاصی دشواری پیش آئی۔

رومیوں کے قانون میں عورت نا اہل سمجھی جاتی تھی۔ اور صغریٰ یا دیوانگی کی طرح، عورت ہونا بھی معاشرتی زندگی میں حصہ لینے سے محروم کر دیتا تھا۔

اسلام سے قبل بعض عرب معاشروں میں، عورت کو شمار قطار میں سمجھا نہ جاتا تھا مگر اپنے ہمعصر معاشروں سے مختلف سلوک نہ ہوتا تھا۔ بعض عرب قبائل بچیوں کو زندہ گاڑ دیتے تھے، عورت کا میراث میں کوئی حصہ نہ تھا، بلکہ مال اسباب کی طرح خود اسے میراث میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب باپ مر جاتا تو بیٹے اس کی زوجات کے بھی وارث بن جاتے تھے۔ عام طور پر ڈاکے اور لوٹ مار کا ایک عام سبب، اس زمانے میں، عورت کی ذات ہی ہوتی تھی۔ اس طرح مرد کو "اجارت" تھی کہ وہ بلاحد و جہد جتنی عورتوں کو چاہے، عقد میں لے آئے۔

اسلام نے آکر پہلے تو یہ اعلان کیا کہ مرد و عورت میں انسانیت کے لحاظ سے مکمل مساوات ہے کیونکہ تخلیق میں مذکر و مؤنث دونوں کا ثقل ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ عورت، مرد کا حصہ ہے:

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ وَجْهًا (النساء، ۴: ۱)

قرآن کریم نے مسلسل مرد و عورت دونوں کو ذمہ داریوں اور ثوابِ عمل میں برقرار رکھا ہے:

فاستجاب لهم ربهم انى لا عمل عامل معكم من ذكرٍ او انثى بعضكم

من بعض"۔ (آل عمران ۱۳: ۱۹۵)

اور پھر

"المسلمين والمسلمات"، "القانتين والقانتات" (الحزاب ۳۳: ۳۵)

کی تہ اکیب کا اعادہ کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کریم، مرد و عورت میں انسانی مساوات کی

تاکید کرتا ہے اور انخالیہ اس دور میں بے شمار معاشرے ایسے تھے جو اس مساوات کے ناکامی سے آشنا نہ تھے۔

اسلام نے اس ظلم کا بھی خاتمہ کر دیا جو عورت پر دور جاہلیت میں توڑا جاتا تھا۔ اس نے بچیوں کو زندہ گاڑنے کو ممنوع قرار دیا اور بے حساب تعدد ازواج کو بھی روک دیا۔ اسلام نے عورتوں کی لوٹ مار کو بھی بند کر دیا اور اسی طرح اُسے مال اسباب کی طرح وراثت میں تقسیم کیے جانے سے بھی منع کر دیا۔ اسلام نے عورت کو میراث میں مرد کے برابر بنایا سوائے اس کے کہ اس کا حصہ نصف مقرر کیا کیونکہ مرد کو اسلامی معاشرے میں سارا مالی بوجھ اٹھانا پڑتا ہے اور عورت پر ایسا کوئی بوجھ یا ذمہ داری نہیں۔

اسلام نے عورت کو پورے پورے حیدر حقوق عطا کئے۔ مثلاً اپنے مال میں تصرف و اختیار مال کا بیع اور بیع و شراہ اور اس کے اس مال پر کسی مرد کا حق، حتیٰ کہ اس کے شوہر کا حق بھی نہیں۔ یہ وہ حق ہے جس کو یورپ کے قوانین نے آج بھی عورت کو نہیں دیا۔ ۱۹۳۹ء تک فرانسیسی قوانین کسی عورت کو اس کے شوہر کی اجازت یا رضامندی کے بغیر اپنے مال میں تصرف کا کوئی حق نہیں دیتا تھا۔ پھر اس قانون کو بدل دیا گیا اور عورت کو اس حق کے استعمال کی چند قیود کے ساتھ اجازت دے دی گئی۔ جرمنی میں تو عورت کو یہ حق، ۱۹۵۰ء میں دیا گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی وصیت فرمائی کہ وہ مردوں کی نصف بہتر ہیں، اور ماں کے ساتھ حسن سلوک ہر قسم کی نیکی سے بڑھ کر ہے حتیٰ کہ باپ کا بھی وہ حق نہیں۔ آپ نے اس حق کی اپنے خطبہ الوداع میں تاکید فرمائی۔

اگر اسلام مرد اور عورت میں معاشرتی امور کی تقسیم کا ہے تو وہ دونوں کی طبعی مزاجیت سے کی ہے، اس سے ان کے رتبہ بشریت میں کوئی فرق واضح نہیں ہوتا، اور اس تقسیم کار سے معاشرہ بحسن و خوبی چلتا ہے۔ یہ تقسیم کار اس نوعیت کی ہے جیسے زندگی کے دوسرے امور میں کسی خصوصیت کی بنا پر ہوتی ہے۔ عورت جو امور سرانجام دے سکتی ہے، بلکہ بہتر طور پر سرانجام دے سکتی ہے، وہ عورت کی بساط سے باہر ہیں۔ مثلاً کسی مملکت کی سربراہی، احادیث میں آیا ہے کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاتی جو اپنے امور کسی عورت کے سپرد کر دیتی ہے۔ اس کا واضح سبب یہ ہے کہ عورت اپنی تائید کے سبب ان امور مملکت کو پچالانے سے قاصر رہتی ہے جو صحیح احکام یا رائے سلیمہ کے متقاضی ہوتے

ہیں انہی میں سیاسی امور میں مشارکت بھی ہے کیونکہ ان میں مرد و زن میں اختلاف کا احتمال ہے۔  
جس کی توثیق اسلام نہیں کرتا۔

تعلیم بنات یا عورتوں کے علاج معالجے یا ایسے امور میں جو عورتوں کے مفاد میں ہوں یا  
معاشرے کے مفاد میں، اسلام عورتوں کی مشارکت کی اجازت دیتا ہے کیونکہ یہ اسلام کی روح سے  
متعارض نہیں۔

## اسلام میں حقوق زوجیت

اسلام میں یہ حقوق تین قسم کے ہیں :

- ۱۔ وہ حقوق جو دونوں میں مشترک ہیں۔
- ۲۔ شوہر کے بیوی پر حقوق۔
- ۳۔ بیوی کے شوہر پر حقوق۔

مشترک حقوق میں سب سے بنیادی حق تو ازدواجی زندگی گزارنا ہے۔ پھر مصاہرت کی حرمت  
ہے یعنی مرد کے لیے عورت کے اصل اور فرع (مال بیٹیاں وغیرہ) دونوں حرام ہیں، اسی لیے عورت  
کے لیے مرد کے اصل اور فرع (باپ، بیٹا وغیرہ) دونوں حرام ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں ایک  
دوسرے کے مال کے وارث ہوتے ہیں۔ میاں بیوی میں سے ایک انتقال کر جائے تو دوسرا اس  
کے مال کا وارث ہوتا ہے۔

شوہر کے بیوی پر جو حقوق ہیں ان میں حق اطاعت سرفہرست ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ اپنے  
گھر میں قیام کرے اور شوہر کی اجازت کے بغیر باہر قدم نہ رکھے۔ علماء نے اس بارے میں تفصیل  
بیان کی ہے عورت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے شوہر کے نسب کی، اپنی اولاد میں، حفاظت کرے  
بیوی کے شوہر پر جو حقوق ہیں ان میں اولیٰ حق نہر ہے۔ یہ ایک لحاظ سے شوہر کی طرف سے

بیوی کو ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے امداد ہے۔ پھر بیوی کا حق نفقہ ہے کہ شوہر اس کا خرچ  
برداشت کرے۔ اگر عورت کا فرض ہے کہ وہ گھر کی نگہداشت اور اولاد کی پرورش کرے۔ تو  
مرد کا فرض ہے کہ وہ مالی بوجھ اٹھائے عورت کو انصاف کا بھی حق حاصل ہے یعنی مرد کا فرض ہے

ہے کہ اُس سے حسن سلوک کرے اور اُس سے قول یا فعل سے ابتداء نہ پہنچائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:  
 ”تم میں سے اچھا وہ ہے جو اپنی عورتوں کے لیے اچھا ہے۔ تم میں سے اچھا وہ ہے  
 جو اپنے اہل و عیال و عیال کے لیے اچھا ہے اور زمین اپنے اہل و عیال کے لیے تم  
 سب سے بہتر ہوں۔“

## فرد اور معاشرہ

عمرانیات میں فرد اور معاشرے کا باہمی تعلق اساسی موضوع ہے۔ اس تعلق کی حقیقت کا علم ایسا ہے کہ اس سے عالم نفس بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اس تعلق کو سنوارنا اور دکھانا مختلف ادیان، فلسفوں اور مختلف نظاموں کا بہت بڑا ہدف رہا ہے۔

اس تعلق کا مطالعہ کئی زاویوں سے کیا جاسکتا ہے۔ علمائے عمرانیات اس میں اختلاف رکھتے ہیں کہ فرد اور معاشرے میں سے پہلے کون تھا۔ ان کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ معاشرہ اپنے وجود میں بنیادی ہے جس کا ظہور بعد میں ہوا اور فرد صرف معاشرے کا جزو ہے بلکہ اس کے جاندار غنا میں سے ایک عنصر ہے۔

اس نظریے پر قدیم اور جدید دونوں فلاسفہ کی بڑی تعداد متفق ہے۔ اسلامی نظریہ بھی یہی ہے کہ معاشرہ دنیا میں پہلے وجود میں آیا، گویا ہر بعد میں قائم ہوا، اور اس کا ثبوت قرآن مجید کی اس آیت سے ملتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور ان کے ”اہل و عیال“ کو زمین کی سکونت اختیار کرنے کا حکم دیا:

قلنا اهبطوا منها جميعاً فإما يأتينكم مني هدى فمن تبع هداي فلا خوف عليهم ولا هم يحزنون (البقرہ ۲: ۳۸)

زمین پر جو زندگی شروع ہوئی وہ انسانی معاشرے ہی کی شکل میں تھی، جس میں کم از کم ایک مرد اور ایک عورت شامل تھے۔



جس طرح معاشرے کی ابتدا کے بارے میں اختلاف رائے ہے، اسی طرح معاشرتی تنظیم کے بارے میں بھی مختلف نظریات ہیں۔ بعض کے نزدیک خاندان معاشرے کا پہلا خلیہ تھا، اور اس کی دلیل میں وہ ان ابتدائی خاندانوں کو پیش کرنے میں جن کے آثار اب بھی افریقہ میں باقی ہیں اور اس کا ثبوت بعض ابتدائی معاشروں میں اپنے آبا و اجداد کی تقدیس سے ملتا ہے۔ دوسرے علمائے عمرانیات کہتے ہیں کہ معاشرہ سب سے پہلے قبیلے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ قبیلہ افراد کا وہ مجموعہ ہے جو ایک دوسرے سے بعض مشترک روابط رکھتے ہیں مثلاً ایک ہی نسل سے تعلق یا ایک ہی خطہ ارضی پر سکونت۔ ان کی رائے میں خاندان، طرز زندگی مستقل ہونے کے بعد وجود میں آیا اور یہ استقرار انسان کو اس کے ابتدائی دور میں حاصل نہ تھا۔

لیکن معاشرہ ہے کیا؟ کیا یہ محض متفرق افراد کا مجموعہ ہے، یا یہ منظم اجتماع بشری ہے جسے سوچ سمجھ کر اور بالارادہ قائم کیا گیا اور اس کے اصول و ضوابط، جماعت کے شعور، عقائد اور رسوم کے مطابق طے کئے گئے۔ معاشرے کی تعریف خواہ کچھ بھی ہو، یہ محض کسی خاص زبان و مکان میں افراد کا اجتماع نہیں، بلکہ افراد کا کسی معاشرے میں مل جل کر رہنا ہے۔ اس میں افراد کی موجودہ ضرورتوں اور مستقبل کے مطمح نظر کا خیال رکھا جاتا ہے۔ معاشرتی اجتماع، حسابی مرکب نہیں بلکہ کیمیائی مرکب ہے، جس میں مختلف عناصر مل کر ایک نیا وجود بناتے ہیں جس میں اصل عناصر کی صفات معدوم ہوتی ہیں جس طرح پانی کہ دو گیسوں — ہائیڈروجن اور آکسیجن — سے مرکب ہے۔ اس کے علاوہ معاشروں کے اپنے نظام ہیں، اپنے نصب العین کی وجہ سے، بہت اختلاف ہو سکتا ہے یا ان افراد کی آراء کی وجہ سے اختلاف ہو سکتا ہے جو اسے ترکیب دیتے ہیں۔

فرد اور معاشرہ میں تعلق کو دونوں کی اپنی اپنی اہمیت اور اپنے اپنے دائرے کار کی نبت سے بھی دیکھا جا سکتا ہے، عصر حاضر کے فلسفے اور نظام، فرد اور معاشرے کو ایک دوسرے کی ضد یا ایک دوسرے کے مخالف قرار دیتے ہیں۔ اس ”جھگڑے“ کو دو مختلف پہلوؤں سے دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ بعض فلسفے اور نظام، معاشرے کو غالب فریفتی گردانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اصل ”چیز“ معاشرہ ہے اور انسان کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرد کی حیثیت اس میں معکوس ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ فلسفے فرد کی ذاتی حیثیت کی نفی کرتے ہیں اور معاشرے کی مفاد پر انسان کی شخصیت کوئی اہمیت نہیں دیتے کیونکہ معاشرہ ہی سب افراد میں ربط ضبط پیدا کرتا

ہے اور ان کی جھوٹی بڑی سب ضرورتیں پوری کرتا ہے

اس نظریے کے مقابلے میں دوسرے فلسفے اور نظام، فرد کو فرقی غالب قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ معاشرہ، افراد ہی سے بنتا ہے اور ان کے بغیر اس کا کوئی وجود نہیں۔ انفرادی کاوشوں کا تمام مقصد ذاتی مفاد ہوتا ہے، اسی لیے معاشرہ، فرد کے گرد گھومتا ہے اور اس کی سرگرمیوں پر پابندیاں ناگوار سمجھتا ہے، اور اُسے اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا طریقہ اختیار کرنے سے روک نہیں سکتا۔

اسلام فرد اور معاشرے کے مابین اس جھگڑے کی تائید نہیں کرتا اور نہ ان دونوں کے مفادات کو ایک دوسرے سے متعارض سمجھتا ہے۔ انفرادی سرگرمیاں ہوں یا اجتماعی، دونوں ایک دوسرے پر انحصار کرتے تھے اور دونوں ہی انسانی فطرت کے لیے ضروری ہیں۔ اسلام نے واضح طور پر فرد کو بھی بعض معاملات میں ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اس نے فرد کو مستقل شخصیت عطا کی ہے اور اُسے ہر وہ حق دیا ہے جو اس کی ذات سے تعلق رکھتا ہے:

بیل الانسان على نفسه بصيرة (القیامتہ ۵: ۱۲) یا

وَأَنْ لِّیْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (النجم ۵۳: ۲۹)

اسلام نے فرد کی ذات پر کچھ مخصوص فرائض بھی عائد کیے ہیں اور اُسے بعض امور میں معاشرے کے ساتھ مشترکہ طور پر ذمہ دار ٹھہرایا ہے، اور اسی طرح معاشرے کو فرد کے معاملے میں ذمہ دار قرار دیا ہے۔ اسی سلسلے میں قرآن مجید کی مجید آیات ہیں جن میں تعاون اور عمل مشترک کی ترغیب دی گئی ہے، اور احادیث رسولؐ بھی اس بات پر اُکساتی ہیں:

”وَالْعَصْرُ - ان الانسان لفلح خسر، الا الذين آمنوا وعملوا الصالحات

وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر“ (العصر ۱: ۳-۱)

اور

وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان“ (المائدہ ۲: ۵)

اسی طرح رسول کریمؐ سے مروی ہے:

”مومن ایک دوسرے سے محبت رکھنے اور ہمدردی کرنے میں ایسے ہیں جیسے کوئی جسم

اگر اس کا کوئی عضو ٹسا کی ہو تو اس کے تمام اعضاء بخار اور شب بیداری کی شکایت

کرتے ہیں“

آپ نے یہ بھی فرمایا:

”تم میں سے ہر ایک چرواہا ہے اور ہر ایک اپنے گلے (رعیت) کا جواب دہ ہے“  
حضور نے مثنیٰ کہ جواب دہی کو نہایت بلیغ اور مؤثر پیرائے میں بیان فرمایا:

”جو شخص حدود اللہ پر قائم رہتا ہے اور جو ان کے اندر رہتا ہے ان کی مثال ایسی  
قوم کی طرح ہے جو کشتی میں سوار ہوئے تو بعض کو نچلے حصے میں اور بعض کو اوپر کے  
حصے میں جگہ ملی۔ نچلے حصے والے لوگ پانی مانگنے اور والوں کے پاس جانے اور کہتے:  
ہم جاہیں تو اوپر والوں کو نقصان پہنچائے کے بغیر اپنے حصے میں سوراخ کر سکتے ہیں  
اگر یہ لوگ اپنا ارادہ پورا کرنے کے لیے چھوڑ دیئے جائیں تو سب ہلاک ہو جائیں گے  
اور اگر انہیں روک دیا جائے تو سب بچ جائیں گے“

فرد کو مطلق آزادی دینا، جس پر کوئی ایسی پابندی نہ ہو جو معاشرے نے پسند کی ہو اور  
جو فرد اور معاشرے کے مفادات کو مساوی حدود میں رکھتی ہو، انانیت اور مصلحت ذاتی کو جنم دیتی  
ہے اور معاشرے میں یگاڑ اور فساد پیدا کرتی ہے جس کے نتیجے میں اخلاقی اور اجتماعی زوال پیدا  
ہوتا ہے۔ اسی طرح فرد کی شخصیت کی کامل نفی اور اس کا معاشرے کے نظام اور اختیار میں  
کامل انقزام، فرد کی آزاد سوچ پر پیرے بٹھا دینا ہے اور اس کے نتیجے میں افراد لوگوں کا ایسا  
گروہ بن جانے ہیں، جو جانوروں اور چوپاؤں کے گروہ سے مختلف نہیں۔

فرد کو اتنی زیادہ آزادی دینا کہ وہ معاشرے کی رسوم و اخلاق کو پس پشت ڈال دے تاکہ  
اس کی ذات پر کوئی پابندی نہ رہے، بالکل اسی طرح ہے جس طرح فرد کو معاشرتی اور اجتماعی  
سرگرمیوں کا مکمل طور پر غلام بنا دینا۔ دونوں باتیں غلط ہیں اور دونوں ہی فرد اور جماعت کی حیثیت  
کے لیے خطرناک ہیں۔ نظام صلح، جو فرد کی ضروریات اور مفادات میں، اور اس کی مستقل فرد اور  
جماعت کے رکن ہونے کی دونوں حیثیتوں میں توازن پیدا کرتا ہے، گویا ایک لسل اور آنے والی تمام  
نسلوں کو وسیع اور جامع انسانیت کے دائرے میں داخل کرتا ہے۔ اور اسلام نے یہی کیا۔

اسلام فرد اور معاشرے کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے:  
”اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی متوازن فرد کی تشکیل کرے۔ اس قسم کا متوازن فرد

کبھی دوسروں کے حقوق سلب نہیں کرتا کیونکہ یہ خواہش، اسراف سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی اس فرد کے دل میں عدم توازن کا ہونا جب ہر فرد متوازن ہو جائے تو ایک ایسا معاشرہ وجود میں آجائے جس کے اغراض و مقاصد بھی متوازن ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے اسلام ہر فرد پر علیحدہ علیحدہ توجہ دیتا ہے۔ کیونکہ یہ ایسی وحدت ہے جو دوسری وحدتوں کے ساتھ مل کر معاشرہ بناتی ہے اور ایسی ایستہ ہے جس سے پوری عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

اسلام افراد کی زندگی کے ہر مرحلے پر بچپن، لڑکپن، شباب، اُدھیڑ عمر اور بڑھاپے تک خاص توجہ دیتا ہے اور وہ اس توجہ کو خود حکومت کے سپرد نہیں کر دیتا کہ وہ معاشرتی اداروں کے ذریعے حکومت اور حکمرانوں کی تقدیس و عظمت قائم کرے، بلکہ وہ اس توجہ کو خود افراد اور ایسے گروہوں کی ذمہ داری بنانا ہے جو عرصہ دراز سے تشکیل شدہ ہیں۔ مثلاً خاندان، کیونکہ اسلام پر لوگوں کا ایمان، جو معاشرتی عقیدہ ہے، حقیقی اور برضا و رغبت ہے۔ وہ یہ حکم دیتا ہے، کہ خاندان اپنے ارکان کی صحیح تربیت کرے اور انہیں اخلاق، محبت اور عزت کا درس دے اور انہیں زندہ رہنے کا صحیح طریقہ سکھانے کے لیے ان میں زندہ اوصاف پیدا کرے۔ یہی توقع اُسے معاشرے کے تمام اداروں سے ہے۔

اسلام جس معاشرے کو تعمیر کرنا چاہتا ہے، وہ اپنی ابتداء اور غرض و غایت کے لحاظ سے فکری اور اخلاقی ہے، اور تمام افراد کو اسی مقصد کے لیے اکٹھا کرنا چاہتا ہے۔ اسلامی معاشرہ حسب نسب اور نسل پرستی کی بنیاد پر قائم نہیں، نہ اقتصادی برابری اس کا مقصد ہے۔ وہ تو ایک مخصوص عقیدے اور ضابطہ اخلاق پر مبنی ہے۔ اس کے نزدیک تمام بنی نوع انسان ایک ہی اصل سے متعلق ہیں اور ہر وہ شخص جو "اللہ کو اپنا رب اور مالک سمجھ کر ایمان لاتا ہے، اور اس کے رسول جو ہدایت اور دین حق لے کر آئے اُسے اپنی زندگی کا عملی ہدف بناتا ہے، وہ اس معاشرے کا رکن بن جاتا ہے اور اس کا ایک فرد ہوتا ہے۔"

اسلامی معاشرے کا "دروازہ" ہر اس شخص کے لیے کھلا ہے جو ایک ہی عقیدہ رکھتا ہے، اور جو معاشرے رنگ و نسل وغیرہ پر مبنی ہیں، وہ اسی خاص نقطہ نظر رکھنے والوں کے لیے مخصوص ہیں اور ان کے دروازے دوسروں پر بند ہیں۔

اسلامی معاشرہ طبقاتی نظام کی بھی اجازت نہیں دیتا کیونکہ اس میں تو جملہ افراد کے درمیان ربط فقط اخوت، تعاون اور ایک دوسرے کی کفالت و مدد کی وجہ سے ہے۔ اس لیے اس میں "طبقاتی" جنگ اور ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کی گنجائش نہیں۔ یہ تو نفوس و ضمائر کا معاشرہ ہے، جو صرف دعوتِ دین پر مجتمع ہے۔ اگر اسلام کسی خاص گروہ کو خطاب کرتا ہے تو محض اس لیے کہ امت میں اُسے علم اور فکری سلاست کی وجہ سے امتیاز حاصل ہے۔

اسلام نے مسلمانوں پر روحانی بلندی حاصل کرنے کی ممانعت نہیں کی، لیکن اس نے قبیلے، مملکت اور مذہب کی حدود سے بالاتر ہو کر "روحِ جماعت" کا ارتقا پایا ہے تاکہ وہ وسیع تر اور جامع انسانی روح بن جائے۔ ہمیں معلوم ہے کہ مشرکین رسول اللہؐ اور مسلمانوں سے مسلسل جنگوں میں الجھے رہے، لیکن رسول اللہؐ نے ان سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں رکھی اور جب بھی ان کے قیدی پکڑے گئے، روحِ انسانیت کے ارتقاء کی خاطر، آپ نے ان سے ہمیشہ حسن سلوک روا رکھا اور اسی کی تلقین فرمائی۔ یہودی، اسلام کے بدترین دشمن تھے، مگر حضرت عمرؓ نے جب ایک یہودی کو لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے، بھیک مانگتے دیکھا تو مسلمانوں کے بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر فرما دیا۔ اس دور میں بھی بڑے بڑے ترقی یافتہ معاشرے بھی اس نیک جذبے سے عاری ہیں اور انہیں انسانی کرامت کا شعور تک نہیں۔ مسلمان، دوسرے مذاہب، قیدیوں، اور مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کے ساتھ جس طرح حسن سلوک سے پیش آتے رہے، مغرب اپنی تمام ترقی اور تہذیب کے باوجود اس حد تک پہنچنے سے آج بھی فاصلہ ہے۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ اسلام تمام انسانیت کو اپنی اصل، حیات اور موت میں ایک گردانتا ہے۔

## حواشی

- ۱- محمد عبداللہ العربی: نظام الحکم فی الاسلام - ص ۲۵
- ۲- محمد قطب: الانسان بین المادیة والاسلام - ص ۱۶۰
- ۳- ایضاً
- ۴- ابوالاعلیٰ مودودی: نظریۃ الاسلام و ہدیہ

## اخلاقی نظام

انسان، ہر انسان، ہر دور میں، اجتماعی زندگی بسر کرتا رہے۔ اجتماعی یا معاشرتی زندگی دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنے اور سلوک کا نام ہے۔ اس تعاون کے لیے قواعد و ضوابط کی ضرورت پڑتی، خواہ کوئی معاشرہ ہو یا اس کے رسم و رواج یا اقتصادی اصول اُن سے موافق ہوں یا نہیں۔

مل جل کر رہنے سے نیک و بد میں تمیز پیدا ہوتی اور یہ شعور پیدا ہوا کہ بُرا اور اچھا کیا ہے، مفید اور مضر کیا ہے؟ اس طرح انسان کو خیر و شر، نیک و بد اور مفید و مضر میں فرق بتانے کے لیے احکام صادر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

خیر و شر اور نیک و بد وغیرہ کا موضوع انسانیت کے مختلف ادوار میں تمام فلاسفہ، مفکرین، اور مصلحین کے زیر بحث و غور رہا ہے۔ انسان نے اپنی تخلیق ہی سے یہ چاہا ہے کہ اس کے کردار کو واضح کرتے اور اخلاق نافذ کرنے کے لیے ضوابط ہوں، خواہ اس کا نتیجہ اس کے حق میں اچھا نکلے یا بُرا، اُسے اجبر ملے یا سزا، کردار کی اصلاح کے لیے انسان کے ہر فعل کو، خواہ کب بھی ہو اور نظر رکھنا ضروری ہے۔

اخلاقی بحث، کئی سوالات پیدا کرتی ہے: انسان کو عمل پر اُکسانے والے دوسرے عوامل کیا ہیں؟ خیر اور شر کا علم ہمیں کیسے ہوتا ہے؟ یہ علم ہمیں کہاں لے جاتا ہے؟ قتل اور چوری بُرے فعل کیوں ہیں؟ جھوٹے غیر اخلاقی کیوں ہے؟ زندگی کی غرض و غایت کیا ہے؟ اگر اس کی غرض و غایت نیک ہے تو نیک کیا ہے؟ کیا یہ سعادت اور خوش بختی کا حصول ہے؟ سعادت کیسے حاصل کی جائے؟

کیا یہ معرفتِ حق سے حاصل ہوتی ہے یا ہر اس فعل سے جو ہمیں مسرت سے ہمکنار کرے، ہمیں لذت بخشنے یا جو ہمیں پسند ہو، سعادت حاصل ہوتی ہے؟ اور یہ ضمیر، باطن کی آواز کیا ہے جو انسان کے ہر فعل پر چونک اٹھتا ہے اور حق و باطل میں تمیز کرتا ہے؟ اور یہ مفروضہ اخلاقی احکام کیا ہیں؟ ان سوالات کے مختصر جواب میں ہم علمائے اخلاق کے اہم نظریات کا احاطہ کریں گے تاکہ ان کے مقابل اسلام کا موقف پیش کر سکیں۔

۱۔ شعور اخلاقی کی اصل کیا ہے، یعنی ہم کیسے جانتے ہیں کہ کوئی عمل اخلاقی ہے یا غیر اخلاقی؟ اس کے بارے میں دو رائیں ہیں؟ ایک رائے کے مطابق، اس کا مصدر، انسانی فطرت یا جبلت ہے، جو ہر سابقہ تجربے سے فائدہ اٹھاتی ہے اور تربیت سے راسخ ہوتی ہے، اور ضروری نہیں کہ انسان نے یہ تجربہ خود اٹھایا ہے۔ دوسری رائے کے مطابق، خیر و شر کی معرفت، تجربے سے ہوتی ہے اور وقت گزرنے اور فکر کے ارتقاء کے ساتھ پروان چڑھتی ہے۔

اسلام جس اخلاقی نظریے کا حامل ہے وہ یہی شعورِ فطری ہے جس پر اللہ نے اُسے بنایا:

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا  
وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا (الشمس ۹۱ : ۱۰-۹)

اور یہی شعور ہے جو انسان کو بعض اچھے اوصاف اختیار کرنا اور بُری خصلتوں سے نفرت کرنا سکھاتا ہے۔ ”خواہ مختلف انواع بشر میں ان میں تفاوت ہو یا مختلف اقدار پائی جاتی ہوں، سوائے اس کے کہ، افراد سے قطع نظر، یہ (شعور) بعض اخلاقی خصائص کو ہر زمانے میں اچھا اور بعض کو بُرا کہتا رہا ہے۔“

۲۔ دوسرا محرک باطنی اور نفسی ہے جو ہمیں ہر اس چیز کو اختیار کرنے کو کہتا ہے جس کی طرف ہمارا شعور اخلاقی مائل کرے اور جو ہمیں سب راہوں کو چھوڑ کر ایک راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہے یہ سبب یا محرک اُن مقاصد و اغراض سے تعلق رکھتا ہے جو انسان کا ہدف ہوں۔ انسان ہی وہ تنہا مستی ہے جو اعمال کے انتخاب میں آزاد ہے۔ یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ وہ بھی کام شروع کرنے سے پہلے اس کے مقصد پر ضرور غور کر لیتا ہے اور پھر اس مقصد کو حاصل کرنے کا طریقہ تلاش کرتا ہے۔ لوگوں میں عقائد اور فکر کے اعتبار سے اختلاف کی وجہ سے اُن کے اغراض و مقاصد میں بھی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ان کی عمروں اور حالات کے سبب بھی فرق ہو سکتا ہے بعض



کے نزدیک انسان کی غرض لذت کا حصول یا منفعت کی ضمانت ہے اور دوسروں کے خیال میں انسان کی غرض سیادت کا حصول ہے جبکہ دوسری اغراض ہمارے کردار کی تشکیل میں رخنہ اندازی کرتی ہیں محرک نفس کا تعلق بھی شعور سے ہے اور شعور کا تعلق ہمارے میلانات اور خواہشات سے ہے اور میلانات اور خواہشات کبھی عقل کی ہم نوا نہیں ہو سکتیں بلکہ عقل پر غالب آجاتی ہیں اور اس سے ہمارا جو کردار واضح ہوتا ہے وہ منطوق عقلی کے مخالف بھی ہو سکتا ہے۔

۳۔ دوسرا محرک، اپنے مقاصد کی، یا آخری نتائج کی معرفت، جن تک ہم اپنے اخلاقی اعمال کے ذریعے پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہ مقاصد ایک طرح سے محور ہیں جس کے گرد ہماری فوری اغراض گھومتی ہیں اور رنگ بدلتی رہتی ہیں۔ اگر انسان کا ہدف ذاتی عظمت حاصل کرنا ہو تو اس کی ساری اغراض اسی کے گرد گھومتی ہیں اور اس کا ساری سرگرمیاں اس کے رنگ میں رنگ جاتی ہیں اور وہ خطرات کی پڑا نہیں کرتا، ان کے باعث بھی اس کا موقف نہیں بدلتا۔ اسی طرح جو شخص اللہ کو خوش کرنا اور سب کی بھلائی چاہتا ہے، وہ اسی نظر سے ہر چیز کو دیکھے گا اسی لیے اسلام اچھے مقاصد رکھنے کی تلقین کرتا ہے تاکہ اس کا ہدف بھی بلند رہے اور وہ اسی کو حاصل کرنے کی جدوجہد کرے۔

۴۔ کسی عمل کو اچھا یا بُرا کہنے، یا خیر و شر میں امتیاز کرنے کا پیمانہ ہمارے پاس اخلاقی قانون ہے لیکن اس کو نافذ کرنے کی قوت نہیں جو انسان کو اس کے بموجب عمل کرنے پر مجبور کرے عقلیت پرستوں نے کہا: یہ قانون ہمارے اندر ہے اور اس کا مقصد انسانی ضمیر ہے۔ یہ جھٹی ہے اور اکتسابی یا ارتقا کا نتیجہ نہیں۔ نظریہ ارتقاء کے ماننے والوں اور علمائے عمرانیات نے کہا: اس قانون کے مصادر خارجی ہیں، جن میں مذہبی اعتقادات شامل ہیں، یا وہ حالات جن کی وجہ سے اول اول انسان نے ان قوانین کو برضا و رغبت مان لیا اور پھر معاشرے نے انہیں مجبوراً پر مجبور کر دیا اور اس طرح وہ عرف و عادت بن گئے۔ ان میں اللہ کا خوف، معاشرے کا خوف وغیرہ آتے ہیں۔ جن سے اخلاقی قانون تشکیل پاتے ہیں جس کی ترازو میں ہم اپنے امور و اعمال تولتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک ہر حکم کا پیمانہ اور ہر عمل کی میزان صرف وہ اخلاقی قواعد ہیں جو رسول کریم نے بیان فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو (اور سب روحوں کو) مبعوث کیا اور آپ کو انسانی ہدایت کے لیے کتاب دی جس میں خیر اور سعادت کی راہ ہے اس لیے اللہ کی شریعت میں اچھی بات سنے وہ اچھی بات ہے اور جو اس کے نزدیک قبیح ہے وہ بُری ہے۔

۵۔ ارادے کی آزادی یا مجبور و اختیار کا مسئلہ، کیا انسان اپنے عمل میں آزاد ہے یا فطرت اور قدرت کے حکیم کے تابع ہے؟ یہ مسئلہ تاریخ انسانی میں شدید بحث مباحثے کا باعث رہا ہے اور اب تک مفکرین اس مسئلے پر بیٹے ہوئے ہیں۔ کچھ جبر کے حامی ہیں اور کچھ اختیار کے حقیقت پر ہے کہ انسان بیک وقت مجبور بھی ہے اور مختار بھی، اللہ تعالیٰ نے اُسے جس خلعت پر بنایا ہے جو فویٰ اسے ودیعت کیے ہیں اور جیسی جبلت اس کی بنائی ہے اُس کے اعتبار سے وہ مجبور ہے۔ وہ ان قوانین اور رسم و رواج کے لحاظ سے بھی مجبور ہے، جس کی پابندی لازمی ہے اور وہ اس اعتبار سے مختار ہے کہ وہ اپنے اعمال پر غور و فکر کر سکتا ہے، اپنی اغراض کا اندازہ لگا سکتا ہے، پھر ان کے مطابق کرتا ہے اور اس عمل کے مطابق اُس کے نتائج بروا منت کرتا ہے۔

۶۔ اخلاقی، اضافی ہے یا مطلق۔ لوگوں میں کھل بھی اور آج بھی اس بات پر اختلاف رہا ہے کہ اچھا کیا ہے اور بُہا کیا ہے، اور یہ کہ آیا ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم حسن مبیع اور خیر و شر کے بارے میں احکام عام وضع کر سکیں اور ان کا اطلاق بھی کر سکیں؟ بالفاتر دیگر کیا ”خیر مطلق“ اور ”شر مطلق“ کی ترکیب استعمال کر سکتے ہیں، جن کا اطلاق ہر زمانے اور تمام حالات میں یکساں ہو؟ یا خیر و شر اضافی ہیں، یعنی جو بات ایک زمانے میں ایک جگہ اچھی ہے، دوسرے وقت اور دوسری جگہ بُری ہو، یا اس کے بالعکس؟ قدیم مفکرین میں بھی ایسے لوگ تھے جو خیر و شر کو مطلق سمجھتے ہیں اور کچھ اس کے برعکس اصرار کرتے تھے۔ فلاسفہ یونان میں افلاطون شاید سب سے پہلا شخص ہے جس نے خیر و شر کو مطلق کہا تھا۔

مسلمان مفکرین نے بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے، اور دوسروں کی طرح اس میں بھی اختلاف رائے رکھتے تھے، فرق صرف یہ تھا کہ ان کے نظریے کی اساس دوسروں سے مختلف تھی انہوں نے اس اساس کو خدا کی اس نوجہ سے منسک کر دیا تھا جو اُسے اس دنیا اور اس کے معقفین کی طرف ہے۔ اس موضوع پر عصر حاضر میں بھی جدال جاری ہے اور اس کا تعلق علمائے اخلاق کے نظریے اقدار سے ہے، یعنی قدر و قیمت ان کے اچھے یا بُرے ہونے، یا حسین و قبیح کی نسبت سے کیا ہے۔

اخلاق کے اضافی یا مطلق ہونے کے بارے میں اسلامی نظر یہ ہے کہ وہ اخلاق کے مطلق ہونے کی تائید کرتا ہے۔ مثلاً صدق، امانت، عدالت اور وفائے ہمد وہ اعلیٰ صفات ہیں جنہیں

انسانیت نے ہمیشہ لائق تعریف سمجھا ہے اور انسانیت پر ایسا دور شاید ہی گزرا ہو جب جھوٹ، ظلم اور خیانت کو اچھا سمجھا گیا ہو۔ یہی حال تمام متعاضدوں کا ہے۔ انسانیت نے کسی ایسے معاشرے کو احترام کا مستحق نہیں سمجھا جس میں حسن انتظام، اداروں کا بہترین نظام، خیر خواہی، ہمدردی اور انصاف نہ ہو اور نہ ایسے معاشرے کی تعریف کی ہے جس میں فتنہ و فساد، عناد، نفرت، حسد اور تکبر ہوگا۔

ادیان سماوی نے ہمیشہ مکارم اخلاق کی طرف دعوت دی ہے:

”وانک لعلی خلق عظیم“ (التکم ۶۸: ۴)

اسی وجہ سے انسان روز ازل ہی سے، اس کرہ ارض میں انجیر و شتر اور قصبیت و زہدیت کے معنوں میں انبیاء کے ذریعے واقف چلا آتا ہے۔ انسانیت پر ایسے ادوار بھی گزرے کہ مذہب کا اثر زائل ہو گیا یا کم ہو گیا۔ اسی لحاظ سے ایسی اخلاقی آراء و افکار اور اعلانات ظاہر ہوتے رہے جو کبھی سیدھے سے قریب تھے اور کبھی دور۔ جب ہم اخلاقی تعلیمات پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مذہب نے جو بیج لوگوں کے ضمیروں میں بوئے تھے ان کی تاثیر ایک نسل سے دوسری نسل اور ایک مفکر سے دوسرے مفکر کو منتقل ہوتی رہی۔

اسلام نے اخلاقیات کے اصول و معانی کے میدان میں ایک جامع انقلاب برپا کر دیا۔ جس نے پہلی اقدار کو مٹا کر نئی اقدار پیش کیں۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ انسان کامل اور معاشرہ کامل تخلیق کیا جائے۔ ڈاکٹر محمد حسین بیگل اپنی کتاب ”حیات محمد“ میں کہتے ہیں:

”اہل قلم نے مختلف زمانوں میں انسانی اخلاق کا نمونہ تخریر کیا ہے اور شتر اور قصبہ نے عہد قدیم کے انسان کامل کی تصویر کھینچی۔ ان کی یہ مشق صفحہ و قطاس پر مسلسل جاری ہے مگر ایسی غیر منقطع مشق کے باوجود کسی قوم کا ایسا نمونہ پیش کیا گیا جو اپنے فخر و خال کی رعنائی میں اس قدر جاذب ہو جیسا کہ قرآن کی سورہ بنی اسرائیل میں مذکور ہے۔ یہ نمونہ اس حکمت بالغہ کا کرشمہ ہے جو خدا نے وحی کے ذریعے اپنے رسول پیماناری اور جو کسی گزرے ہوئے دور میں انسان کامل کی حکایت نہیں بلکہ بنی آدم کو اس کے وظیفہ حیات سے آگاہ کرنا مقصود ہے۔ فرمایا:

وقضى ديك ألا تعبدوا إلا آيها ..... كل فرلك كان سبغه عند

دبک مکروها؛ (بنی اسرائیل، ۱۷: ۲۳-۳۸)

پھر قرآن مجید نے یہ بھی نصیحت کی:

”یا ایہا الذین آمنوا لا یسخر قوم ..... فاء لئلا هم الظالمون“

(المحرات ۲۹: ۱۱)

اس موضوع پر اور آیات بھی ہیں۔ مثلاً

”یا ایہا الذین آمنوا اجتنبوا ..... فکوہتموه“ (المحرات ۲۹: ۱۲)

اور یہ بھی فرمایا:

”إن اللہ یامرکم ان تؤتوا الامانات إلی اهلها“ (النساء ۴: ۵۸)

اس طرح قرآن مجید کی اور بھی کئی آیات اس موضوع پر ہیں۔

اسلام کا اخلاقی نظام، اس کے تصور کائنات و موجودات کا لازمی حصہ ہے۔ اس تصور کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے اور اس کے سوا کوئی خدا نہیں جس نے یہ کائنات تخلیق کی ہو اور یہ کائنات خدا کے حکم اور مشیت کے تابع نظام کے مطابق چل رہی ہے اور انسان اس کائنات کا محض ایک جزو ہے جسے خدا نے اپنی عبادت اور اپنے حکم کی اطاعت کرنے کے لیے خاص مزاج دے کر پیدا کیا۔ انسان کی زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ صرف خدا کی عبادت کرے۔ انسان کی تمام جدوجہد اور کوششوں کا سب سے بڑا مقصد اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ یہی وہ پیمانہ ہے جس سے اسلام میں ہر عمل کو تاپا جاتا ہے اور اس پر خیر یا شر کا حکم لگایا جاتا ہے۔ دوسرے نظاموں میں یہ پیمانہ لذت، بصلحت، سعادت وغیرہ کا حصول ہے اللہ کا احسان ہے کہ اُس نے انسان کو یہ پیمانہ دیا اور اُسے اچھائی اور بُرائی کے جانچنے کے لیے دائمی اصول مہیا کیا۔ اس دائمی، مستقل اصول کی وجہ سے ہم اخلاقی قدروں کو عقل، تجربے، یا دوسرے انسانی علوم کے ذریعے مقرر کرنے سے محفوظ ہیں، جو وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ یہ اصول کتاب اللہ اور سنت رسول کے سوا کچھ نہیں جو تمام احوال زندگی کے لیے کامل رہنمائی فراہم کرنے ہیں اور زندگی کے تمام پہلوؤں کے لیے مستقل اصول اخلاق وضع کرتے ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلام میں نظام اخلاق کی تین خاصیتیں بیان کی ہیں:

۱۔ اسلام کا نظام اخلاق ہیجیات انسانی کے لیے خدا کی رضا اور خوشنودی کو غایت اولیٰ قرار دیتا ہے۔ اس کا پیمانہ اخلاق بہت عمدہ ہے اور اس نظام اخلاق میں ایسی کوئی بات نہیں جو انسان کی اخلاقی ترقی اور پیش قدمی میں حارج ہو۔ یہ نظام کسی خارجی عوامل کی مداخلت کے بغیر انسان کو خلیت الہی کی بنا پر اخلاقی قوت مہیا کرتا ہے۔

۲۔ اسلامی نظام اخلاق، اس ترغیب و تخریب سے کوئی نیا ضابطہ اخلاق تیار نہیں کرتا نہ عرف عام میں مقبول اخلاق کو نظر انداز کرتا ہے۔ نبی کریم نے فرمایا:

”میں مکرم اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں“ اسلامی نظام اخلاق کا منشا ہے کہ انسان کی پوری زندگی کا ہر گوشہ نہ صرف اچھے اخلاق سے روشن ہو بلکہ اخلاقی قدریں سلامت بھی رہیں۔

۳۔ اسلامی نظام انسانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایسا نظام حیات قائم کریں جس کی بنیاد ”عرف“ پر ہو اور اس میں ”منکر“ کی کوئی آمیزش نہ ہو، اور انہیں دعوت دیتا ہے کہ ہر وقت اور ہر جگہ نیکیوں کو مد نظر رکھیں اور ان نیکیوں کو ساری دنیا میں عام کریں۔ یہی اسلامی معاشرے اور امت مسلمہ کا مطمح نظر ہے۔

اسلامی اقدار کئی فرائض عائد کرتی ہیں ان میں سے بعض خود ہی سے تعلق ہیں جو اس کا مرتبہ حیوانی سطح سے بلند کرنا چاہتی ہے، جن کا مقصد حیات صرف کھانا پینا ہوتا ہے، ان کا مقصد انسان کی شرف و کرامت اور ارتقا ہے۔ جن اقدار کا تعلق معاشرے سے ہے، ان کی غایت انسانی جمعیت کو منہذب اور متقدم بنانا ہے، جس کے تمام افراد ایک دوسرے کے لیے ایثار کے واسطے سے مربوط ہوں اور اپنے آپ کو معاشرے کی بھلائی کے لیے زبان کر سکتے ہوں، اور محض خود غرضی اور ذاتی منفعت ان کا مقصد نہ ہو۔ اسلام چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن صفات سے نوازا ہے وہ اس کے تمام کردار و احوال میں روشنی کا مینار بن کر اس کی رہنمائی کریں۔ مثلاً ”کرم، حلم، احسان، ہمدردی اور رحم تمام اعلیٰ اقدار ہیں جن کی پیروی سے انسان دنیا میں مثالی زندگی گزار سکتا ہے۔ جو معاشرہ ایسے افراد سے تشکیل پائے گا وہ یقیناً ایک سرفراز معاشرہ ہوگا۔ مشرق و مغرب، ایران، روم اور عرب میں یہ اقدار ایک لحاظ سے نئی تھیں اور شاید اسی وجہ سے اسلام اقطار عالم میں سرعت سے پھیل گیا اور اسی وجہ سے اسلامی اقدار ایرانی اور یونانی اقدار پر

غالب آگئیں جن کی اساس مادیت تھی، جبکہ اسلامی اقدار پوری انسانیت کے لیے ترقی اور خوشحالی کی خواہش مند اور قیام بخش تھیں، اور اسی باعث اسلامی اقدار کامران ہوئیں۔

## حواشی

- ۱۔ البر الاعلیٰ مودودی: نظام الحیاء فی الاسلام۔ ص ۷
- ۲۔ ایضاً۔ ص ۷-۸
- ۳۔ حیات محمد (اردو) ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔ چہارم ۱۹۸۸ء، ص ۶۷۹
- ۴۔ البر الاعلیٰ مودودی: نظام الحیاء فی الاسلام۔ ص ۱۲
- ۵۔ ایضاً۔ ص ۲۰
- ۶۔ عبدالکریم عثمان: اصول علم الاجتماع

# اسلام کے اثرات

## اسلامی ثقافت کی خصوصیات

اسلامی ثقافت نے، جس پر ساری کائنات کے دروازے وا ہیں، انسانی فکر پر تمام مرکزوں کی نئی راہیں کھولی ہیں۔ جنی مثالیوں اور اقدار کی طرف اسلامی ثقافت نے دعوت دی ہے۔ ان کی اساس ایمان، صداقت، انصاف، حریت، مساوات اور اخوت پر ہے۔ کائنات و مافیہا کے بارے میں اس کا نظریہ بے حد جامع اور متوازن ہے اور اس کی بنیاد منو اتم احادیث اور اللہ کے احکام پر ہے۔ اللہ سے انسان کا رشتہ اُس نے عبادت اور اعمال کی جواب دہی پر استوار کیا ہے۔ عبادت سے مراد وہی فرضی یا رسمی عبادات نہیں بلکہ اس میں انسان کا ہر عمل شامل ہے۔ جواب دہی صرف اعمال پر ہے اور انسان جو اچھا یا بُرا کام کرتا ہے اُس کے مطابق اُسے بدلہ ملتا ہے۔

معاشرتی تعلقات کے میدان میں، اسلامی ثقافت نے فرد، خاندان اور معاشرے میں روابط قائم کرنے کے لیے نیا فلسفہ پیش کیا، جو ان تمام اداروں کی کفالت کرتا ہے اور انہیں ایسے اعمال کی ترغیب دیتا ہے جو انسانیت کے مفاد میں ہوں۔ یہ کفالت اتنی جامع ہے کہ ہر فرد کی ضروریات پورا کرنے پر زور نہیں دیتی۔ بلکہ روحانی اور اخلاقی کفالت بھی مد نظر رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ جدید دور کے اُن روابط ہی کو پروان نہیں چڑھاتی جو فیرواد مملکت میں قائم ہو گئے ہیں، بلکہ مختلف سطحوں پر ان روابط کو پختہ کرتی ہے۔

مملکت، عوام کے حکومت سے تعلق، اور مملکت کے دوسری مملکتوں سے تعلقات کے

بارے میں اسلامی ثقافت، مملکت کے لیے اعلیٰ ترین ہدف مقرر کرتی ہے کہ عوام اور حکومت دونوں اُسے حاصل کرنے کی کوشش کریں، اور وہ ہے ایک ایسی مملکت کا قیام جو اپنے تمام معاملات میں اللہ کے احکام کو نافذ کرے، اعلیٰ کلمۃ اللہ کو باقی ہر چیز پر سبقت دے، فرد کو اللہ کے سوا سب کی غلامی سے نجات دلائے اور تمام جھوٹے خداؤں کا خاتمہ کر دے خواہ وہ انسان ہوں، رسم و رواج ہوں یا پتھر کے صنم۔

اسلامی ثقافت کے نشانات میں سے ایک نشان یہ ہے کہ اس نے عربوں کو بالخصوص اور مسلمانوں کو بالعموم ایسی ممتاز فکری شخصیت عطا کی جو اسلام سے پہلے انہیں نصیب نہ تھی۔ یہ درست ہے کہ عرب سادہ اور فطرت سلیم کے مالک تھے اور ان کے معاشرے میں اچھے اخلاق کے اصول رائج تھے، ان میں شکر و خطابت کا زور تھا مگر ان میں اُمت کو تشکیل کرنے والے شخصیت کو مکمل بنانے والے، اپنی ذات کا احساس دلانے والے اور اپنے آپ پر اعتماد کرنے پر اُجھارنے والے عناصر ناپید تھے۔ اور وہ تھے توحید، رسالت اور عقیدہ۔ یعنی جنہیں عرف عام میں وہ قوتیں کہا جا سکتا ہے جن کے گرد انسان کی تمام سرگرمیاں گھومتی ہیں اور جن سے تمام آراء تشکیل پاتی ہیں، اور ایسی مثبت قوت بن جاتی ہیں جو اپنے مقاصد سے واقف ہوتی ہے اور اپنی ذات کی حقیقت سے آگہی رکھتی ہے۔ عربوں کی فطری صلاحیتوں کو اسلام نے جلا بخشنی۔ جاہلیت کے دور میں عربوں کی زندگی پست اور ذلیل تھی اور اسلام قبول کرنے کے بعد ان کی ثقافت بلند پایہ اور ارفع ہو گئی۔ جب عربوں نے اپنے وجود کا راز پالیا تو بہت کچھ پانا ممکن ہو گیا، نہ صرف اُن کے لیے بلکہ انسانیت نے ان کی وجہ سے تہذیب و تمدن پالیا اور انہوں نے مشرق کی نئی تاریخ کی بنا ڈالی۔ اسلام کے ظہور کے ساتھ ہی نئی تہذیبیں، نئے علوم و فنون اور زندگی کی نئی راہیں پیدا ہوئیں۔

اس ثقافت کے نشانات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فکر اور علم کے میدان میں، بقول ڈاکٹر حتی: ”قرون وسطیٰ کے پہلے دور میں انسانوں کے کسی گروہ نے انسانیت کی ترقی کے لیے وہ کام نہیں جو مسلمانوں نے کیا، اور عربی زبان، تمام متمدن دنیا میں عرصہ دراز تک علوم و آداب اور فکر کی زبان کے طور پر قبول رہی، اور اس کی ایک نمایاں نشان یہ ہے کہ نویں اور بارہویں صدی عیسوی (تیسری اور چھٹی صدی ہجری) کے درمیان عربی زبان میں فلسفے، طب، تاریخ، الہیات،



ہدیت اور جغرافیہ میں جو کچھ تحریر کیا گیا وہ دنیا کی ہر زبان سے مجموعی طور پر فوقیت لے گیا۔  
 جب مسلمانوں کو قرآن اور سیرت رسولؐ سے اچھی طرح متعارف ہونے کا مشوق ہوا اور انہوں  
 نے اس کے مطالعے کے اصول بنائے تو علم تفسیر، علم سیرت اور علم الرجال و جود میں آئے اور  
 تشریح اور تالون سازی کی ضرورت محسوس ہوئی تو علم فقہ اور اصول فقہ وضع ہوئے جب مسلمانوں  
 کو اس کائنات کے بارے میں جستجو ہوئی اور انہوں نے اس کی تعمیر و تفسیر میں دل چسپی لی تو خبر پائی اور  
 دوسرے مجرد علوم جیسے ریاضیات، ہدیت اور علم حیوانات وغیرہ نے نزدیکی کی جب مسلمانوں نے  
 دوسری قوموں سے ربط مضبوط بڑھایا اور ان کا احوال جاننے کی خواہش کی تو فلسفہ، دینیات، تہائد  
 اور علم تقابل ادیان نے جنم لیا۔ جب انہیں یہ احساس ہوا کہ ان کے درمیان عربی زبان ایک  
 مضبوط رابطہ ہے کیونکہ وہ قرآن کی زبان ہے تو انہوں نے عربی زبان اور اس کے قواعد وغیرہ  
 کو ترقی دینے والے علوم ایجاد کیے۔ ابھی جو تھی بھری حتم نہیں ہوئی تھی کہ مسلمان اقوام، علم و فکر  
 اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے سب اقوام سے بڑھ گئیں اور تعداد و شخصیت کے اعتبار سے  
 زیادہ مضبوط ہو گئیں۔ انہوں نے انسانیت کے لیے علم و ادب کی بہت بڑی میراث چھوڑی۔  
 جن اہل فکر نے اس ثقافت سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنی تحریروں کے ذریعے ایسے مالا مال کیا ان  
 کی تعداد میں اتنی زیادہ ہو گئی کہ ”طبقات الرجال“ پر کتا ہیں ظہور میں آئیں اور ہر نوع کی کتاب  
 نے مختلف خصائص کے حامل اہل فکر کا تذکرہ فلم بند کیا۔ ان میں رجال حدیث، رجال ادب،  
 اطباء اور حکماء وغیرہ پر الگ الگ کتب تھیں۔ اس قسم کا کام ماضی میں کسی اور قوم نے نہیں کیا تھا۔  
 چنانچہ ہزاروں مسلمان مفکرین اور علماء نے علم کے لاکھوں خزانے اور ذخائر چھوڑے، جن سے  
 چین سے بحر اوقیانوس تک اور ترکستان سے عدن اور وہلی تک سارے علوم اسلام کے کتب خانے  
 بھرے پڑے تھے۔ یہ ایسی ثقافتی بیداری تھی جو آج تک دنیا کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہ  
 جلیل القدر ثقافت بارہویں صدی ہجری (۱۸ویں صدی عیسوی) تک تانباک رہی اور

اسی سے یورپ اور مغربی دنیا میں بیداری کا آغاز ہوا اور اسے ہمہ جہتی ملی۔  
 اس عظیم ثقافت میں عربوں کا جو حصہ تھا اس کی وسعت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا  
 جنہوں نے اس ثقافت کی بنیادیں رکھیں اور پھر اسے شاندار معیار تک پہنچایا، لیکن ہم ان اقوام  
 کے حق کا اعتراف بھی کرتے ہیں جو اسلام لائیں اور اس اسلامی ثقافت میں بھرپور حصہ لیا ان میں

وسط ایشیا، ایران، ترک کی اور ہندوستان کی مغل سلطنت شامل ہیں۔  
یہاں ثقافت اسلامیہ کی تمام کامراہوں کا تذکرہ دشوار ہے، جو اُس نے فکر انسانی کے  
نشوونما حاصل کیں، لیکن مختصر طور پر ان علمی کارناموں کا ذکر ضروری ہے جو اُس نے طبیعیات  
اور ریاضی کے میدان میں تھا اور یہ علوم کی حقیقت تک پہنچنے کا نیا طریقہ تھا جسے ہم ”کشف و  
اختراع“ کہہ سکتے ہیں اور جس سے قدیم تہذیبیں نا آشنا تھیں، خاص طور پر یونانی تہذیب،  
جس سے عربوں کا بالعموم واسطہ رہا، ان تجرباتی طریقوں سے گریزاں حکمران سے نفرت کرتی تھیں اور  
صرف مجرد نظریاتی تعلیم پر اکتفا کرتی تھیں۔ سیدیو ”تاریخ عرب“ میں کہتا ہے:

”مدرسہ بغداد کو جو چیز دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے علمی روح  
کی پرورش کی جو اس کی تمام سرگرمیوں پر حاوی تھی اور اس سے مراد ہے معلوم  
نامعلوم کی طرف سفر اور ظواہر کو وقت نظر سے دیکھنا تاکہ اسباب کونناج سے  
انگ کیا جاسکے۔ ان کے ہاں وہ اشیاء قبول نہیں کی جاتی تھیں جو تجربے سے  
ثابت نہ ہو سکیں۔ نویں صدی میں عرب اس شاندار علمی طریقے کے مالک بن گئے  
تھے جو نئی ایجادات کا مؤثر ذریعہ تھا۔ مشہور مستشرق، گب نے بھی کہا ہے کہ مسلمان  
علماء نے اپنے خیالات انفرادی حوادث پر موقوف کر دیئے جن سے انہوں نے نیا  
علمی راستہ نکالا جو سکندریہ اور یونان کے اسلاف نے سوچا تھا، لیکن اس طریقے  
کا استعمال یا اس کی یورپ کو واپسی کی فضیلت انہی کو حاصل ہے۔“

عربوں کے عالمانہ نظریے کے سبب اور مشکل علوم کی طرف اسلامی ثقافت کی توجہ کے باعث  
علم ہیئت اور ریاضی وہ پہلے علوم تھے جن سے مسلمان علماء کو شغف پیدا ہو گیا یہاں تک کہ ان کے  
وجہ سے خلفاء، امرا اور سلاطین کو بھی اس کا شوق پیدا ہو گیا۔ خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں  
علماء ہیئت نے بطلموس کے نظریے کو غلط ثابت کرنے ہوئے واضح کیا کہ سورج کا مدار  
بیضوی ہے جو مسلسل گھٹتا رہتا ہے۔ انہوں نے بڑی محنت اور تفصیل سے سال کی مدت مقرر  
کی۔ اس طرح انہوں نے چاند کی منازل کا تعین بھی کیا۔ انہوں نے سورج میں دھبے دریافت  
کیے۔ انہوں نے گرہوں کا حساب بھی لگایا اور شہابِ ثاقب کے ظہور کی وجہ بھی دریافت کی۔  
ہیئت میں مشرق اسلامی کے مشاہیر میں البتانی بھی ہے، جسے دائرۃ المعارف علم ہیئت

کے پیرس بڑے بڑے ماہرین میں شمار کرتا ہے۔ دوسرا نام ابو العرفاء کلہ ہے جس سے چاند کی منازل کے بارے میں ایک مشہور قاعدہ دریافت کیا ہے جسے ”چاند کے پیرس انحراف کا قاعدہ“ کہا جاتا ہے، جو دس صدیوں بعد غلطی سے یورپی ماہرین کے نام لگا دیا گیا۔ پھر ابن یونس ہے جس نے گھڑی کا پینڈولم اور دھوپ گھڑی ایجاد کی اور قاہرہ میں مدرسہ ہیئت قائم کیا۔ ابن یونس نے ہیئت کی جو جدولیں تیار کیں وہ گزشتہ تمام جدولوں سے باریک بینی میں بڑھ گئیں۔ حسن ابن الہیثم نے سب سے پہلے بصریات پر مقالہ لکھا، اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ سب سے پہلے اس نے اسوان کے مقام پر بند باندھنے کا خیال پیش کیا تھا تاکہ نیل کا پانی بلند کیا جاسکے (جس پر عمل ایک ہزار سال بعد ہوا)

البیرونی، محمود غزنوی کے دور کے مشاہیر مسلمان علماء میں سے ہے اس نے بغداد اور ہندوستان کے علمی ورثے کو ایک حلقے میں پرانا چاہا۔ اس کے بے شمار کارناموں میں سے ایک طول بلد اور عرض بلد کے خطوط ایجاد کرنا تھا۔ اس کے علاوہ، الخازنی اور عمر خیام جس نے ملک شاہ سلجوقی کے عہد میں بڑی محنت سے تقویم کی تصحیح کی (جسے دس صدیوں بعد یوپ گریگوری نے اپنایا) نصیر الدین طوسی نے تیرہویں صدی عیسوی میں ہلکے کے حکم پر تجرباتی رصد گاہ قائم کی اور اس رصد گاہ میں استعمال کے لیے نئے نئے آلات ایجاد کیے گئے جن کی شہرت چین اور یورپ تک پہنچی۔

اندلس میں فلکیات کا مطالعہ بہت بڑھ چکا تھا مگر سپین میں خانہ جنگی اور مسلمانوں کے خلاف جنگوں کی وجہ سے بہت کچھ ضائع ہو گیا۔ اندلس کے علماء میں مسلم الحمیری، ابن خلدون، ابن رشد وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جنہوں نے بڑا شوق اور میں بھی اپنی تحقیقات جاری رکھیں اور دنیا کو نئے نئے انکشافات سے روشناس کرایا۔

علوم ریاضی میں مسلمان علماء نے حساب، الجبرا اور ہندسہ (جیومیٹری) میں نئے اصول اختراع کیے۔ اور الجبرا تو ہے ہی مسلمانوں کی اختراع، اور اس میں جو اعداد وغیرہ استعمال ہوتے ہیں وہ خالصتاً اسلامی اختراع ہیں۔ علم مثلثات بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ انہوں نے ”حبیب زانیہ“ وغیرہ کا نظریہ پیش کیا۔ مغرب نے انحراف کیا ہے۔ کہ مثلثات میں عربوں نے جو کچھ دریافت کیا اور پیش کیا وہ دوسروں پر پانچ سو سال بعد

منکشف ہوا۔

صیغہ کی دریافت علم ریاضی میں انقلابی قدم تھا جبکہ مغرب نے اس کا استعمال اٹھارہویں صدی میں شروع کیا۔ اس کے لیے "بیت الحکمت" بغداد کا سربراہ محمود الخوارزمی فراموش نہیں کرنا چاہیے جس نے الجبرا میں بڑی پیش قدمی کی۔ مغرب نے اس کے نام کو بگاڑ کر (الگوریتم) اپنا لیا مگر یہ اعتراف کیا کہ بلا شک و شبہ وہ علم ریاضی میں سب پر سبقت لے گیا تھا۔ الخوارزمی نے جس کام کی ابتدا کی تھی اُسے ثابت بن الجراح نے ہندسہ اور الجبرا میں تکمیل تک پہنچایا۔

فلکیات اور ریاضیات کے علاوہ مسلمان تحقیقین فزکس یا طبیعیات کے موجد بھی ہیں۔ ابن الہیثم کی "کتاب البصريات" اس میدان میں مسلمان علماء کی بڑی نمایاں پیش کش ہے۔ اسی سے روشنی، منشور اور آئینوں کا استعمال شروع ہوا۔ ابن الہیثم نے بڑے بڑے عدسے ایجاد کیے جن سے بعد میں دوربین اور خوردبینی تیار کی گئی۔ اسی نے سب سے پہلے آنکھ، اس کے ڈھیلے اور بھینگے میں کام لیا۔

مسلمانوں نے اپنے استعمال کے لیے نئے آلات بھی ایجاد کیے۔ میکانکیات کے موجد بھی رہی تھے۔ گھڑی میں پنڈولم بھی انہوں نے ایجاد کیا۔ انہوں نے قطب نما اور مقناطیس سوئی ایجاد جس نے ہزار رانی میں بڑی مدد دی۔

علم کیمیا میں بھی عربوں نے لمبی نئی ایجادات کیں۔ ان سے پہلے یونانیوں کا اس کے بارے میں علم ناقص تھا اور عناصر اربعہ (خاک، بار، آب و آتش) کے سوا کچھ نہ جانتے تھے۔ مسلمانوں نے کئی عناصر اور مواد دریافت کیے اور سب سے پہلے انہوں نے عمل تقطیر رائج کیا اور جمر ثقیل اور انجماد بھی دریافت کیے۔ انہوں نے سیسے کی مدد سے معدنیات کو صاف کرنے کا طریقہ نکالا۔ اور آج بھی علم کیمیا میں یہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس علم میں جو اصطلاحات آج بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ ان کی اصل عربی ہے۔ قلمی شوره، روئی سے کاغذ سازی اور دوسری اہم ایجادات جو آج بھی انسان کے لیے مفید ہیں، انہی کی وجہ سے ہوئیں، بالخصوص کاغذ کی ایجاد تو انسانیت کی ترقی میں بے حد اہمیت رکھتی ہے جس نے ریشم، کھال اور کپڑے وغیرہ پر لکھنے سے نجات دلا دی۔ ایک اور اہم خدمت جو عربوں اور مسلمانوں نے سرانجام دی، وہ کیمیا سے حمیدلہ (فارمیسی) کو الگ کر کے عملی اور تجرباتی بنانا تھا۔

کیمیا میں مسلمانوں میں سے ایک اہم شخصیت البرہسوی جعفر الکوہنی ہے۔ اس کی تصانیف حقیقت میں سائنس کا دائرہ المعارف ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کا ترکہ زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ابو بکر الرازی ہے، جس کی کتاب الحاوی ہے جس میں سب سے پہلے گندھک کا تیزاب بنانے کا طریقہ بیان کیا گیا۔

جہاں تک طب کا تعلق ہے تو اس میں بھی مسلمانوں کو فوقیت رہی۔ شاید اس کا ایک سبب یہ ہے کہ ہماری ثقافت انسان اور اس کی حاجات سے بخوبی آگاہ تھی۔ مسلمان اطباء نے مغرب کے طریقہ علاج اور طبی تعلیم پر گہرا اثر ڈالا۔ صدیوں تک الرازی ابن سینا اور ابن زہر کی تالیفات یورپ کی یونیورسٹی میں طبی تعلیم کی اساس رہیں۔ الرازی کی کتاب الحاوی نے تو بالخصوص یورپ میں خاصی شہرت پائی اور پیرس کے طبی ادارے کی لائبریری میں یہ نو اہم کتابوں میں شمار ہوتی تھی۔ الرازی نے بعض جلدی بیماریوں مثلاً چیچک اور خسرہ کے علاج کے بارے میں واضح ہدایات دیں۔ اس نے فالج کی حالت میں ہلکے جلاب اور پھینے لگانے کا طریقہ بھی ایجاد کیا اور مزمن بخاروں کے لیے سرد پانی کا استعمال تجویز کیا۔ جہاں تک ابن سینا کا تعلق ہے تو وہ کسی شک و شبہ کے بغیر مسلمانوں میں سب سے بڑا طبیب تھا۔ اس کی کتاب القانون فی الطب پوری چھ صدیوں (بارہویں سے اٹھارویں صدی عیسوی) تک فرانس اور اٹلی کی یونیورسٹیوں میں طبی تعلیم کی اساس رہی اس نے امراض قلب کے علاج کا طریقہ دریافت کیا اور علاج نفسی کا طریقہ بھی اسی نے جاری کیا۔ اس کے مشاہدے میں آیا کہ بیماریاں ادہم کے یا نفسیاتی الجھنوں کے باعث پیدا ہوتی ہیں اور ان پر اس نے خاص توجہ دی۔

مسلمانوں نے جراحی (سرجری) میں بھی کمال حاصل کیا اور تحذیر (سُن کرتے) کا طریقہ ایجاد کیا۔ اس کا موجودہ القاسم خلف بن عباس القزطبی تھا جس نے داغ اور چرکہ لگانے کا استعمال کیا اور پیپ وغیرہ خارج کرنے کے لیے فینیلے استعمال کیے۔ اس نے آنکھ میں موتیا بند کا علاج بھی دریافت کیا اور موتیے کو نکالنے کے لیے آپریشن بھی کیے اس نے منانے سے پتھری نکالنے اور جریان خون روکنے کا طریقہ بھی ایجاد کیا۔

مسلمانوں نے طب میں سائنسی مشاہدات کے قوانین بھی رائج کیے۔ سب سے پہلے انہیں ابن زہر الاندلسی الاشہلی نے رائج کیا۔ اس نے مشاہدہ کیا کہ انسان جسم میں قدرتی طور پر خود بخود

بعض امراض کو ختم کر کے کی طاقت ہے۔ اس نے سائنس کی نالی کا آپریشن ایجاد کیا اور ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑنے میں کمال پیدا کیا۔

ابن رشد کا بھی طب کے میدان میں بڑا دخل ہے۔ اس نے تریاق دریافت کیے، مختلف زہروں پر تجربے کیے اور کئی قسم کے بخاروں کا علاج دریافت کیا۔ اس کی کتاب الکلیات آج بھی یورپ میں شائع ہو رہی ہیں۔

ابن النفیس السوری نے دوران خون کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں اور بڑی محنت سے اسے بیان کیا۔ پریزنگالیوں نے اس کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ سب سے پہلے اسے ابن النفیس نے بیان کیا ہے۔

اسلام نے حفظانِ صحت کے اصولوں پر بھی بہت زور دیا ہے۔ مثلاً غسل (بالخصوص غسل جنابت) شراب اور سوڑے گوشت کی حرمت قابل توجہ ہے۔ مسلمان طبیب بیماریوں کے علاج میں حفظانِ صحت کے اصولوں پر بہت زور دیتے تھے اور آج بھی طب میں صفائی اور پاکیزگی پساہلر کیا جاتا ہے۔ گنناں لیباں کہنا ہے:

”عرب شفا خانے حفظانِ صحت کے اعتبار سے آج کے شفا خانوں سے کہیں

زیادہ صاف ستھرے اور فائق تھے۔ یہ شفا خانے بہت وسیع اور عمدہ تھے اور

پانی اور ہوا کا وافر اور کافی بندوبست تھا۔ سائرہ نو کی یونیورسٹی، جو حفظانِ صحت

کے اصولوں کی پاسداری کے لیے شہرت رکھتی ہے اور یورپ کا بہترین ادارہ

ہے، عرب طب کے راج کردہ حفظانِ صحت کے اصولوں پر چلی رہی ہے۔“

یہ ”نوویباچہ“ ہے، ورنہ اسلامی ثقافت نے فکر کے میدان اور عملی پیش قدمی میں

انسانیت کو بے نیاز کر دیا تھا، اور مسلمانوں کی تمام سرگرمیوں پر عملاً اسلامی رنگ چڑھا ہوا تھا۔

ہم تصور کر سکتے ہیں کہ اگر مسلمان اسلام کی روح سے انحراف نہ کرتے اور اپنا رخ صحیح طور پر اسلامی

رکھتے تو آج علوم و معارف کی نشوونما کس پائے کی ہوتی لیکن بد قسمتی سے وہ فلسفیانہ جنگ و

جدال اور عقائد کی لابیجی بحثوں میں الجھ گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر ضروری طور پر ان کی لابیجی

بحثوں میں الجھ گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر ضروری طور پر ان کی ذہنی طاقتیں ضائع ہو گئیں۔

جنرالیہ کے میدان میں بھی مسلمانوں نے سبقت حاصل کی۔ انہوں نے پہلے یونان سے

ضروری معلومات حاصل کیں اور پھر اپنے مشاہدات، اور سیاحتوں کے ذریعے حاصل کی ہوئی معلومات سے ان میں اضافہ کیا۔ عربوں کو سیر و سیاحت کا بے حد شوق تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہی سب سے پہلے امریکہ پہنچے تھے۔ انہوں نے بطلمیوس کی کئی غلطیوں کی اصلاح کی اور کئی ایسے منطقیوں تک رسائی حاصل کی جہاں روم و یونان کے قدم نہ پہنچے تھے۔

مامون کے شہید کے عہد میں الخوارزمی اور اس کے ساتھیوں نے آسمان اور زمین کے نقشے تیار کیے اور کرۂ ارض کے محیط کا کامیاب اندازہ لگایا۔ اس کے بعد الادرسی نے کرۂ سماوی اور دنیا کا نقشہ تیار کیا جس میں واضح طور پر اس کے سرچشمے درج کیے جو بعد میں یورپیوں نے بیان کیے۔

المقدسی نے بیس برس تک سیر و سیاحت میں گزارے اور اس عرصے میں دنیا کے کئی علاقے دیکھے۔ اس نے جغرافیائی دائرۃ المعارف مدون کیا جس میں بڑی تفصیل سے ہر اس مقام کا تذکرہ کیا جہاں وہ گیا تھا اور البیرونی نے اپنی جغرافیہ کی کتاب میں روس اور شمالی یورپ کی تفصیل بھی درج کی۔ ابواسحق، ابراہیم بن یحییٰ النیرقالی لے بحیرہ روم کا طول بلد ناپا جو ۳۳ درجے تھا اور یہ پیمائش آج کے علماء کے حساب سے بے حد قریب ہے۔ یہیں الاصطخری کی کتاب، المساکک و الممالک کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جس میں اُس نے اسلامی ممالک کے کئی رنگین نقشے شامل کیے لیکن عرب جغرافیہ دانوں میں سب سے بڑا نام یا قوت الحموی کا ہے۔ جس نے معجم البلدان کے نام سے چھ ضخیم جلدوں میں جغرافیہ کا دائرۃ المعارف تالیف کیا۔ مسلمانوں نے یونان اور ہندوستان کے جغرافیہ دانوں سے جو حاصل کیا اس میں معتد بہ علمی اضافہ کیا، مثلاً انہوں نے زمین کی شکل، زمین کی گردش اور اسباب مدوجزہ اور کئی دوسرے مسائل و ضاحات سے بیان کیے ہیں۔ عربوں نے سمندر کے سفر کے لیے بھی بڑے مفید نقشے تیار کیے اور واسکو ڈی گاما نے انہی نقشوں کی مدد سے ۱۴۹۷ء میں دنیا کی سیاحت کی۔

علم تاریخ و عمرانیات میں تعلیم و تدریس کے میدان میں کئی کارنامے سرانجام دیئے۔ انہوں نے علم الحدیث کی مصطلحات وغیرہ سے استفادہ کیا اور اس سے تنقید اور روایات کی چھان پھنگ کا طریقہ اخذ کیا۔ کئی مؤرخین نے برہا برس تاریخی مواد جمع کرنے اور اس کی تحقیق میں صرف کیے۔

مسلمان مؤرخین نے قبل اسلام سے لے کر بعد تک کے ادوار کی تاریخ مرتب کی اور انہوں نے جو کچھ مرتب کیا اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فحاشیت کے لحاظ سے بعد میں لکھی جانے والی کتابوں میں اس کا عشر عشر بھی نہیں۔ ان میں المستودعی ہے جس نے دنیا کے کئی خطوں کی سیاحت کی جن میں چین اور مدغاسکر بھی شامل ہیں اور ایسا در نہ چھوڑا جو تیس جلدوں میں موجود ہے اس نے قبل اسلام سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک کے حالات تفصیل سے بیان کیے۔ ان مؤرخین میں ہم ایک اور اہم شخصیت، ابن بطوطہ کو بھی شامل کر سکتے ہیں جس نے دنیا کی وسیع سیاحت کی اور آج بھی اس کے مشاہدات تاریخ اور عمرانیات کے علماء کے لیے بہت بڑا سرمایہ ہیں۔

ان مؤرخین میں ایک اہم نام ابن خلدون کا ہے، جس نے تاریخ کا رُخ عمرانیات کی طرف سے موڑ دیا۔ اس نے تاریخی مطالعے کو تاریخی بحث کی اساس بنایا اور اس کے ذریعے فطری قوانین تغیر اور قوموں کے احوال میں تبدیلیوں کے اسباب بیان کیے۔ نقادان فن کا کہنا ہے کہ اس سے بڑا فلسفی مؤرخ آج تک نہیں گزرا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے ساتھ ساتھ وہ عمرانیات کا بانی بھی ہے۔

جہاں تک فلسفے کا تعلق ہے تو اس کی ابتدا عربوں میں یونانی کتابوں کے تراجم سے بہت پہلے ہو چکی تھی کیونکہ وہ اللہ کے وجود، اس کے عدل، اس کی رحمت، قضا و قدر، خلافت زانی، روحانی وغیرہ پر غور و فکر کرتے رہے تھے۔ انہی مباحث کے نتیجے میں خوارزمی، مرجیہ، قدریہ وغیرہ کا ظہور ہوا۔ پھر معتزلہ کا مکتب فکر سامنے آیا اور اس کے ساتھ ہی اشاعرہ اور ماتریدیہ ظاہر ہوئے۔ مسلمانوں کے علم کلام نے مسیحی علم کلام پر خاصا اثر ڈالا۔

انہی فلسفیانہ مباحث میں دین اسلام اور فلسفہ یونان میں موافقت پیدا کرنے کی کوشش بھی شامل ہیں، جن کے مؤید بالخصوص فارابی اور ابن رشد ہیں۔ اسلامی فلسفیانہ فکر کے نتائج کا جب بھی ذکر ہوگا تو ہم دیکھیں گے کہ ایجابی فلسفے سے چل کر یہ تصوف تک پہنچے۔ فلسفے کے میدان میں ہم کئی اہم نام گنوا سکتے ہیں مثلاً فارابی، جس کی تصنیفات اس میدان میں اہم ہیں، اور ابن سینا جس نے فلسفے میں کئی تصنیفات پیش کیں اور اپنے فکر



اور اتر میں وہ افلاطون اور ارسطو کی ٹکر کا ہے، ابن رشد، ارسطو کا سب سے بڑا شارح ہے۔ اور اسی کے ذریعے ارسطو یورپ میں متعارف ہوا اور اس نے مشہور کیتھولک دینی عالم، ٹامس اکوائنس (Thomas Aquinas) اور دوسرے علما کو بے حد متاثر کیا۔

---

اسلامی کتب خانہ

کتاب

سنگ میل

مصنف: ڈاکٹر عبدالکریم عثمان

ترجمہ: ڈاکٹر محمد رفیع - احمد

